مُحبت، مَن، محرم

سُمیرا حمید

سمیرا حمید

محبت من محرم

عدن کیپ ٹاؤن کے ساحل پر اکیلے ہی چہل قدمی کر رہا تھا۔ غصے میں ہی تو اس کا جی چاہا کہ قریب و جوار میں نامناسب لباس پہنے چہل قدمی کرتی شوخ و شنگ کسی ایک آدھ لڑکی کی کمر میں اپنے بازو حمائل کر دے اور نہیں تو انہیں آنکھ ہی مار دے اور اس اشارے پر جب کوئی اس کے قریب آجائے تو وہ اسے لنچ کے لیے لے جائے۔ رات میں ڈنر کے لیے اور پھر ڈسکو کے لیے اور پھر۔

لیکن ماریہ سے بدلہ لینے کی شدید خواہش کے باوجود اس کا جی نہ مانا کہ وہ اپنے رو پہلے ہنی مون پر یہ سب کرے۔ شادی سے پہلے کی اور بات تھی۔ اس وقت جب کبھی وہ دوسرے ملک تفریح کے لیے گیا تو ایسے بہت سے کام کیے۔ ویسے ہی کام جو مذہب کے دائرے سے پرے تو ہیں ہی۔ ساتھ ساتھ معاشرتی مزاج پر بھی بہت بھاری پڑتے ہیں۔

ذرا سے فاصلے پر بنے کچل ہٹس (HUTS) میں سے ایک میں ماریہ سو رہی تھی۔ ماریہ۔ زمینی حور۔ ازبکستان کی پیدائشی۔ اپنی ماں کی طرح گہری سبز آنکھوں والی اس کی بیوی الٹی چلتی سی۔ عدن نے بہت سے الٹے مزاج کے لوگ دیکھے تھے۔ ایک وہ خود بھی تھا۔ لیکن ماریہ جیسی الٹی شخصیت اسے اب تک ایک ہی ملی "ماریہ خود"۔

جب وہ آ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اسے سونا ہے۔ اب جب وہ واپس جائے گا تو وہ کوئی فلم دیکھ رہی ہوگی یا گھنٹوں سے واش روم میں ہی ہوگی۔ اسے واپس آئے چند منٹ ہی گزریں گے تو وہ خود چہل قدمی کے لیے باہر

مکمل ناول



جائے گی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو اس کے ساتھ کیوں نہیں؟ اب اگر وہ یہ بات پوچھے گا تو ہنی مون تباہ کرے گا۔ بھیٹ بن کر وہ اتنا ضرور کہے گا۔

"میں بھی آؤں ساتھ....؟"

وہ پلٹ کر دیکھے گی بھی نہیں اور چلی جائے گی۔ عدن کو جواب دیے بنا صرف وہی ایسے جا سکتی ہے۔ جا کر وہ واپس آنا بھول جائے گی۔ فون کشن کے نیچے، باتھ ٹب کے پاس یا کسی ڈرا میں رکھا ہو گا۔ وہ اپنے ساتھ صرف امریکن کریڈٹ کارڈ لے کر نکلتی ہے۔ ناچار وہ اکیلا ہی ڈنر کرے گا۔ ایک بار وہ اسے ڈھونڈتا کلب جا پہنچا۔ وہ بے خود ایک کونے میں پڑی تھی۔ اگر وہ نہ جاتا تو وہ ساری رات وہیں پڑی رہتی۔ لیکن ایسا فی الحال ایک ہی بار ہوا تھا۔ مگر دوبارہ ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وہ اسے ساتھ کم ہی رکھتی تھی۔ دل چاہا تو ساتھ ورنہ دور دور۔

وہ اچھے سے اچھے ہوٹل، ریسٹورنٹ، ہنی مون لٹ ایریاز، ٹریولرز ہنٹ انواع اقسام کے کلبوں کے بارے میں معلومات کرتا ہوٹلوں میں سیٹیں، سمندر میں جہاز بک کرواتا۔ مگر وہ جا کر نہ دیتی۔ اگر چلی بھی جاتی تو منہ ایسے بنایا ہو تا جیسے کسی ناگوار، بدبودار جگہ آ بیٹھی ہو۔ یہ ان کا ہنی مون تھا۔ جس پر ماریہ کے ڈیڈ نے بے تحاشا پیسہ خرچ کیا تھا۔

"تم کتنا بور ہوتی ہو۔" دراصل وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم کتنا بور کرتی ہو۔

ماریہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور کھانا کھاتی رہی۔ خاموشی کا یہ وقفہ عدن کی بے عزتی کیے جا رہا تھا۔

"میرے تجزیہ نگار نہ بنو۔" کچھ وقت کے بعد اس نے جواب دیا۔ لیکن کیا خوب دیا۔ اس رات کا ڈنر بھی تباہ ہو گیا۔

وہ کسی بات، کسی چیز سے خوش ہوتی ہی نہیں تھی چیزیں تو خیر اس نے بہت برتی ہوں گی۔ مگر شوہر تو وہ پہلا تھا۔ کبھی وہ خوش کر دیتی۔ کبھی خوشی چھین لیتی۔ کبھی کندھے پر خود ہی سر رکھ دیتی اور کبھی اپنے کندھے پر سر رکھنے بھی نہ دیتی۔

"یہ تمہارا پلان کیا ہوا ہنی مون ہے؟" ایک دن وہ بری طرح سے چڑ گیا۔

"میرا نہیں ڈیڈ کے سیکریٹری کا۔"

"اس نے تمہاری پسند سے ہی کیا ہو گا۔"

"ہاں تو مجھے یہ سب پسند ہے۔"

"لگتا تو نہیں ہے۔" یہی بات بھی اس کے سامنے ڈر ڈر کے کرنا پڑی تھی۔

"کیسے لگے گا؟" وہ صاف بر امان گئی۔

عدن کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ نہ ہی کوئی نیا سوال۔ جواب بھی بہت تھے اور سوال بھی۔ لیکن اس انلے مزاج والی کے لیے اب کچھ اور کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"ایم او کے۔ کول۔ پرفیکٹ۔ اس طرح منہ پھاڑ کر مجھ پر تبصرہ نہ کیا کرو۔"

عدن چپ ہو گیا تھا لیکن وہ نہیں رکی اس کے منہ پھاڑ انداز پر وہ تلملا کر رہ گیا۔ زیر لب گالیاں دیں۔ اپنے ہی ہنی مون پر صرف چالیس دن پرانی بیوی، سویٹ ہارٹ کو گالی دی۔

شاید یہ گالی دینے کی نوبت اتنی جلدی نہ آ جاتی۔ اگر دبئی پام سٹی میں اس نے ماریہ کے ساتھ اس کے ذاتی ولا میں قیام نہ کیا ہوتا۔

ان دونوں کی شادی پاکستان میں ہوئی تھی ولیمہ دبئی پام سٹی میں دیا گیا ولا میں ہی دونوں نے دو ہفتے قیام کیا۔ دونوں کی فیملیز واپس جا چکی تھیں۔ شروع کے دن کافی پر بہار اور ہنگامہ خیز تھے۔ دونوں گھنٹوں سوئمنگ کرتے، نت نئے ہوٹلز جاتے، ماریہ کے دوستوں کی طرف سے دی گئی چند پارٹیز اٹینڈ کیں۔ کلب اور سینما کے چکر لگائے۔

ماریہ کے ایک شیخ دوست طاہر البشر نے انہیں ڈنر پر بلایا۔ بقول شیخ "رہائش گاہ" اور بقول عدن "چھوٹے سے محل" میں انہیں دعوت طعام دی گئی واپسی پر انہیں دبئی کے ایک پوش علاقے میں واقع ایک اپارٹمنٹ گفٹ کیا گیا۔ لیکن یہ سب بھی اتنا حیران کن نہیں تھا۔ نہ شیخ کا محل۔ نہ ہی سونے چاندی کے برتن۔ بس وہ خوش آمدیدی اور الوداعی انداز ہائیں بائیں گال پر بوسے جو شیخ اور ماریہ دونوں کی طرف سے تھے۔

ان روایتی ملاقاتی اندازوں کو عدن خوب جانتا تھا۔ لیکن صرف یہ روایتی انداز ہی نہیں تھا۔ ماریہ نے بغیر آستین کا سنہرا گاؤن پہنا تھا اور شیخ کو ماریہ کے علاوہ کچھ فرق نہیں رہا تھا۔ عدن نے کمال بے غیرتی سے نظریں ادھر ادھر کیں۔ لیکن اس کے اندر سوال جواب شروع ہو گئے۔ نیا نیا تھا نا۔ ابھی عادی نہیں تھا۔ شیخ صاحب کمال مہربانی سے اپنی ساری توجہ ماریہ پر نچھاور کرتے رہے۔ کمال کے انسان تھے۔ شوہر نام کی چیز پر صرف ایک نظر ہی ڈالی۔

اور اتفاقاً اس کی نظر بھی اس نام پر پڑ گئی جو ماریہ کو اس کے گھر سے فیکس کی گئی رپورٹس پر لکھا تھا۔ وہ نام بھی شیخ طاہر البشر" تھا۔

وہ اپنے لیپ ٹاپ پر چند ای میلز چیک کر رہا تھا۔ لائبریری میں ذرا قریب رکھی فیکس مشین میں فیکس آیا۔

"تمہارا فیکس آیا ہے ماریہ۔"

وہ ماریہ کو جانتا تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو شادی کے بعد شوہروں اور شادی سے پہلے بوائے فرینڈز کو اپنے پاس ورڈز دیتی ہیں۔ وہ بجلی کی طرح الگ الگ کی قائل تھی۔ وہ تو اس کے موبائل کو بھی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر وہ لیپ ٹاپ پر کام کرتی کبھی اٹھ کر چلی بھی جاتی تو وہ اچک کر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اتنی دیر سے لیپ ٹاپ پر کیا کرتی رہی ہے۔ میڈ کو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا ایک ضروری فیکس آنے والا ہے۔ وہ ضروری فیکس عدن کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی نظر نے صرف شیخ طاہر البشر پڑھا تھا۔

وہ سوانا باتھ لے رہی تھی۔ چلائی۔ "ٹیبل پر رکھ دو۔" اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کا فیکس پڑھ لیا جائے گا۔ ڈریں غریب غربا۔ ماریہ کیوں ڈرے؟ آقا کی بیٹی کیوں ڈرے۔

تیار ہو کر وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ وہ دن ایسے ہی صبح و شام جاتی رہی۔

"آج تو کہیں نہیں جانا؟" تیسرے دن اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ اپنی موسٹ وانٹڈ بیوی سے۔ اس کے گال پر چٹکی بھر کر۔ لاڈ کرتے ہوئے۔ رومانس کے انداز میں۔

اس نے چٹکی بھرتے ہاتھ کو جھٹکا۔ "کیا مطلب؟"

"ویسے ہی۔" ہاتھ جھٹکے جانے پر اسے پہلی بار پہلا صدمہ ملا۔

"چلی بھی جاؤں۔ آج بھی۔ اور جب بھی۔ تمہیں کیا؟" الفاظ سے زیادہ انداز برا تھا۔

"ہاں جی! ٹھیک۔ عدن کو کیا۔" وہ منہ پھلا کر پہلی بار ناراض ہو کر باہر نکل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ضرور محسوس کر کے اس کے پیچھے آئے گی۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ واپس گیا تو وہ جا چکی تھی۔ ملائیشین میڈ سے پوچھا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی طرز پر کہا۔

"آئی ڈونٹ نو سر۔"

عدن کو کچھ سبکی سی محسوس ہوئی۔ اس جیسا لڑکا، جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آ کر موبائل فرش پر، دیوار پر دے مارتا تھا۔ اب صرف غصے میں کھلنے لگا۔ کس کے سامنے موبائل دیوار پر دے مارے۔ ٹی وی کے چینل بدلنے لگا۔ شام گزر گئی۔ ماریہ آئی۔ جوتوں سمیت بیڈ پر لیٹ گئی۔ بیگ بیڈ روم کے دروازے کے پاس گرا پڑا تھا۔ موبائل ہی چھین، سن گلاسز کو صوفے پر اچھال گیا تھا۔ سن گلاسز صوفے کے کنارے سے گرنے کے قریب تھے۔

"ماریہ!" وہ اس کے اوپر جھکا۔ غصے کو ایک طرف کیا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو چھونا چاہا۔ اس نے جواب میں ایک مختصری اوں۔ اوں۔ کی۔ اس انداز پر غصہ دوبارہ آ گیا۔ دراصل ماریہ ایک چیز تھی تو وہ بھی بہت زعم میں تھا۔ ماریہ پہاڑ کی چوٹی ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن خود کو وہ "وہ جھنڈا سمجھ رہا تھا جو فاتح لگاتا ہے۔ اس کے خیال میں ماریہ کو اس کے پیروں تلے ہو جانا چاہیے۔ بے شک خود گردن اکڑا کر چوٹی پہ کھڑی رہے۔

غصے سے وہ باہر آنے لگا تو دروازے کے پاس پڑا بیگ اٹھالیا۔ باہر لے آیا۔ کھولا۔ اندر تین کاغذ تہہ کیے رکھے تھے۔

وہ بہت پڑھا لکھا تھا۔ امیر تھا۔ بہت سے مہذب جانتا تھا۔ لیکن اب غصے میں آکر وہ کاغذات پڑھنے لگا۔

مسز ماریہ شیخ طاہر البشر۔

اس نے آنکھیں سکیڑیں۔ لمحے بھر کو ذرا سا کانپا۔ باری باری تینوں کاغذات پڑھے۔ ایک فیکس تھا جو امریکا سے اسے کیا گیا تھا۔ دو رپورٹس تھیں جن کی تاریخ ایک دن پہلے کی تھی۔ تینوں کاغذات پڑھتے ہی اس کا دماغ ابلنے لگا۔ سوئی ہوئی ماریہ کو جھنجوڑا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"واٹ؟" نیند سے اٹھائے جانے پر وہ غصے سے بولی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے کاغذات اس کے سامنے لہرائے۔

وہ لپک کر اٹھی اور اس کے ہاتھ سے کاغذات جھپٹ لیے۔ "تمہاری اتنی جرات۔" وہ انگلش میں دھاڑی۔ وہ انگلش میں ہی بات کرتی تھی۔ اردو بہت کم بول اور سمجھ سکتی تھی۔ عدن اس کی جرات پر حیران رہ گیا۔ الٹا وہ اسے یہ جتا رہی تھی کہ اس نے اس کے کاغذات کو بیگ میں سے نکالنے کی ہمت ہی کیسے کی۔

کمال کی بات ہے نا؟

"تم شیخ کی بیوی تھیں؟" اس کی آواز اور غصہ اور بلند ہو گیا۔

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ کاغذات کو ہاتھ میں لیے الماری تک گئی۔ پٹ کھولا اور اندر رکھ کر مقفل کر دیا۔

"ماریہ!" عدن چلایا۔ مشرقی خوب صورت مرد اور خاص کر مشرقی شوہر کی بات کا جواب نہ دیا جائے اسے پیٹھ دکھا دی جائے۔ اس سے اچھا ہے کہ اس کے منہ پر چانٹا مار دیا جائے۔

"کیوں چلا رہے ہو؟" وہ پلٹی اور سنگل صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ ذرا سا جھک کر ایک ہاتھ سے پمپ شوز اتارے اور اسی ہاتھ کی سمت میں شوز اچھال دیا۔ دوسرا شوز اتارا اور ویسے ہی اچھالا۔ اور ایک پاؤں کو جھلانے لگی۔ یوں جیسے اسے کسی بات کی پروا نہ ہو۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔" وہ تنا ہوا کھڑا تھا۔ مرنے مارنے کے لیے تیار۔ غیرت مند پاکستانی شوہر۔

"تو؟" انداز میں حیرت تھی نہ سوال میں۔

"تمہاری رپورٹس پڑھ لی ہیں۔"

"گڈ۔" پاؤں ہل رہا تھا۔

اس انداز پر عدن کا جی چاہا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔

"کچھ اور؟" سوال تھا یا مذاق۔

"کتنے ابارشن کرا چکی ہو؟" عدن نے اپنی طرف سے اسے تھپڑ مارا کہ وہ بلک اٹھے گی۔

"صرف دو تک ہی نوبت آئی تھی۔" الٹا وہ بدلہ الٹا تھپڑ اسے ہی لگا۔ وہ تو مزے سے کہہ گئی۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے ان میں لڑائی ہوتی رہی۔ لڑائی بھی کیا۔ عدن ہی بھڑک بھڑک جا رہا تھا۔ وہ آزاد خیال بھی ہے اور آزادی بھی رکھتی ہے۔ وہ جانتا تھا۔ لڑ جھگڑ کر وہ قریبی ہوٹل آگیا۔ پاپا کو فون کیا۔

"وہ اس کی بیوی نہیں گرل فرینڈ تھی۔" اس نے ماریہ کی کہی ایک ایک بات پاپا کو بتا دی، تو انہوں نے کمال الفاظ سے اسے تسلی دی۔ "ایکس گرل فرینڈ۔" ماریہ کو کچھ پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ دبئی کے اسی کلینک سے اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ جس کے لیے اس نے امریکا سے اپنی رپورٹ منگوائی۔ اس کی تازہ ترین رپورٹ میں بھی بہت سے مسائل ہی تھے۔ اس کی طرف سے اب وہ مرے یا جیے۔ بابا کے ہلو میں جا بیٹھے۔

"ان کو ہلا کیوں رہے ہو یار۔ تم بھی گرل فرینڈ ہی سمجھو۔ بیوی کسی اور کو بنا لینا۔ چند سال گزار لو۔ تمہارے ساتھ ہے۔ تم اس کے شوہر ہو۔ وہ اپنے ڈیڈ کو پیاری ہے۔ اس کے ڈیڈ تمہیں پیار کریں گے۔ بچہ مت بنو عدن۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو ایسے غصہ کرنے لگے ہو۔ وہ امریکا میں رہی ہے۔ پاکستان میں رہنے والیاں کم نہیں ہیں۔ لڑ کے آئے ہو اس سے۔ وہ اپنے ڈیڈ کو بتائے گی۔ تمہیں بھی جھگڑ کر کیا لو گے۔ میں بھی اسے جانتا ہوں۔ اس کے استاد صاحب نہ بنو۔ اس غلطی پر اس پر ڈانٹا۔ یار! عقل کہاں ہے تمہاری؟"

"پھر بھی۔ آپ کی سوچ وہ۔"

"یار! میں ان چکروں میں نہیں الجھتا۔ اتنا میں نہیں سوچتا۔ تم بھی ایسے معاملات میں۔ چار دن نہیں ہوئے تمہاری شادی کو اور یہ سب۔ سیدھے رہو۔ آنکھ کان بند کرلو۔ جب سنو گے نہیں دیکھو گے نہیں تو بولو گے کیا۔"

وہ سلوٹیں بدلتا رہا۔

"سوچ کیا رہے ہو؟ جواب دو۔ ارے یار!"

"کیا جواب دوں؟"

"اچھا! چلو نہ دو۔ جاؤ ماریہ کے پاس واپس۔"

ماریہ سے متعلق اس کے پاپا کے ہمیشہ سے ہی خیالات نادر رہے تھے۔ ماریہ ان کے لیے ایک عجوبے کی طرح تھی۔ جس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ "کھل جا سم سم" مترنم سے کھڑے ہو کر بولنے تک جا سکتے تھے۔

پاپا نے اسے اچھی طرح سے ٹھنڈا کر دیا۔ چند ہی دن بعد وہ واپس چلا گیا۔ ماریہ کو ساتھ لیا۔ ڈنر کیا۔ سب کچھ اوکے ہو گیا۔ پھر وہ ساؤتھ افریقہ آگئے۔ ماریہ کے ساتھ اپنی پہلی لڑائی اور پاپا کے ساتھ پہلے فون کے بعد اس نے خود پر بے غیرتی کے سب ہی دروازے کھول لیے۔ دراصل وہیں سے دوسرے سب ہی دروازے بند ہو گئے۔ لیکن بند ہونے والے دروازوں کی پروا کرتا کون ہے۔ اب وہ اسے اپنی گرل فرینڈ سمجھ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کی بیوی تھی اور کسی بیوی نما گرل فرینڈ "کھل جا سم سم" تھی۔

ساؤتھ افریقہ میں ماریہ کے مزاج کے مطابق دن گزار کر وہ امریکا ہوسٹن آگئے۔ دو منزلہ چھوٹا سا اسپتال تیار کیا تھا۔ تزئین و آرائش اس نے اپنی مرضی سے کروائی۔ جراحی آلات، دیگر ساز و سامان اپنی نگرانی میں منگوایا۔

پہلی قسط اسپتال تیار تھا۔

پاکستان سے اس کے پاپا، ماما اور بہن آئی۔ سفید ربن کو اس کے سسر نے کاٹا۔ بلند بانگ قہقہہ اس کے پاپا نے لگایا۔ اس نے تالیاں بجائیں اور سب اسپتال میں داخل ہو گئے۔

پاپا نے اسے ایک آنکھ ماری جیسے۔ "اب کہو۔ کیا خیال ہے۔"

اس نے بھی جواباً" یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "جی۔ کل کا خیال ہے۔"

اس افتتاح میں ماریہ شامل نہیں تھی۔ اس کی پروا کسے تھی۔ چند دن بعد وہ اسپتال آئی۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر دیکھا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی مسکراہٹ کے انداز پر عدن کا منہ بن گیا۔ لیکن ڈھیٹ ہی بنا رہا۔

"جتنے مرضی طنز کرلے گدھی۔" اسے ساتھ لے کر وہ لنچ کے لیے آگیا۔

ماریہ آج کل گھر سیٹ کر رہی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ اپنی ازدواجی زندگی کی بنیاد گھر کو وہ بہت دل جمعی سے سیٹ کر رہی تھی اور اس بنیاد کی بھی بنیاد "تعلق" پر اس کی نظر نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ اس سے بھی مشورہ لے لیتی۔ اس کی پسند کا پوچھ لیتی۔ پورے گھر میں ڈرائنگ روم کی ایک سائیڈ ٹیبل عدن کی پسند کی آئی تھی۔ وہ بھی نہ آتی تو عدن کو فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ یہی کافی تھا کہ ان کی بول چال میں تبدیلی آئی تھی۔ ہلکی پھلکی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ ایک ساتھ پر امن ڈنر کرلیتے۔ کبھی کبھار باہر چلے جاتے۔ سب ہی گرہ نہ سہی ایک آدھ سرا ان کے رشتے کا ٹھیک بن ہی جاتا تھا۔ وہ اس کے لیے کریم کافی بناتی اور اس کی گردن پر ایک چٹکی بھرتی۔

کبھی کبھی وہ خوامخواہ ہنسنے لگتی۔ جب وہ کار کا دروازہ کھولتا۔ کھانے کی میز کی کرسی کھسکا کر کھڑا رہتا۔

"ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔ ٹھیک۔" انگلی لہراتی کہتی جاتی۔

اور وہ ہر بار یہ پوچھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا کہ ڈیڈ کیا کہتے ہیں۔ ایک بار یہ عظیم غلطی کی تھی۔

"ہوں۔" اس نے صرف دو انگلیوں کو موڑ کر ٹھوڑی کے نیچے رکھا۔ ہونٹوں کو نیم وا کیا۔ بولی کچھ نہیں۔ آنکھیں ذرا سی ترچھی اس کی طرف نکالیں۔ عدن کو مارلن منرو کی مشہور زمانہ تصویر یاد آگئی جو کالج کے دنوں میں اس کے باتھ روم کے دروازے پر چسپاں تھی۔ بعدازاں اس نے اس کی جگہ کیٹی پیری کو چسپاں کردیا تھا۔

"انہوں نے کہا۔ وہ غلام علی غلام کا بیٹا ہے۔ بچے چاہے سدھا لو۔"

عدن سلام در سلام جھک گیا۔ پاکستان کے اپنے شعبے میں قابل اور باکمال ڈاکٹر عدن ابہام قرطم بیٹھا۔

"گورسنو۔ انہوں نے کہا۔ جو لوگ کاری ضرب دیتے ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا۔ عدن سے تمہیں بچاؤ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس میں اتنا دم خم نہیں ہے۔"

بات کہہ کر نزاکت سے اٹھ کر وہ چلی گئی۔ جیسے فٹ بال میچ کے آخری لمحات میں فیصلہ کن گول کیا ہو اور اس کی ٹیم جیت گئی اور اتنی دیر سے جو وہ محتاط کھیل رہا تھا۔ وہ پوچھ لینے کی ایک بڑی غلطی کا مرتکب ہوا تھا۔ پتا کہ ماریہ نے اسے اور بڑا دشمن بنالیا تھا۔

کس بات کا دم خم؟ آنے والے وقت میں شاید وہ اسے بتا ہی دے گا۔ جتا بھی دے گا۔ اس کے ڈیڈ کے پاس صرف چند ہزار ملین ہی زیادہ تھے اس کے پاپا سے۔ پیسے کا بس اتنا سا ہی فرق۔ ان کے پاس رقم روپوں میں تھی اور ان کے پاس ڈالروں میں۔ طاقت اور تحمل تو مرد کے پاس ہی ہوتی ہے نا۔ تو اس طرف وہ مرد تھے۔ عدن اور اس کے پاپا غلام علی غلام اور اس طرف صرف آغا عباس حیدر۔ اور پھر عدن شوہر تھا۔ کتنے پوائنٹس تو ایسے ہی اپنے آپ مل جاتے ہیں۔ صرف شوہر ہی ہونے سے۔ وہ لائق فائق ڈاکٹر تھا۔ دنوں میں ہی کہاں کا کہاں پہنچ جائے گا اور ماریہ۔ حسن کی دیوی۔ اس حسن کے بل بوتے پر بھی ماڈلنگ کی فیلڈ میں کوئی نام نہیں بنا سکی۔ چند کمرشلز ہی کرسکی۔ باپ کا پیسہ بھی کام نہ دلوا سکا۔ ہالی ووڈ کی فلمیں تو بہت ہی دور کی بات تھی۔ عدن کو خود کو مطمئن رکھنے کے لیے بہت سے فلسفے مل جاتے تھے۔ بہت سی خامیاں۔ اسے ہر جگہ اپنی ہی کامیابی نظر آتی تھی۔ کاری ضرب تو وہ واقعی شاید نہ ہی دے سکے لیکن چھوٹی چھوٹی ضربیں وہ تیار کرسکتا تھا۔ جو کاری بن جاتیں بھی اکٹھی ہو کر۔

ماریہ سے فاصلے پر لیکن دوست بن کر رہنے لگا۔ پتا کر رہی ہے۔ کہاں آجا رہی ہے۔ کس کس سے مل رہی ہے اور ایسی ہی دوسری باتیں امریکا میں رہتے تو پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب اس نے توجہ دینی بھی چھوڑ دی۔ جب کبھی وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی وہ چلا جاتا۔ وہی ماریہ کے ٹائپ کی پارٹیز۔ وہاں وہ بھی۔ نچاتی۔ اور لڑکھڑاتی واپس آجاتی۔ جی تو بہت چاہتا کہ اسے کسی سڑک پر دھکا دے کر گرا دے اور کوئی کار اس کا سر کچل دے۔ لیکن وہ اسے سہارا دے کر بیڈ تک لاتا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر اوندھی گر جاتی۔ عدن بڑبڑاتا اور دوسرے کمرے میں جا کر سو جاتا۔ پھر وہ اس کے ساتھ جانے سے ہی کترانے لگا۔ وہ بھی شوق میں اسے لے کر نہیں جاتی تھی۔ صرف وہیں جہاں کپل کیڈ رنگ ہوتی۔ وہ نہ جاتا تو ماریہ کے ڈیڈ اس پر چلانے لگتے۔

"تم نے شادی کس لیے کی ہے اس کی؟" سب نے فرعون بنے تھے شاید۔ باپ بیٹی ایک ہی انداز میں بات کرتے تھے۔ لفظوں کو چباتے ہوئے دوہراتے ہوئے پھر بھی دل دہلاتے ہوئے۔

عدن کو کیا معلوم کہ اس نے کیوں کی ہے۔ اسے تو صرف اپنی طرف کا ہی معلوم تھا۔ وہی "کھل جا سم سم"

"تم اس کے ساتھ جایا کرو۔ اس کا خیال رکھا کرو۔"

بیچارے بندھے اسے ساتھ جانا ہی پڑتا۔ پارٹیز میں وہ اسے تو برداشت کرتا۔ لیکن ماریہ کا برتاؤ اس کے خون کا دباؤ بڑھا دیتا۔ وہ ہر کسی کی بانہوں میں جھول جاتی۔ گلے ملتے گال سے گال رگڑتی اور۔ اور۔ اف۔ ایسے وقت اسے مشکل لگتا۔ صرف اسے گمراہ سمجھتا۔ غیرت امڈ امڈ آتی اس میں۔

"تم روز روز ایسی پارٹیز میں آکر تھکتی نہیں؟"

وہ دیر تک چھوٹے بچوں کی طرح نہ۔ نہ۔ میں گردن ہلاتی رہی۔ عدن اسے دیکھ کر رہ گیا۔ جس نے باپ کی نہیں سنی وہ اس کی کیا سنے گی۔

"میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ترس گیا ہوں۔"

گولڈن ہائی ہیل اتار کر اس نے اپنی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ عدن کے اس طرح کہنے پر ایک ایک کرکے سینڈل اٹھائی اور لاپروائی سے اس کی طرف اچھال دی۔ ایک منہ اور ٹھوڑی سے رگڑ کھا کر کھڑکی کی طرف نکل گئی اور ایک کندھے اور سینے کو چھو کر اس کی گود میں گری۔ اس انداز پر وہ جیسے چپ رہا، وہی جانتا تھا۔

"سچ؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس بار عدن صرف مسکرایا۔

"تم ایک قابل شوہر ہو۔" اگلی بات نے اس کی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ دیا اور وہ گلا پھاڑ کر ہنسی۔ ایک آنکھ دبا کر آنکھ ماری۔ اب اس کا جی چاہا کہ اسی کی ہائی ہیل سے اس کی یہی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ لیکن کیسے پھوڑ ڈالتا۔ اسپتال ابھی نیا نیا تھا۔ وہ بھی وہاں نیا تھا۔

آنے والے دنوں میں وہ بھی تھوڑی قابل بیوی بننے لگی۔ میڈ کو دیکھ لیتی۔ گروسری کے لیے جاتی۔ اس کے لیے بھی شاپنگ کرتی۔ کبھی کبھار اسپتال آکر اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھالیتی اور کبھی کبھار ہی اس کے چھوٹے بڑے کام بھی کردیتی تھی۔ اب اسے ڈر لگتا کہ یہ اچھی بیوی ہی نہ بن جائے کیونکہ وہ اس سے محبت کرنے کے موڈ میں اب نہیں تھا۔ "آپ کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔" اس کی فہرست میں نہیں تھا۔ "اس کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔" یہ ضرور فہرست میں درج تھا۔

ویک اینڈ پر وہ ڈیڈ کی طرف چلے جاتے۔ اس کے ڈیڈ چپکے چپکے ماریہ کی طرف دیکھتے اور پھر اپنی بیوی کی طرف۔ دونوں میاں بیوی نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہہ سن لیتے۔ جیسے کہتے ہوں۔

"دیکھو دیسی ٹوٹکا کام کرگیا نا۔ بدل گئی نا ماریہ۔ ٹھیک ہوجائے گی۔ اور ٹھیک ہوجائے گی۔ جیسی بھی ہو، دیسی مرغی، دیسی لوگ بہت کام کے ہوتے ہیں۔ دنیا گھوم پھرلو۔ اپنا دیس کام ضرور آتا ہے۔"

اور ازبک پیوری جواب دیتی ہو۔" ہاں مان لیا۔"

عدن ایسی نظروں کو پکڑ لیتا تو اور اکڑ جاتا۔ اس کے پاپا غلام علی غلام نے کہا تھا۔

"عدن! کوئی تو وجہ ہے کہ اس کا جھکاؤ ہماری طرف زیادہ ہے۔" اور وجہ یہی تھی کہ عدن جیسا قابل انسان ہی قابل شوہر بن سکتا تھا۔ ڈرنک اور سگریٹ تو ماریہ کے ناشتے کھانے تھے۔

ازبک ماں نے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ماریہ کو ان سے دور کرے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ان دونوں میں کچھ تو محبت پیدا ہو ہی چکی ہے اور اس محبت کے نام پر ماریہ بہت کچھ کر لے گی۔

عدن نے سب اٹھا کر پھینک دیا۔ ماریہ ہنسی۔

"کسی نے آج تک اتنی جرأت نہیں کی۔"

"میں جرأت بھی کروں گا اور اصرار بھی۔" اس بار واقعی عدن نے ہمت سے ہی کام لیا تھا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آئی سی۔" اس نے ابرو اچکائی۔ پھر مسکرا دی۔

عدن واقعی ایک قابل انسان تھا۔ ماریہ ذرا سا اور بدلی تو عدن کی یادداشت بھی کمزور ہونے لگی۔ وہ شیخ طاہر البشر کو بھولنے لگا۔ ماریہ کے دوستوں' بے تکلفی' لاپروائی' طنز' لڑائی اور ادھر ادھر کے دوسرے چھوٹے بڑے واقعات کو بھی بھولنے لگا۔ ویسے بھی وہ مرد مومن تو تھا نہیں کہ حرف آخر رکھتا۔ نہ مرد آہن کہ ڈٹ جاتا۔ وہ ماریہ پر جان نثار کرنے لگا۔ نیا نیا عاشق سا لگنے لگا۔ دونوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے' مزے کرتے۔ اکثر ماریہ کی فیملی بھی ساتھ ہوتی۔

"ڈاکٹر صاحب! تم بہت شرارتی ہو۔" اس کے گلے سے وہ جھول جاتی۔ جب بھی وہ ساحل سمندر پر بیٹھ کر اسے خالص پاکستانی انداز میں کوئی دیسی لطیفہ سناتا۔ اور وہ ریت پر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

"مسز عدن! تم بہت خوب صورت ہو۔"

"تم کے فلرٹ ہو۔"

"تم پکی کشمیری کلی ہو۔"

"پاکستان تک نہ لے جاؤ مجھے' میں اگر کچھ ہوں تو ازبک ہوں۔"

"پاکستان تک تو آ گئی ہو۔" اس نے دونوں بازوؤں کا گھیرا اس کے گرد بنایا۔

"پھنسا لیا تم نے۔"

"پھانس لیا تم نے۔"

اس کی آنکھوں میں پھونک مار کر وہ بھاگی۔ آنکھوں کو جھپکاتا وہ بھی اسی کے پیچھے بھاگا۔

چند ہفتوں کے لیے وہ پاکستان سے بھی ہو آئے غلام علی غلام نے زور' زور سے اس کے کندھے پر تھپکیاں دیں۔ "ماسٹر نکلے تم تو بھئی۔"

وہ مسکرانے لگا۔ جیسے نوبل انعام ملا ہو۔ شکریہ کی تقریر اسے ابھی کرنی تھی۔

"گدھے کی بچی کو الو بنا لیا۔" جناتی قہقہہ بلند ہوا۔ "کمال کر دیا' بھئی واہ' مزا آ گیا' مزا آیا۔" پھر رک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "دل لگی کر رہے ہو کیا؟؟"

وہ سٹپٹا گیا۔ ماریہ اسے اب پھر سے اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں تیسری بار نئے سرے سے مبتلا ہو رہا تھا۔

"جو بھی ہے' جاری رکھو۔ گدھے کی گردن میں کتے کا پٹا ڈال دو' بس پھر ٹھیک ہے؟؟"

"جی! ٹھیک ہے۔" اس کا باپ کتے کا پٹا اسے ڈالنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہاں وہ خود اس کے کتے جیسا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ رنگ ماسٹر بن جائے۔ شیر سے بھیڑیے تک سب کو سدھا لے۔ وہ ایسا کر ضرور لیتا۔ اگر اپنے باپ کی طرح ہوتا۔ ابھی وہ نیا نیا تھا۔ کچھ کتابوں میں پڑھے اخلاق اس کے اندر تھے۔ کچھ ان سب کا ابھی وہ عادی نہیں ہوا تھا اور کچھ وہ کبھی کبھی کوفت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ورنہ سب ٹھیک چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری ماڈلنگ کا کیا ہوا؟" رات کو چہل قدمی کرتے ایسے ہی عدن نے پوچھ لیا۔ ماریہ نے جھٹکے سے اس کے کندھے پر رکھا سر اٹھایا۔

"تم نے کیوں پوچھا؟"

"ایسے ہی۔" اور اس نے ایسے ہی پوچھا تھا۔ جیسے کوئی بھی بات کر لی جاتی ہے۔

"دوبارہ مت پوچھنا۔" پر اناتنا ہوا انداز واپس لوٹ آیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہہ دیا۔ لیکن ٹھیک ہوا نہیں۔

بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے وہ ڈرنک کرتی رہی۔ عدن کو تشویش ہوئی۔ بہت چاہا کہ وہ دروازہ کھول دے لیکن وہ انگلش میں گالیاں دینے لگی۔

عجیب مصیبت تھی۔ عدن نے اسے بھاڑ میں ڈالا اور دوسرے کمرے میں جا سویا۔ اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی یہی ہوتا رہا۔ پھر ماریہ کی مام آ گئیں۔ ماریہ ان کا فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ تین دن سے وہ کمرے سے نکلی نہیں تھی۔ قریب جاتے ہی گالیاں دیتی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی' چلاتی' نہ جانے کیا کیا بکتی۔

"تو تم مجھے بتاتے۔" مام اس پر غصہ کرنے لگیں۔

"جب میں ہینڈل نہیں کر سکا تو آپ۔"

"ہمیں کر لینے دیتے تم! اس طرح اتنی تکلیف میں اسے اتنے دن رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ تم اس کے کو فون کر کے بتاتے۔ تم تو کسی کام کے نہیں ہو۔" آپ چلا کر چلی گئیں۔

"پاگل۔۔۔ سنکی۔۔۔ سارے۔" اس نے یہ صرف سوچا' کہا نہیں۔

مام ماریہ کو زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔ نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس اس کے سیشن ہونے لگے۔ چند دنوں عدن کی بھی ملاقات کروائی گئی ڈاکٹر کے ساتھ کہ وہ ماریہ کے ساتھ کیسے رہتا ہے' کیا کہتا ہے' کیا کہتا' کس رویے کا اظہار کرتا ہے' کس کا نہیں کون سی بات اسے ڈپریشن میں لے جائے گی اور کون سی احساس کمتری میں۔۔۔ اسے دورے پڑیں گے۔ وہ چلانے لگے گی۔ ڈرنک کرنے لگے گی۔ ڈرگز کی طرف پھر سے آ جائے گی۔ اور اس سب کا ذمہ دار اس کا عدن ہو گا۔

تین دنوں کے آٹھ گھنٹوں میں ڈاکٹر نے اس کا دماغ خوب چاٹا۔ ماریہ سے متعلق اس کی معلومات میں اور سے اور اضافہ ہوا۔

کشمیری کلی' ازبک کی پری' خوب صورتی میں مس یونیورس' ایک کامیاب ماڈل نہیں بن سکی تھی۔ بے تحاشا خوب صورت ہونے کے باوجود اور اس سب کے ساتھ ہی وہ ایک کامیاب ماڈل کے جو اس کا بوائے فرینڈ تھا ساتھ تعلق قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ بوائے فرینڈ کی کامیابی کا گراف بڑھنے لگا۔ وہ ماڈلنگ سے کمرشلز اور پھر فلم تک جا پہنچا۔ پھر اس کے لیے ایک گرتے ہوئے گراف کی ماڈل کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اگر وہ دنیا میں اکلوتی خوب صورت ہوتی تو شاید کوئی بات بھی بنتی۔

اب یہ سچی محبت کے کھو جانے کا دکھ تھا یا کیریر نہ بننے کا غم۔ ماریہ نے ان ہی دنوں ڈرگز لینی شروع کی۔ سگریٹ' ڈرنک' سب کچھ وہیں سے آیا۔ شیخ بھی اسی بے راہ روی کا نتیجہ تھا۔ ڈپریشن کے ان ہی دنوں میں اس نے بہت کچھ کیا۔ اسے دنیا گھمائی گئی۔ لیکن ہر بار اس نے نیا ہی کارنامہ انجام دیا۔

ڈاکٹر اور اپنی ساس کے ساتھ آخری ملاقات میں اس کا جی چاہا کہ وہ جاتے ہی ماریہ کو فارغ کر دے۔ اتنی تھوکی ہوئی لڑکی وہ چاٹ رہا ہے۔ ذات کی اتنی بد' عمل میں اتنی کمتر' اس رات وہ صبح تک بار میں بیٹھا رہا۔ اسے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بل بوتے پر۔ دولت کے ساتھ ہی سہی' لیکن اس نے کبھی ایسی زندگی کا نقشہ نہیں بنایا تھا۔

وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ اپنی جوانی کے سنہرے دن کس کے ساتھ گزار رہا ہے۔ وہ کر کیا رہا ہے؟

"آپ نے یہ سب ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ خالص پاکستانی انداز میں اپنے سسرالیوں پر چڑھ دوڑنا چاہتا تھا۔

"کیا سب؟" ساس کی بھی فرعونوں جیسی گردن اکڑ گئی۔

"اپنی بیٹی کے کرتوتوں کا۔"

"تم نہیں جانتے تھے اسے؟"
"صرف اسے جانتا تھا۔"
"تم اور تمہارے پاپا تو یہاں آتے رہتے تھے۔ تمہیں معلوم تھا ماریہ کا لائف اسٹائل۔ اس لب و لہجے اور اتنی اونچی آواز میں دوبارہ مجھ سے مخاطب نہ ہونا۔ میں ماریہ کی ماں ہوں' تمہاری نہیں۔"
"آپ کو اسے سمجھانا چاہیے۔" ہنٹر کھا کر وہ سنبھل گیا۔
"سمجھا لیا' اب تم سمجھاؤ' سنبھالو اسے۔" انداز ایسا جیسے تمہیں تنخواہ دیتے ہیں اپنی ڈیوٹی کرو۔
"وہ میری نہیں مانتی' مجھے اس کی فکر ہے' میں اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا۔"
انہوں نے آنکھیں پھیلا کر زرا کی ذرا اسے دیکھا۔ یہ وہی ہے جو ابھی کرتوتوں کی بات کر رہا تھا اور اب فکر کر رہا ہے۔
"کوشش کر رہے ہیں ہم۔۔۔ تم بھی کرو۔ کبھی کبھی وہ ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ ہو جاتا ہے ایسا' سب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔" ساس سے ہار کر وہ پاپا کو فون کرنے لگا۔
"وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ایسے رویے نہیں دیکھے۔"
"تو تم سامنے سے ہٹ جایا کرو سن!" وہی جناتی قہقہہ لگا۔
"پاپا۔۔۔ پلیز۔"
"یار۔۔۔ بچے ہو کیا تم؟"
"جنگلی ہے وہ۔"
"جنگل کا کون سا ایسا جانور ہے جسے انسان نے پالتو نہیں بنایا۔ پنجرے میں لا نہیں بٹھایا۔"
"سانپ نہیں پالنے میں نے۔"
"تو بین بجاؤ' نچواؤ اسے۔"
"وہ مجھے نچاتی ہے۔ میرا سکون تباہ ہو رہا ہے پاپا!"
"دور رہو اس سے' کرنے دو جو کرتی ہے۔"
"اس کا باپ کہتا ہے۔ اس کا خیال رکھو۔ دور کیسے رہوں؟"

"اس گدھے کو الو نہیں بنا سکتے تم؟"
"وہ مجھے گدھا بنا رہا ہے۔"
"عدن! لڑکیوں کی طرح رونا بند کرو' مرد بنو۔"
اور وہ مرد بن گیا۔ ماریہ کا حال چال پوچھتا۔ بات کرنے کی کوشش کرتا' بات کر لی تو ٹھیک' ورنہ ادھر ادھر ہو جاتا' خود وہ اپنے معمولات میں سیٹ تھا۔ صبح اٹھتا' جوگنگ' ورزش کرتا' اپنا ناشتا خود بناتا اور اسپتال آجاتا' ماریہ سے کہیں زیادہ اسے اسپتال کی فکر تھی۔ رات کو دیر سے آتا۔ ماریہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تو اسے دیکھ لیتا۔ ورنہ بند دروازہ دیکھ کر شکر ادا کرتا۔ اپنے کمرے میں آکر سو جاتا۔ ماریہ کے دورے کی حالت طویل ہو کر ختم ہونے لگی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"ایک بار تم نے مجھے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" اتنا عرصہ پہلے کی بات اسے یاد تھی۔
"ہاں کہا تھا۔"
"اب بھی کرتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اور اس وقت وہ ہنسی تھی۔
عدن گڑبڑا گیا۔ ہاں ہی کہنا پڑا۔
"نہیں' تم نہیں کرتے۔" وہ ہسٹریائی ہنسی' بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اٹھا کر اس کی طرف لہرائی۔ "نہیں کرتے نا؟" ہاتھ گود میں گرا لیا۔
"تم تو میرے شوہر ہو بس۔۔۔ قابل شوہر۔۔۔ بس۔" وہ متأسف اور گہرے دکھ سے بولی۔ کچھ پل چپ رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر پگلی سی ہنسی ہنسنے لگی' پھر جھٹ سے عدن کی شرٹ کے کالر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔
"عورت ہوں۔۔۔ پاگل نہیں ہوں۔ کتنی ہی بے حس ہو جاؤں' محبت کی حس رکھتی ہوں۔" وہ کالر کو جھنجوڑنے لگی۔
"چھوڑو مجھے۔" پھر دورہ پڑا۔ اس نے دل میں سوچا۔
"نہیں چھوڑتی۔"
"ماریہ!" وہ نرمی سے بولا۔ کالر آزاد کروا کر اسے

اپنے سینے سے لگا لیا۔
ماریہ نے کہا کہ وہ عورت ہے۔ لیکن پاگل نہیں۔ لیکن سینے سے لگا کر وہ اسے بتا دے گا کہ وہ پاگل ہے یا نہیں' صرف چند ہی جملوں میں۔
"محبت نہ کرتا تو تم سے شادی کرتا؟" پہلا جملہ۔
"تم پر پل پل مرتا ہوں۔ مر مٹنا چاہتا ہوں اور۔۔۔" دوسرا جملہ۔
"جنون میں۔۔۔؟" اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔
"تمہیں نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔" وہ جیسے بہت دکھی تھا اس کے لیے۔
"کیا ہو جاتا ہے عدن؟" اس کی طرف بہت آس سے دیکھا۔
"میں تو ٹھیک ہوتی ہوں۔ خراب تو دوسرے ہو جاتے ہیں۔"
"میں دوسرا نہیں ہوں' تمہارا شوہر ہوں۔"
"میرے ہو تم؟"
"ہاں' صرف تمہارا۔"
"صرف میرے؟" بہت پیار سے پوچھا گیا۔
"صرف تمہارا۔" بے حد پیار سے کہا گیا۔
محبت کے نام کی بین بجا کر عدن نے اسے سلا ڈالا۔ وہ بہل گئی' ٹھیک نظر آنے لگی' صبح اٹھ کر اس کے ساتھ جوگنگ کے لیے جاتی۔ بھاگتے ہوئے ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑا کر اسے منہ کے بل گرا دیتی۔ وہ چلاتا۔ وہ بھاگ جاتی۔ رات کو وہ سوتا تو فل والیوم میں میوزک لگا کر خود دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی۔ اس کے کپڑے اور گاڑی کی چابی چھپا دیتی۔ گھر میں وہ آگے بھاگتی۔ وہ پیچھے پیچھے بھاگتا۔
پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ڈیڈ کا گھر تھا۔ آج کل ناشتا ان کے ساتھ کرنے لگے تھے۔ اس کے ڈیڈ اس سے پیار کرتے۔ اس کی پلیٹ بھرتے' اس کے ہاتھ کی ہتھیلی کو ہونٹوں سے لگاتے اور اس کے بالوں کو ذرا سا کھینچتے۔
"گھوم پھر کیوں نہیں آتے تم لوگ۔" بیٹی ذرا سا سنبھلی تو ٹرپ آفر کیا جانے لگا۔

"آفر اچھی ہے۔" ماریہ نے جوس کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔
عدن کا خیال تھا وہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ وہ سنجیدہ نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی تھی۔ اس نے پلان کر لیا تھا اور کیا خوب پلان کیا تھا۔
عدن کو لگا کہ اس نے کوئی غار اور دہانہ نہیں چھوڑا۔ اس ٹرپ میں وہ اتنی سنجیدگی سے ان سب کا جائزہ لیتی رہی جیسے ان پر کتاب لکھ رہی ہو۔ عدن میں موج مستی کا عنصر زیادہ تھا۔ اسے کھنڈرات سے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
کسی زمانے میں اسے شوق ہوا تھا اجڑی عمارتوں کو دیکھنے کا۔ چند ماہ اس نے دل لگا کر دیکھیں بھی۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ جاپانی زیر زمین ٹرین سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور ماریہ نے اسے ریڈ وڈ جنگل میں چلنے والی گھٹیا سی سیاحتی ٹرین میں بٹھا دیا۔ یہ ٹرپ اس کے باپ کی طرف سے تھا تو مرضی بھی باپ کی بیٹی کی ہی چلنی تھی۔ اس کا ٹرپ تو خاک ہوا' ماریہ البتہ ترو تازہ ہو گئی۔
"ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔" بہت دنوں بعد اس نے یہ جملہ دہرایا۔
"تمہارے جیسے شوہر مزے سے بندھے رہتے ہیں۔۔۔ نہ جاتے ہیں' نہ جانے دیتے ہیں' سر جھکائے ساتھ جاتے ہیں۔"
بہت ذہین تھی۔ اسے قائل ہونا پڑا۔ شاید ڈیڈ نے یہاں بھی کچھ کہا تھا۔ دنیا میں کسی ایک مرد کی تو وہ سنتی تھی مگر۔۔۔ وہ مرد اس کا باپ تھا۔ اس لیے نہیں' وہ مرد اس سے ہر حال میں محبت کرتا تھا اس لیے۔۔۔ ہر انسان کو ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہوتی ہے' جو ہر حال میں اس سے محبت کرے اور گندے سندے راستوں میں صرف ایک محبت کا ہی راستہ ہوتا ہے' جو گند سے نکال باہر کرتا ہے۔ اب یہ اس محبت کے فلسفے اور اساس پر ہے کہ وہ گند کسے سمجھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

اسپتال کا سارا منافع عدن کی جیب میں ہی جاتا تھا۔

اس کا اکاؤنٹ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ غلام علی غلام کے ساتھ اس نے ایک فیکٹری میں حصہ داری کرلی۔

"آپ نے سسر کے برابر ہو جاؤ تو مانوں۔" وہ اسے ہمیشہ بڑا ٹارگٹ ہی دیتے تھے۔ سو میٹر کی ریس اس نے جیتی تو انہوں نے کہا۔

"پہلے نمبر پر تو کوئی بھی آجائے گا' کوئی ریکارڈ بناؤ کہ کوئی توڑ نہ سکے۔"

جناب آغا عباس حیدر۔ اس کے سسر!

جس کا اپنا ایک ذاتی طیارہ تھا۔ امریکا میں پھیلی ہوئی اسٹورز کی چین تھی۔ آس پاس کے ملکوں میں گھر اور اپارٹمنٹ تھے اور عدن کے باپ کے پاس صرف تین فیکٹریاں تھیں' جو مختلف مشینی آلات بناتی تھیں۔ صرف پاکستان کے دو شہروں میں دو بنگلے تھے۔ ایک فارم ہاؤس تھا بس۔

ایک فیکٹری پر مقدمہ چلتا رہا تھا۔ اس مقدمے نے ان کی ساکھ خراب کردی تھی۔ پیسہ الگ پانی کی طرح لگ رہا تھا۔ طرح طرح کے لوگوں کو خریدا جارہا تھا۔ بے نقص منصوبہ تھا آگ لگانے کا۔ بیمہ کمپنی کے تفتیشی جاسوسوں نے پکڑ لیا۔ غلام علی غلام نے الٹا بیمہ کمپنی پر مقدمہ کردیا۔ بیمہ کمپنی بھی سینہ ٹھونک کر میدان میں اتر آئی۔

یہ سب اس کی شادی سے پہلے ہوا تھا۔ بعد ازاں... مقدمے کو کسی نہ کسی طرح ختم کروایا۔ فیکٹری کو نئے سرے سے کھڑا کیا۔ اسی فیکٹری کا آدھا مالک عدن تھا جس نے اپنے حصے کے سارے پیسے اسپتال کے منافع سے دیے تھے۔

جب بھی ماریہ پر دورے پڑتے تھے۔ جی تو اس کا چاہتا کہ مار مار کر اس کا حال برا کردے۔ لیکن ایسی مار اس کا اپنا حال بدترین کردے گی۔ اب وہ اپنے سسر کو پیچھے رکھنا چاہتا تھا تو اسے ماریہ کو آگے رکھنا ہی تھا۔ ابھی ماریہ کو مارنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ شام کو اسی کے لیے وہ گھر جلدی چلا جاتا۔ وہ اس کے لیے کوکنگ بھی کرلیتی تھی۔ اس کے کپڑے ترتیب سے ہینگ کردیتی تھی۔ اس کے نخرے بھی اٹھالیتی تھی۔ وہ بھی لاڈ کرلیتا' لیکن اس سب کے دوران بھی وہ اس کے لیے ایک امتحان بنی ہوتی۔

عدن حسن پرست تھا اور کتنا بھی حسن پرست تھا' عورت میں شرافت کا قائل تھا۔

وہ اندر سے ایک گھسا پٹا روایتی مرد تھا۔ نیک سیرتی کا تمنائی' شرافت اور حیا کا دلدادہ' قدر کرے' نہ کرے' تعریف کرے نہ کرے' پر تمنائی ضرور تھا۔ کالج میں اس نے ایک سے بڑھ کر ایک حسن کے عجوبے سے دوستی کی' فلرٹ کیا' لیکن ان عجوبوں کے قریب ہوتے ہی وہ انہیں مختلف فہرستوں میں درج کرلیتا۔ یہ فلرٹ کے لیے' یہ صرف دوستی کے لیے' یہ ہائے ہیلو کے لیے۔ یہ صرف مسکرا کر دیکھنے' کبھی کبھار بات کرنے کے لیے۔ یہ ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے' یہ ہلڑبازی کے لیے' یہ بور ہوتے وقت فون پر بات کرنے کے لیے۔

ان میں سے ایک بھی "یہ شادی کے لیے" والی فہرست میں نہیں آئی تھی۔ امیر سے امیر ترین بھی نہیں... ایک' دو نے اسے بہت شوق سے اپنے خاندانوں سے ملوایا' لیکن وہ ان سے مل کر بھی پرے پرے ہی رہا۔ ایسا بھی کڑا وقت اس پر نہیں آیا تھا کہ سیکنڈ ہینڈ کتابیں لے کر پڑھے اور اسے دوم پر کچھ پسند بھی نہیں تھا۔ نہ انسان' نہ حیوان' نہ چیزیں' نہ درجے... اس کا ہر پیمانہ اول تھا۔ عورت کے پیمانے پر ایک اول اسے ملا تھا۔ لیکن دولت کے نمبر پر اس کے پاس آخری نمبر بھی نہیں تھے اور یہی اول اسے اکثر یاد آجاتا۔

جب وہ گرے ہوئے نمبروں والی ماریہ کو سوٹے لیتے ڈرنک کرتے' ناچتے اور دورے کی حالت میں دیکھتا۔ اس کے منہ سے گندی گندی گالیاں سنتا تب بھی۔

بس اسی لیے عدن نے ماریہ کو ایک نقطہ ہی بنا لیا تھا' تاکہ جب چاہے اسے کاغذ سمیت پھاڑ کر پھینک دے۔

جسمانی طور پر وہ کچھ ایسی پیچیدگیوں کا شکار تھی کہ آئندہ چند سالوں تک وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ عدن کے پاس یہی چند سال تھے۔ اسے گرے ہوئے نمبروں والی سے گرا ہوا بچہ نہیں چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ماریہ کے جی میں آئی تو وہ ہر بات کو بالائے طاق رکھ کر ماں ضرور بن جائے گی لیکن ابھی ان کے درمیان بچے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

بیٹی کی شادی شدہ زندگی کی چارج شیٹ سے غلام علی غلام صاحب مطمئن تھے۔ عدن کے اکاؤنٹ سے ان کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ وہاں سے فیکٹری میں منافع آکر سے دہرا اور دہرے سے تین گنا ہو جاتا۔

"تم ایک اور اسپتال کیوں نہیں بنوا لیتے؟" ماریہ بولی تھی۔ زندگی سیٹ تھی تو پاپا نے بروقت مشورہ دیا۔ اس نے وقت نکال کر اپنے سسر سے ان کے آفس میں ملاقات کی۔ انہوں نے نہ تائید کی' نہ انکار' وہ بولتا رہا وہ سنتے رہے۔ جیسے "سر! آپ کے شوز پالش کردیے ہیں۔"

اور سر... سر اٹھا کر "ہوں" بھی نہیں کہتے۔

چند ہفتوں بعد اسے معلوم ہوا کہ ماریہ کے نام ایک اسپتال کردی گئی ہے۔ چند ہفتے اور گزرے تو اس کے سسر اسپتال دکھانے لے گئے۔ عدن کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کاغذات ماریہ کے نام ہیں۔ اسے منافع سے غرض تھی۔ آگے کے اس کے پلانز بھی بہت کمال کے تھے۔ وہ کسی تیسرے شخص سے (دراصل خود) اپنے سسر کے اسٹورز میں شیئرز لے گا۔ وہ ان ہی کے پیسوں سے ان ہی کے کاروبار میں گھس جائے گا۔

اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لیے ماریہ نے یونیورسٹی جانا شروع کردیا۔ وہ ہسٹری میں ماسٹرز کررہی تھی جب اس کا تعلیمی سلسلہ چھوٹا تھا۔ اب ذہنی طور پر وہ بہتر ہوئی تو دوبارہ ایڈمیشن لے لیا۔ عدن دوسرے اسپتال کو بھی سیٹ کرنے لگا۔ میڈ گھر کو دیکھتی۔ بوسٹن میں سب ٹھیک تھا۔ پاکستان میں بھی ٹھیک تھا۔

پھر بات وہاں سے بگڑ گئی۔ جب وہ ماریہ کے ساتھ ایک کلب میں چلا گیا۔ آج کل ماریہ بہت کم پارٹیز میں جاتی تھی۔ اس کی دوستوں نے اصرار کیا تو وہ اسے ساتھ لے کر آگئی۔ وہ دونوں اور اس کی دو دوستیں ساتھ ساتھ کھڑے باتیں کررہے تھے کہ اچانک ایک دوست نے اس کے کان کے پاس منہ لا کر کچھ کہا۔ ماریہ نے ذرا سا گردن کو گھما کر پیچھے دیکھا۔

عدن نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ لیکن ہجوم میں اسے تو کچھ نظر نہیں آیا۔

"ہو رہی ہوگی کسی کے ملبوس یا جیولری کی بات۔" اس نے خیال نہ کیا مگر ماریہ کی جیسے حالت غیر ہوگئی۔ وہ رنگ بدلنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اوپن ایریا میں سکڑتے سمٹتے ہجوم میں اس نے کئی بار نظریں گھما کر اسے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی۔ اس کی دوستیں بھی غائب ہوگئیں۔ وہ ٹہل ٹہل کر اسے ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے فون کیے لیکن وہ کال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ بہت دیر بعد اس کا میسج آیا۔

"میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہوں' تم چلے جاؤ۔"

"تم ہو کہاں؟"

"تمہیں اس سے کیا؟" بھڑکتا ہوا جواب آیا تو وہ گھر آگیا۔ چند گھنٹوں بعد اسے بھی آجانا تھا لیکن وہ نہیں آئی' اگلے دن شام تک نہیں۔ اس کا فون بھی بند تھا۔ اس نے اس کی ماں کو فون کرکے بتادیا۔ اب وہ اس کا کوئی الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا تھا۔

"وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اسی کے ساتھ چلی گئی۔" ازبک ماں نے نہ جانے کس کس فرینڈ کو فون کرکرکے اس کا پتا کیا اور اسے بھی بتادیا۔

اس کی طبیعت کو وہ جانتا تھا۔ رات کو وہ واپس آئی تو وہ پوچھے بنا رہ نہیں سکا۔ وہ الماری کھولے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی جیسے سنا ہی نہیں' کپڑے ساتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی۔ عدن کا جی چاہا کہ گردن سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دے۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔"

"کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بیوی ہو تم میری۔" اتنی مشرقی بات مغربی بیوی

کے سامنے۔

"تم بھی میرے شوہر ہو' میں نے تو کبھی نہیں پوچھا۔"

دانت پر دانت جما کر آواز کو دبا کر وہ بولا۔ "تو پوچھ لیا کرو۔"

"اگر پوچھا تو بتانا بھی پڑے گا۔" ایک تو یہ باپ بیٹی چالاک بہت تھے۔ ہر چیز کی حد بندی کیے بیٹھے تھے۔

"تم نہ بھی پوچھو تو تمہیں یہ بتانا ہی پڑے گا تم کہاں تھیں کل رات' ڈرنک کرتی رہی ہو اپنی حالت دیکھو کس کے ساتھ تھیں تم؟"

اب وہ سیدھی ہوئی "بتاؤں" آواز میں تمسخر بھی تھا اور اترا ہٹ بھی "ریکس کے ساتھ تھی۔"

"تمہارا وہی ماڈل بوائے فرینڈ۔۔؟"

"کمال کی یادداشت ہے تمہاری۔" تالی بجانے جیسا انداز۔

"تم اس سے ملیں؟"

"کیوں نہ ملتی۔ دو سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔"

"رات بھر۔" عدن کا سر گھوم گیا۔ وہ آزاد خیال بے لاپروا بے ڈھیٹ بے پراتی۔ وہ نہیں جانتا تھا' جو کچھ شادی سے پہلے کیا۔ وہ اس پر ڈھیٹ بن گیا بے غیرت ہی سہی۔ مگر ابھی وہ زندہ تھا۔ اس کی موجودگی میں اسے نہ کوئی ڈر نہ لحاظ۔ جو اصل تکلیف تھی عدن کو وہ یہی تھی کہ اس کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ وہ قدم بڑھا کر ایک زوردار تھپڑ اس کے سفید گال پر مارا اتنی زور سے کہ وہ بل کھا کر نیچے گری۔ ہونٹ سے خون کی ایک باریک لکیر نکلی۔

"بے غیرت۔ ذلیل!" کچا چباتی آواز۔

فرش پر گرے سر اٹھا کر اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میری بیوی ہو کر تم رات بھر کسی اور کے ساتھ رہیں۔"

ٹانگوں کو سمیٹ کر وہ اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ عدن غصے سے بل کھاتا ٹہلنے لگا۔ اب وہ اس عورت کے ساتھ اور نہیں رہے گا۔ بہت ہو گیا۔ ذلیل۔

سائرن بجنے لگے۔ عدن نے توجہ نہ دی۔ سائرن کی آواز قریب آتی گئی۔ ماریہ کمرے سے نکلی۔ لپک کر داخلی دروازہ کھولا۔ دو پولیس آفیسرز اندر آئے۔ ماریہ نے عدن کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز بولنے لگی۔ آفیسر نے بڑھ کر اسے ہتھکڑی لگائی۔

"ماریہ!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ میاں بیوی کے جھگڑے گھروں میں نہیں رہتے۔ یہ امریکا ہے "میں تیرا لباس تو میرا لباس" یہاں یہ نہیں چلتا۔ طاقت کے بے دریغ اور غلط استعمال پر یہاں عدن کا دی جاتی ہیں مار کھا کر چھپ کر رویا نہیں جاتا۔

ماریہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گئی۔ ایک ٹانگ جھلانے لگی۔

"چور مچائے شور۔" اردو کا یہ فقرہ اسے بروقت یاد آیا۔ اس کے نزدیک چور صرف ماریہ تھی۔



پاکستان میں ٹاپ کرنے والے دیوانے کے باپ غلام علی غلام کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی گئی کہ وہ جیل میں ہے۔ عدن کے وکیل نے اس کے سسر کو بتایا۔ انہوں نے ماریہ سے بات کی اور جب وہ باہر آیا تو سیدھا ان ہی کے دفتر گیا۔ اس کا خون ابل رہا تھا اس گھٹیا عورت کے اس درجے کے گھٹیا پن پر۔ اپنا ہمدرد بنانے کے لیے اس نے انہیں ساری بات بتائی انہیں غیرت دلانا چاہی کہ ان کی بیٹی ساری رات کسی کے ساتھ تھی۔

وہ اپنی بیٹی کی طرح ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے رہے جیسے ان کا بٹلر ان سے احکامات لے رہا ہے۔ سگار پیتے رہے نہ تائید نہ انکار نہ مزید کی حوصلہ افزائی۔

"تم نے اسے مارا کیوں؟" ساری بات سن کر بھی پوچھا۔

"ہاتھ اٹھ گیا تھا میرا۔" سوال اسے پسند نہیں آیا۔

"تم نے اس کی پوری بات سنی۔ وہ ریکس سے ملی اس نے سب کو ڈنر آفر کیا تو ساتھ چلی گئی وہ اور دوست بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ رات وہ اپنی دوست کے پاس رک گئی اور تم نے اسے مارا۔"

بہت سمٹا کر ساری غلطی عدن کی نکلی۔

"یہ پاکستان نہیں ہے۔" کیسا باپ تھا۔

"اسے مجھے فون کر کے بتانا چاہیے تھا۔ اس نے کہا تھا کسی کے ساتھ ساری رات۔"

"ساری رات۔ کیا ساری رات دو دوست باتیں نہیں کر سکتے؟" اپنے سسر کی اس اعلا درجے کی مثالی بے غیرتی پر اسے بہت تاؤ آیا۔

"میں اس کا شوہر ہوں۔ اجازت نہ لیتی بتاتی تو سہی کیا میں اپنی بیوی کے ساتھ ریکس کے ڈنر میں نہیں جا سکتا تھا۔" دراصل آج عدن نے سوچ لیا تھا کہ اس باپ کو یہ بتا کر ہی اٹھے گا کہ اس کی بیٹی کے کرتوت کیا ہیں۔

"جیل سے کتنا منافع آتا ہے تم اسے بتاتے۔"

باپ آگے پیچھے سے اسے ہنٹر لگنے لگے۔

"اور وہ منافع کہاں جاتا ہے یہ؟"

لگتا اندھا بھی نہیں تھا اس کا سسر جو وہ اور غلام علی سمجھے بیٹھے تھے۔

وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ ہر بار لاجواب ہو کر ہی اٹھتا تھا۔

"ریکس اس کا صرف اچھا دوست ہے اور بس۔ شوہر اس کے تم ہی رہو گے۔ فکر نہ کرو۔" جاندار قہقہہ لگا اور شڑاپ شڑاپ ہنٹر اسے لگے۔

اس کے اندر نفرت کی آگ جلنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ ان دونوں کو اس نوبت تک لے آئے کہ وہ اس کے ہوتے جائیں اور وہ انہیں ہش ہش کرے' ایسی کاری ضرب کی شکست دے کہ دونوں اکلش میں بات کرنا بھول جائیں۔

لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ ابھی چپ رہ کر انتظار کرنا تھا' یہ سب جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کچھ کا کچھ بنتا جا رہا تھا تیو ماہ پہلے وہ ایسا نہیں تھا۔ مجھ ماہ بعد وہ ویسا نہیں رہا تھا۔

جب وہ گھر آیا تو ٹیبل پر پاؤں رکھے ماریہ نیل پالش لگا رہی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔ وہ اٹھی ڈریسنگ گاؤن سے بلیو لانگ گاؤن میں آئی۔ رولرز کھولے' میک اپ کیا اور ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔

عدن اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ ذہنی مریض بن جائے گا ماریہ کے ساتھ رہتے۔ اس کا لمحہ بھر کو جی چاہا کہ لات مارے سب پر اور بھاگ جائے۔ جیل ہو آیا تھا' سسر کے ہنٹر کھا آیا تھا۔ پاکستان کے لائق فائق خوبصورت لڑکے کا یہ حال ہو رہا تھا۔ خود کو نارمل کرنے کے لیے اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہن سے بات کی۔ پر وہ اوور ڈسٹرب ہو گیا۔ اس کا جی کسی اور کومل کی آواز سننے کو چاہنے لگا۔

"تم بتاؤ۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"تم کیا کرو گی؟"

"میں دعا کروں گی۔" کومل نے بہت اعتماد سے کہا۔

"میں نے کبھی اپنے لیے دعا نہیں کی۔ کسی سے کیا کراؤں گا۔" قہقہہ۔

"تم نے تو خود سے میری طرح محبت بھی نہ کی ہو گی' یہ دعا بھی مجھے ہی کرنے دو۔"

"میں اتنا پکا مذہبی نہیں ہوں۔ پکا کیا مذہبی ہی نہیں ہوں۔"

"اللہ کے تو ہو ناں۔ اللہ کے بندے۔ یا وہ بھی نہیں؟"

"عالم مت بنو۔" اس نے اکتا کر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

ماریہ پہلے والی ماریہ بن گئی' رات رات غائب رہتی' کبھی کبھار ہی عدن کو اس کی شکل دیکھنے کو ملتی۔

"مر جائے۔" اس کی طرف دھیان جاتے ہی وہ سوچتا۔

"چند سالوں کی بات ہے۔ صرف چند سال۔" وہ کچھ دنوں سے ایک فون نمبر کو یاد کرنے کی کوشش

کررہا تھا۔ لیکن ہر بار مایوسی ہی ہوئی' نمبر یاد نہیں آرہا تھا۔ وہ نمبر بھول چکا تھا۔ جس سم میں وہ نمبر تھا وہ سم اس نے پاکستان میں اپنے باتھ روم کے فلش میں بہادی تھی اور اب وہ نمبر یاد کرنا چاہ رہا تھا۔

آج اسے میامی جانا تھا اسپتال کے لیے کچھ آلات لینے۔ کام تو ایک ہی دن کا تھا لیکن وہ ایک ہفتے کے لیے جارہا تھا۔ بیگ لے کر وہ ایر پورٹ آگیا ابھی وہ کاؤنٹر تک نہیں گیا تھا کہ دو امریکن اس کے آگے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ اپنے کارڈ نکال کر اسے دکھائے' عدن کی آنکھیں کھل گئیں۔

"کم ود اَز۔" (ہمارے ساتھ آؤ)

"لیکن کیوں؟" عدن حواس باختہ ہوگیا' امریکن پولیس اور سی آئی اے کی کہانیاں وہ اخبارات میں آئے دن پڑھتا تھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک نے کمر کے پیچھے اس کے ہاتھ لے جاکر لاک کیے اور اسے آگے دھکا دینے لگا دوسرے نے بازو پکڑلیا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ کیوں لے جارہے ہیں مجھے آفیسرز!" اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

وہ دونوں گونگے بہرے بنے اسے ساتھ لے کر کار تک آئے' سر پر ہاتھ رکھوا کر اسے اندر دھکیلا اور کار چلادی۔ وہ سارے راستے کیوں' کیا' کیسے جیسے سوال کرتا رہا کوئی جواب نہیں ملا۔

اسے ایک اندھیرے سیل میں بند کردیا گیا۔

وہ اس وقت جیل میں ہے اس کا جرم کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا' جن دو لوگوں کے ساتھ وہ آیا انہوں نے اسے سیکرٹ سروس کارڈ دکھایا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ رونے کے قریب ہوگیا۔

کیا یہ ماریہ نے کیا ہے' لیکن وہ ایسا کیوں کرے گی' اگر چاہے بھی نہیں کرسکتی۔ امریکا میں ایسی فون کالز نہیں چلتیں جن کے ملاتے اور بات ہوتے ہی بے گناہ لوگ جیل میں دھر لیے جائیں اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اس پیمانے پر نہیں کہ ماریہ جیسی کر گزرے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کسی کو یہ دھمکی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ وہ کس باپ کا بیٹا ہے اور اس کا سسر کون ہے۔ بے خیالی میں وہ دیوار سے سر ٹکا کر بیٹھا رہا۔ اب ان امریکن کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے تو ٹھیک ہے یہ کلیر کرلیں اس کا حساب صاف تھا' چند گھنٹے اونگھنے کے بعد اسے پیاس لگی' لیکن پانی نہیں تھا اس کے ہاتھ پیچھے کمر پر بندھے تھے۔

وہ واٹر واٹر چلانے لگا۔ کافی دیر تک چلاتا رہا لیکن گلا پھاڑ آواز سیل میں ہی گونجتی رہی۔ اس کا حلق اور خشک ہوگیا۔ رات تک چلانے کی ہمت بھی جاتی رہی صبح تک وہ بھوک اور پیاس سے فرش پر بچھ گیا اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ سیل کے اندر کوئی نہیں آیا۔ نہ ہوا نہ پانی' نہ کھانا' نہ انسان۔

اس کے پیٹ سے آوازیں آنے لگیں دوبارہ وہ نیم بے ہوش ہوا' غنودگی طاری ہوئی لیکن نیند نہ آئی۔ گزرتے گزرتے پل گھنٹے بن کر ایک اور پورے دن میں ڈھل گئے۔ شام ہوئی رات آئی۔ پیاس سے اب وہ بالکل مرنے کے قریب تھا۔ اب وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی ایک قطرہ پانی پر لٹا سکتا تھا۔ کسی کا قتل کرسکتا تھا ایک بوند کے لیے وہ سب کچھ کرسکتا تھا اس نعمت کی قدر اسے آج سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ صرف دو دنوں میں ہی وہ بھول گیا کہ وہ کون ہے' کتنا لائق فائق ہے' کتنی فیکٹریوں کا مالک ہے' وہ آج کا آئندہ کا بھول گیا' لیکن حیرت انگیز طور پر اسے گزشتہ سے پیوستہ یاد آنے لگا۔

چند اور گھنٹے گزرے۔ رات گہری ہوگئی۔ وہ فرش پر ہی ادھ موا پڑا رہا۔ ہونٹ سوکھی لکڑی کی مانند ہوگئے اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ اٹھ کر چلائے۔ لیکن اٹھ نہ سکا' باقاعدگی سے ورزش کرنے والے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا کمزور ہے۔ کچھ باتیں بہت ہلاک ہوتی ہیں وقت آنے پر ہی کھلتی ہیں۔ بھلے سے پہلے کتنے بھی تجربے کرلو رکھ لو' حساب کتاب لگالو۔ جب کھلتی ہیں تو ہی اصل پرکھ دیتی ہیں۔

جب وہ پیاس سے بالکل مرنے کے قریب ہوگیا تو اس کے سیل کا دروازہ کھلا۔ دو لوگ اسے اٹھا کرلے

اسے ایک کرسی پر بٹھادیا گیا۔ اس کمرے میں تیسرا شخص اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لایا۔

"ہو آر یو" (کون ہو تم) پیاس سے مرنے کے عدن کو کچھ اندازہ ہوا کہ اس سوال سے اس کا کچھ اور ہی ہے۔

"ڈاکٹر عدن۔ ہز بینڈ آف۔ سن آف۔"

ایک گھونسا اس کے جبڑے پر آکر لگا۔ "نام نہیں ۔ ڈاکٹر اور سن آف قلم علی غلط۔ نام نہیں "

جبڑے پر پڑے گھونسے کی تکلیف سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل اٹھاتے اور سوکھے حلق کی تکلیف کو اس نے اس سب پر غور کرنا چاہا کہ اگر وہ اتنا کچھ ہے تو اس سے پوچھ کیا رہا ہے۔ اس کا سر ایک لڑھک گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس کے منہ کے ساتھ پانی لگا جیسے ہی اس نے زبان سے پانی اندر کیا' پانی ہٹالیا

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔" وہ

اس کے سامنے چند تصویریں ایک ایک کرکے لائی ۔ چند قطرے ہی اس کے حلق میں گئے تھے۔ سر ابھی بھی گھوم ہی رہا تھا تصویریں دیکھ کر بھی اس نے نہیں دیکھیں۔ ایک اور گھونسا جبڑے پر آیا۔

"دیکھو انہیں کون ہیں یہ؟"

اس نے آنکھیں پوری کھول کر غور سے دیکھنا چاہا۔ کو دیکھا دوسرے کو دیکھا۔ تیسرے کو دیکھا۔ وہ پہچان نہیں سکا۔

"میں نہیں جانتا انہیں۔" اس نے نہ میں گردن

"غور سے دیکھو انہیں۔"

اس نے پھر غور سے دیکھا۔ وہ ایک اور گھونسا کھانا چاہتا تھا ایک کی شکل کو اس نے ذرا سا پہچانا لیکن یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔

"میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔" اس نے صاف صاف بتادیا۔

"گڈ۔ باقی بھی بس اگل دو۔"

"میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور بس۔ میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔"

"یہ تمہارا ساتھی ہے۔"

"میرا ساتھی؟" آوازیں اسے دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بہت قوت لگا کر بول رہا تھا۔

"یہ ہمیں مطلوب ہیں اور یہ تمہارے ساتھی ہیں۔ کہاں ہیں یہ؟" اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔ یہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔" وہ مسام مسام بھیگ گیا۔

"یہ تمہارے ساتھی ہیں۔" وہ اس کے کان کے پاس منہ لا کر چلایا۔ جیسے وہیں سے گردن میں دانت گاڑ دے گا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔" اس نے بھی زور لگا کر چلانا چاہا۔

"یہ تینوں تمہارے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔" اس نے بند مٹھی کا ایک اور گھونسا تیار کیا۔

بجلی سی کوندی اور عدن کو یاد آیا کہ اس نے انہیں کہاں دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک اس کا مریض تھا۔ ہاتھ کا زخم لے کر ایک بار آیا تھا۔ زخم کی نوعیت ایسی تھی کہ اس نے عدن کو اچھی خاصی رقم دی تھی اور خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔ عدن نے رقم رکھ لی اور علاج کردیا۔ چند ہفتوں بعد اسی شخص کا حوالہ دے کر دو اور لوگ کمر اور پیٹ کے ویسے ہی گہرے زخموں کے لیے اس کے پاس آئے تھے۔ یہ تیز دھار چاقو کے زخم تھے۔ رقم اس بار بھی زیادہ ملی اور عدن بھول بھی گیا کہ ایسا کوئی اس کے پاس آیا بھی تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ وہ امریکا میں ہے اور وہاں کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ وہ تینوں سفید فام تھے۔ غیر مسلم تھے۔ لیکن ان کا تعلق مشرق وسطیٰ کی خفیہ تنظیموں سے تھا۔

"ہاں... یہ میرے پاس علاج کے لیے آئے تھے۔" عدن نے سب سچ سچ بتا دیا۔ یہ بھی کہ ان سے بہت پیسے ملے تھے لیکن اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

اس پکے سے باڈی گارڈ ٹائپ آدمی کے چہرے پر تمسخر ابھرا۔

"کہاں ہیں وہ اب...؟"

"میں نہیں جانتا... میں قسم کھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میں قسم کھاتا ہوں یہ خود میرے پاس آئے تھے۔"

"کون ہیں وہ... تمہیں کہاں ملے... تمہارا رابطہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ سوال پر سوال پوچھنے لگا۔ اس کے اعصاب پر حاوی ہو چکا تھا۔

"میں قسم کھاتا ہوں' میں نہیں جانتا۔" عدن کی آواز رندھ گئی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اسے آس پاس شرارے نظر آنے لگے۔ نیم اندھیرے میں رقص بسمل... زخم خوردہ نیند میں جان لیوا خواب۔

"تم ان کے ساتھی ہو... تم ایک دہشت گرد ہو؟"

وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا۔ امریکی جیل میں ایک امریکی کے سامنے مردوں کی طرح بیٹھا وہ یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ اس پر "دہشت گرد" کا لیبل نہ لگا دیں۔

اخباروں میں پڑھی گئیں' ٹی وی میں دیکھی گئیں خبریں اس کے آگے پیچھے گھومنے لگیں۔ اس پر بیان سے باہر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ صرف تفتیش نہیں کر رہا تھا' اسے دہشت گرد ثابت کر رہا تھا۔ اس سے منوا رہا تھا۔

اس نے ایک غلطی کی تھی ان سے زیادہ رقم لینے کی اور اسی لالچ کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ جیسے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی وہ امریکی سیل میں بھی ہو گا۔ ایسے ہی اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر آئے گا بھی کہ نہیں۔

اب اسے ماریہ یاد آ رہی تھی... وہ اس کی بیوی تھی۔ اسے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے اور وہ ضرور کرے گی جب غلام علی غلام کو اس کے اندر ہونے کی خبر ملے گی تو وہ بھاگے چلے آئیں گے' اپنے سارے اثر و رسوخ استعمال کر لیں گے اور اس کے سسر وہ کیسے برداشت کریں گے کہ ان کا داماد' ان کی اکلوتی بیٹی کا شوہر جیل میں رہے۔

وہ جلد ہی باہر آ جائے گا... جلد ہی... اتنی دولت... اتنے تعلقات کب کام آئیں گے۔ وہ ایک پڑھا لکھا' امن شہری ہے' ڈاکٹر ہے' مسیحا' دہشت گرد نہیں ہو سکتا۔ اس کے حق میں بہت سے ثبوت ملیں گے۔

☆ ☆ ☆

جیل آنے کے آٹھ ماہ بعد اس نے بیرونی دنیا کے جس پہلے شخص کو اپنے پاس پایا۔ وہ اس کا وکیل عبدالعزیز تھا۔ سیاہ فام امریکی مسلم تھا۔ اس کے سامنے وہ دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ عزیز اسے بتا رہا تھا کہ کن مشکلات سے اس سے یہ ملاقات ہو پائی ہے۔

"پاپا نہیں آئے؟" اس کا پہلا سوال یہی تھا۔ وہ لاغر کمزور ہو چکا تھا۔ یہ جسمانی بات تھی... وہ اندر سے کیا کچھ ہو چکا تھا... یہ دوسری بات تھی۔

"وہ نہیں آ سکتے... تم سے صرف میں ہی مل سکتا ہوں۔"

"کہاں ہیں وہ؟ انہیں آنا چاہیے تھا۔" ہر چیز کو ممکن کرنے والے پاپا کے لیے یہاں آنا کیا مشکل تھا۔

"وہ امریکا میں نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں؟" اسے اپنے جیل آنے سے زیادہ صدمہ اس بات کو جان کر ہوا کہ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کے پاس امریکا میں نہیں ہیں۔

"میرے پاس وقت کم ہے... تم مجھے ہر بات بتاؤ۔ میں نے جتنی بھی معلومات اکٹھی کی ہیں' وہ ناکافی ہیں۔"

"میرے پاپا کہاں ہیں؟" بھاڑ میں جائے اس کا کیس۔ اسے اپنے باپ کی فکر تھی کہیں... وہ...

"وہ پاکستان میں ہیں... مجھے انہوں نے ہی پاکستان سے ہائر کیا ہے۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "آپ [...]ے کیس پر بات کریں۔"

"پاکستان میں...؟" اسے ایک اور صدمہ ملا۔ وہ [...]ں جیل میں اور اس کا باپ پاکستان میں ہے۔ ہو ہی [...]ں سکتا۔ وہ تو پہلی فلائٹ لے کر یہاں بھاگے چلے [...]ئے ہوں گے۔

"وہ ٹھیک ہیں؟ ٹھیک ہیں وہ؟" وہ صدمے سے [...]نے کے قریب تھا۔ "وہ زندہ ہیں نا؟" وہ سمجھا اس کے [...]دمے نے ان کی جان لے لی ہو گی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں' میری ان سے یہاں آنے [...]ے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم گھبرانا [...]"

[...] بات پر وہ الجھ گیا۔ "وہ خود کیوں نہیں یہاں [...]"

"[...]وقت ختم ہو رہا ہے۔ اپنے کیس سے متعلق بات [...]و۔" وہ جھنجلا گیا۔

[...]چار عدن نے اسے ایک ایک بات شروع سے [...]تک بتا دی۔

"[...]ن کے پاس ویڈیو بھی ہے... ان تینوں کی' [...]ے اسپتال میں آنے کے وقت کی... وہ رات گئے [...]ے تقریباً منہ چھپا کر۔"

[...]زیز نے اس سے کافی باتیں کیں۔ جاتے ہوئے [...]نے تسلی کے نام پر دو لفظ نہیں کہے۔ شاید وہ جھوٹی [...]ینے والوں میں سے نہیں تھا۔

[...]شروع کے دنوں میں وہ چیختا چلاتا رہا تھا۔ سوال پر [...]ل کرتا تھا۔ بار بار کہتا تھا۔ کئی کئی دن بھوکا رکھا جاتا [...]ھر اسے چپ لگ گئی۔ اب وہ بنا آواز اور آنسو [...]ے نیند آ جاتی تو شکر کرتا' ورنہ جاگتا رہتا۔ ٹی وی [...]بھی ڈاکومنٹریاں اسے یاد آنے لگتیں۔ اب وہ بھی [...]سے نہیں نکل سکے گا۔ پہلے ہی ہفتے اسے یقین [...]

[...]نے باہر آنے کی امید چھوڑ دی' وہ صرف موت [...]نتظار کرنے لگا... وہ اپنی قید کے دن گننے لگا۔ اب عزیز [...] کے پاس رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔

[...]س کا اسپتال سیل ہو چکا تھا۔ اکاؤنٹ فریز کر دیے گئے تھے۔ غلام علی غلام کو ان کے پاکستانی وکیل نے مشورہ دیا تھا کہ ان کا امریکا جانا ٹھیک نہیں۔ "سی آئی اے" کی تحویل میں وہ بھی آ سکتے ہیں۔ ایسا سو فیصد ہو سکتا تھا۔ انہیں پاکستان ہی رکنا پڑا۔ وہیں سے ساری کوششیں کرنی پڑیں۔ اسپتال کے فروخت ہوتے ہی ماریہ اور اس کے خاندان پر بھی کڑی نگرانی رکھی گئی تھی۔ کئی ہفتے ان سے تفتیش ہوتی رہی تھی۔ آغا عباس حیدر کو اسٹورز کی ساری چین ہاتھ سے نکلتی دکھائی دی۔ ان کی اپنی امریکی قومیت خطرے میں پڑ گئی۔

اس موقع پر وہ ریورٹ کچھ کام آئی جو ماریہ نے عدن کے تھپڑ پر کروائی تھی اور پولیس عدن کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ ماریہ کی مام ڈیڈ اور اس کے اکلوتے بھائی نے اپنے وکیل کے مشورے پر صاف صاف یہ بیان دیا کہ وہ اس کی عادات اور حرکتوں سے پہلے ہی سے تنگ تھے۔ وہ خود اس کی طرف سے مشکوک تھے۔ اس کے رویے سے نالاں تھے۔ وہ اسے نہیں جانتے۔ وہ پاکستانی تھا۔ وہ امریکا میں رہ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا تعلق کن کن لوگوں سے تھا۔

آغا عباس حیدر زیادہ کھاگ تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی اور کئی باتیں سوچ کر گھڑ کر سنائیں۔ انہیں بس اپنی جان چھڑوانی تھی۔

ساتھ ہی ماریہ نے عدالت میں طلاق کے لیے درخواست دائر کر دی۔ ازبک مام نے اسے لالچی اور پیسے کا رسیا ثابت کرنا چاہا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے امریکا میں رہ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ امریکا میں کسی مسئلے سے کیسے نکلنا ہے۔

عدن کے خلاف ڈھیروں بیانات اکٹھے ہو گئے۔

"اس کا ساتھ دینے کے بجائے تمہاری بیٹی اس سے طلاق لے رہی ہے۔" بیوی کو گرل فرینڈ بنا کر رکھنے کا مشورہ دینے والے پاپا یہ شکوہ کر رہے تھے۔

"یہ فیصلہ وہ پہلا تھپڑ کھانے پر ہی کر چکی تھی۔" امریکیوں سے پہلے انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ دہشت گرد ہے۔

"اس کی مدد کرنے کے بجائے تم یہ سب کرو گے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی اور نہیں تو دوست کا بیٹا ہی سمجھ لو اسے۔"

"اس کی مدد کے لیے تم کیوں نہیں یہاں آجاتے۔ باپ ہو تم اس کے۔"

"قانونی باپ تو تم بھی ہو اس کے۔"

"میں صرف ماریہ کا باپ ہوں اور اسے وہ مارتا رہا ہے۔ کتنے لالچی ہو تم لوگ' اس کے اکاؤنٹ سے پیسے تمہارے ہی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتے رہے ہیں۔ تمہارے بیٹے نے تو یہاں ڈالرز کی فیکٹری لگا رکھی تھی' دہشت گرد ہے وہ۔"

"نہیں ہے وہ دہشت گرد۔" وہ غصے سے کھول اٹھے۔

آغا جی نے جناتی قہقہہ لگایا۔ "مان لو یہ بات' امریکی غلط نہیں ہوتے' اگر غلط ہوں تو بھی اسے غلط نہیں رہنے دیتے۔"

"تم نے پھنسوایا ہے اسے۔" فون کے پار وہ دھاڑے۔

"مجھے اس چوہے کو پھنسوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی مڈی کو میں پیروں تلے بھی نہیں کچلتا' چوہے کے لیے شیر کا پنجہ۔ ہونہہ......!"

"اسی مڈی کے ساتھ تم نے اپنی کال گرل بیٹی کو بیاہ دیا۔ جس پر ہر امریکی تھوک کیا تھا۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا' آغا کی گردن دبوچ لیں۔

"اس تھوکی ہوئی کو تمہارے بیٹے نے کیوں چاہا آخر۔" آغا نے بہت آرام سے پوچھا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد عدن سے متعلق آنے والی کوئی فون کال ریسیو نہ کی گئی۔ ماریہ کو امریکا سے باہر بھیج دیا۔ کچھ ہی عرصے بعد خود بھی فرانس چلے گئے۔ اپنے بزنس کو وہ کہیں سے بھی ہینڈل کر سکتے تھے۔

ماریہ نامی بلا' آغا نامی دولت کو بہت شان و شوکت سے عدن کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ بہت دھوم دھڑکا تھا ان کے نام اور دولت کا' عدن اور اس کے باپ کے لیے ایک سال آٹھ ماہ پہلے ان ناموں کا بہت ڈنکا بجا تھا۔ رنگ ماسٹر غلام علی غلام نے بہت لمبی پلاننگ کی تھی۔ دونوں دوست تھے۔ ساتھ ساتھ پڑھے تھے' آغا امریکا چلے گئے۔ غلام علی نے اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ عرصے میں آغا کہاں سے کہاں جا پہنچے اور غلام علی صرف تین فیکٹریاں ہی بنا سکے۔ جس طرح وہ اپنے بیٹے کو بڑے بڑے ٹارگٹ دیتے تھے۔ اسی طرح اپنے لیے بھی بڑے ٹارگٹ ہی رکھتے تھے اور ان کا ٹارگٹ آغا کو کٹ کرنا تھا۔ لیکن ایسا ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے امریکا چکر لگاتے رہتے۔ آغا پر قریب سے نظر رکھتے۔ ماریہ بھی ان کی نظر میں تھی اور اس قریب کی نظر میں ہی وہ جان گئے کہ ماریہ جیسی لڑکی ان کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت ہی مشکل ہے' وہ کرے گی تو اپنی مرضی سے' ورنہ کوئی اسے عدن کے لیے منا نہیں سکے گا اور آغا کیوں عدن کی طرف جھکنے لگا۔ ساتھ ساتھ غلام علی نے دو' تین اور خاندانوں پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آغا عدن کی طرف جھک ہی گیا۔ ماریہ انہیں مل ہی گئی' لیکن پھر بھی کیا ہوا۔ آغا خود کو بچا کر ایک طرف ہو گئے۔ بیٹا تو ان کا ہی گیا نا۔

غلام علی کو یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے آغا کا ہاتھ ہے۔ آغا نے کسی حسد یا جلن میں عدن کو پھنسایا ہے۔ کوئی بدلہ لیا ہے۔ غلام علی سے۔ اور غلام علی دھوکا کھا گئے۔ آغا پر سارا الزام دھرتے وہ اس آگ کو بھول گئے جو چلتی فیکٹری میں لگا کر بھڑکائی گئی تھی۔ فیکٹری دیوالیہ ہو رہی تھی۔ انہیں بیمہ کی رقم چاہیے تھی۔ فیکٹری کو حادثے کی ضرورت تھی۔ اس حادثے کا منصوبہ انہوں نے بنا لیا۔ غلام علی' عدن' عدن کے بھائی' ان کے چند دوستوں نے مل کر کمال کا منصوبہ تشکیل دیا۔ چلتی فیکٹری' دن کے وقت پچاس ورکرز کی موجودگی میں آگ بھڑکی اور فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس آگ نے کیا کچھ نہیں تباہ کیا تھا۔ صرف غلام علی غلام کو ہی تباہ نہیں کیا تھا' دس نو عمر لڑکے جھلس کر

جو زندہ رہے' وہ جگہ جگہ سے جھلس گئے' تین ہفتوں کے وقفے سے مر گئے۔ کہتے ہیں آگ کا جلا بچتا نہیں' جو مر گئے تھے ان کے گھر والے پیچھے سے مر گئے۔ کسی کا جوان بھائی گیا' کسی کا شوہر' تو کوئی تین بچے یتیم کر گیا' کوئی سات۔

مرنے والے مر گئے۔ فیکٹری بند ہو گئی۔ باقی ماندہ بے کار ہو گئے۔ امداد کے نام پر ان کو ایک روپیہ نہ دیا گیا' نہ علاج کروایا گیا' نہ کھانے کو دیا گیا' فیکٹری میں کام کرنے والے پچاس ورکرز اپنی موت اور آگ سے وہاں پر روز کی طرح کام کرنے آئے تھے۔ ان میں سے کئی بعد ازاں دمے کے مریض بن گئے۔ ان کے ساتھ یہ سب اچانک ہوا اور بھیانک ہوا۔ اتنے بیٹوں' شوہروں' باپوں کو نگل لینے والا غلام علی غلام اپنے صرف ایک بیٹے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

آغا جی کے لیے ان کے اندر ایسی آگ بھڑکی تھی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کے سینے پر چڑھ کر اس کا کلیجہ کچا چبا لیں۔ لیکن وہ بے بس تھے۔

غلام علی غلام کو اب اپنی طاقت اور حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ زندہ لوگوں کو جلانے والے' کاغذ کے نوٹ اکٹھے کرنے والے' فرعون بنتے ہیں' بھول جاتے ہیں ظلم کا جواب گھونسے سے ملے گا اور ضرور ملے گا۔

غلام علی غلام کا بس نہیں چل رہا تھا ایک ایک امریکی کو خرید لیں لیکن نہ ان کے پاس اتنے پیسے تھے نہ ہی سارے امریکی بک رہے تھے۔ امریکا وہ جا نہیں سکتے تھے' ان کے وکیل نے سختی سے منع کیا تھا۔ عدن کے اکاؤنٹ سے پیسے انہیں ہی ٹرانسفر کیے جاتے رہے تھے' انہیں بھی دہشت گرد سمجھ لیا جائے گا۔ پاکستان سے ہی انہوں نے ایک قابل وکیل کو ہائر کیا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود عدن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کس ریاست' کس شہر کی جیل میں' کوئی بھی انہیں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آٹھ ماہ غلام علی غلام نے جلتے کوئلوں پر گزارے' پیسہ پانی کی طرح جا رہا تھا۔ وہی پیسہ جو پانی کی طرح کمایا گیا تھا۔ وہ ہر وقت عزیز سے رابطے میں رہتے تھے۔ عدن سے ملاقات کی روداد سن کر غلام علی غلام رونے کے قریب ہو گئے۔ انہیں ایسا وقت بھی دیکھنا تھا۔ ان کا دیوتا غلام بنا لیا گیا تھا۔ ان کے بار بار پوچھنے پر بھی عزیز نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہو گیا تھا۔ وہ کیس ہی ڈسکس کرتا رہا۔ عزیز نے انہیں ایک فیصد بھی آس نہیں دلائی تھی کہ اس کا کیس مضبوط ہے اور وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

"سب کچھ اس کے خلاف ہے۔ اس کے پاس اپنے حق میں ثابت کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"وہ بے قصور ہے۔" غلام علی کے پاس صرف یہی ایک دلیل تھی۔

"اس نے ان سے پیسے لیے تھے۔"

"وہ پیسے علاج کے لیے تھے۔"

"وہ پیسے ان کی شناخت کو چھپانے کے لیے تھے۔ عدن نے رات گئے اپنے آفس میں تنہا انہیں ڈیل کیا۔ ان کا علاج کیا اور..."

"وہ پھر بھی بے قصور ہے۔ دہشت گرد نہیں ہے۔ ان کا ساتھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے وہ.... تم اسے جلد سے جلد باہر نکلواؤ' جتنا چاہیے پیسہ لگے میں دوں گا۔"

"پیسہ نہیں۔ ثبوت چاہیے' یہاں پیسے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پیسے سے سب ہو جاتا ہے۔" غلام علی کے پاس ایک ہی حل تھا پیسہ....

عزیز چپ ہی رہا۔ سوچنے لگا' کیسا انسان ہے۔ بات سمجھ ہی نہیں رہا۔ پیسہ پیسہ کر رہا ہے۔ جیسے قانون میری جیب میں ہے۔ عدالت میرے حکم سے چلتی ہو اور میں وکیل نہ ہوں۔ کوئی دکان دار ہوں کہ سب خرید کر دے دیا۔ ویسے ہی مشرقی لوگوں سے اس کا واسطہ پہلے بھی پڑ چکا تھا لیکن اس بار اسے حیرت تھی۔ کیونکہ غلام علی مسلمان تھا۔ وہ خود بھی مسلمان تھا۔ اس شخص کے ساتھ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے رابطے میں تھا

اور اس کی کسی ایک بھی بات نے عزیز کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بہرحال یہ اس کا پیشہ تھا اور اسے دل جمعی سے کام کرنا تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی کئی ملاقاتیں عدن سے ہوئیں۔ اب وہ کچھ سنبھل رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی باہر آجائے گا۔

"تم دوبارہ ان سے کبھی ملے؟"

"نہیں' کبھی نہیں' پھر کبھی نہیں۔"

"ان کے نام بھی نہیں جانتے؟"

"نہیں۔ انہوں نے کہا۔ کچھ مت پوچھو صرف علاج کرو۔"

"برائے مہربانی مجھے ایک بار پھر سے یاد کرکے بتاؤ۔ وہ تم سے کہیں اور ملے یا دوبارہ تمہارے پاس آئے یا تمہیں فون کیا؟"

"میں کتنی بار بتا چکا ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

"تمہیں اپنے اعصاب قابو میں رکھنے چاہئیں۔" عزیز نے تحمل سے کہا۔

"کچھ بھی میرے قابو میں نہیں ہے۔" وہ چڑ گیا۔

"اکثر باتیں بے معنی نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ بے حد اہم ہوتی ہیں۔ اگر وہ تیسری' چوتھی بار تمہارے قریب سے بھی گزرے ہوں گے تو میرے لیے تمہارے کیس کا دفاع مشکل ترین ہو جائے گا۔"

عدن نے اپنی سوچوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ بہت باریک بینی سے پھر سے اپنی یادداشت کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں انہیں جانتا ہی نہیں۔ وہ میرے پاس خود آئے تھے۔"

"یہ نہیں مانیں گے' تم نے ان کی شناخت رجسٹرڈ نہ کرکے بہت بڑی غلطی کی۔"

"یہ کیسے نہیں مانیں گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں' پولیس والا نہیں کہ علاج سے پہلے تفتیش کروں۔ مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے ان کے ناموں کے اندراج نہیں کیے۔ ان کے زخموں کی نوعیت کو چھپایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان کا ساتھی ہوں یا دہشت گرد ہوں۔ مجھے میرے جرم کی سزا ملنی چاہیے مگر اتنی بڑی سزا نہیں۔"

"یہ دلائل تو جج کے سامنے ہی دیے جائیں گے۔"

اس جواب پر عدن غصے سے عزیز کو دیکھ کر رہ گیا۔

"اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو جو وقت پڑنے پر تھپکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے۔ اپنی پشت پر یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا ہو گا۔ یہ من و سلویٰ نہیں کہ بیٹھے بٹھائے مل جائے۔"

عزیز کی بات درست تھی مگر پشت پر تھپکی دینے والا وہ ہاتھ اسی پشت کو کنویں میں اور نیچے دھکا دے کر جا چکا تھا۔

اس کا اپنا سگا باپ امریکا کے ڈر سے امریکا نہیں آرہا تھا۔

"امکانات تو بہت سے ہیں۔ یہ بھی کہ مقدمہ عدالت تک جائے گا ہی نہیں اور یہیں کہیں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔"

ایک اور تیز نگاہ اس نے عزیز پر ڈالی کچا کھا جانے والی۔

"ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں ایک عام انسان ہوں۔ پڑھا لکھا ایسے کیسے؟" وہ چلایا۔

عزیز نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

"تم ماریہ کے ڈیڈ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو' بہت سے سرمایہ دار ان کے دوست ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ان کے گھر آتے جاتے ہیں۔ کچھ قانون دان بھی ان کے جاننے والے ہیں۔ میڈیا سے روابط ہیں ان کے۔"

"جو بیانات انہوں نے تمہارے خلاف دیے ہیں' مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری کوئی بھی مدد کریں گے مگر پھر بھی ٹرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"ماریہ سے بات ہوئی تمہاری؟"

"اس کے وکیل سے ہوئی تھی۔"

عدن نے تین' چار غلیظ گالیاں ماریہ کے نام کی' دو امریکی قانون والوں کو گالیاں دینے لگا۔ جنہوں نے اس جیسے شریف' پڑھے لکھے انسان کو قید کرلیا تھا۔

پھر گیارہ ماہ گزر گئے۔ کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

وہ اس کی منت سماجت پر آگیا۔

"میں کوشش ہی تو کررہا ہوں عدن!"

"مجھے یہاں سے نکالو' پلیز' کچھ کرو۔" اس نے رونے میں شرم محسوس نہیں کی اور عزیز کے سامنے رونے لگا۔

"اگر تم پر کچھ ثابت نہ ہوا تو تم ضرور باہر آؤ گے۔"

"اگر ثابت ہو گیا۔ انہوں نے ثابت کردیا۔ پھر۔"

"بیک اٹ ایزی پلیز۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"مجھے کون بے گناہ ثابت کرے گا۔"

"میں کوشش کروں گا' کر رہا ہوں۔"

"کوئی میری ضمانت بھی نہیں کروا سکتا؟"

عزیز کو اس کے بھولپن پر تمسخرانہ ہنسی سی آگئی۔

"ابھی تو کوئی بابا بھی تمہیں ضمانت پر رہا نہیں کروا سکتا۔"

"پھر کون کروا سکتا ہے؟" اس وقت وہ پاگل پن کی حد کے قریب تر تھا۔

عزیز نے کندھے اچکائے۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

"خدا۔"

"خدا!" عدن بڑبڑایا۔ جیل میں رہتے بھی اس نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ دکھ میں ہی سہی۔ مانگنا آتا ہے۔ تب مل ہی جاتا ہے۔ عدن کو مانگنا آتا نہیں تھا۔ جسے آتا تھا اس کا دعوا تھا اسے سب پتا تھا۔

"تم ایک کام کرنا عزیز۔ بابا کو فون کرنا' غور سے کہنا' انار کلی' نیلا گنبد گلی نمبر چار میں جائیں۔ سبز رنگ کے دروازے والے گھر میں آواز دے کر کہیں آزاد کروا دے۔ صرف ایک اور احسان کردے۔ چھوٹا ہے۔ گلی تنگ ہے لیکن بابا سے کہنا' ضرور جائیں۔ وہ مانگتی ہے اور اسے ملتا ہے۔ میری آزادی مل جائے گی۔"

وہ اس کی طرف دیکھے گیا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"میں کہہ دوں گا۔"

"تم بابا سے کہہ دینا۔" اس نے آنکھیں پونچھیں۔

☆ ☆ ☆

انار کلی نیلے گنبد سے اندر رہائشی آبادی میں پہلی سڑک سے نکلتی گلیوں میں دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں' جو بند بھی ہے اور تنگ بھی اور جس میں صرف دو ہی گھر ہیں' جس میں سے ایک گھر میں وہ رہتی ہے افق کشمیری حسن والی' خشک میوے کے ڈھیر پر سرخ کشمیری سیب سی' وہ اس وقت فرا بنا رہی ہے۔ صبح فجر دم اٹھ کر گھر کے کام سے فارغ ہو کر وہ لکڑی کے چوڑے تختے نما چوکی کے سامنے چوکڑی جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ دوپہر تک چوکڑی ایسے ہی جمی رہتی۔ پانی کا جگ بھر کر وہ اپنے پاس ہی رکھ لیتی۔ تاکہ دوپہر سے پہلے اٹھنا نہ پڑے۔ گھٹنوں سے پیوست چوکڑی لیے بھر کے لیے کھلتی تو درد کی لہریں نکلتیں' پھر دوبارہ بیٹھنے میں درد ہوتا۔ وہ ٹھیک دو بجے اٹھ جاتی۔ روٹی پکاتی' سالن پکاتی۔

اب سب آتے جائیں گے۔ کھانا کھاتے جائیں گے۔ پہلے اسد اور جمال آئیں گے۔ کھانا کھائیں گے اور پڑھنے بیٹھ جائیں گے۔ ان سب کے پاس ایک ہی چیز کی کمی تھی وقت کی' ورنہ فارغ وقت میں وہ پہاڑ بھی کھودنے بیٹھ جاتے۔ سارے وقت میں وہ بس کام ہی کرتے رہتے۔ روٹی پکانے اور کھانے میں صرف ہونے والا یہ آدھ گھنٹہ بھی افق پر بڑا بھاری گزرتا۔ جی چاہتا کہ فرا بس جلدی جلدی بن جائے۔ اسے ڈر رہتا تھا کہ اگر اس نے وقت پر فرا بنا کر نہ دیا تو اسے مزید کام نہیں ملے گا اور اگر کام نہیں ملے گا۔ تو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ یہ ڈر اسے ہر روز لاحق ہو جاتا۔ چھوٹی سی تھی تو چھوٹے ڈر رکھتی تھی۔ ہر وقت ڈری ہی رہتی۔

تین بجے اماں آئیں' بنا کھانا کھائے ہی لیٹ گئیں۔ فرا بناتے وہ اٹھی۔ "کیا ہوا' تھک گئیں؟" وہ مسکرائیں۔ "میں کھانا کھالوں گی' تم اپنا کام کرو۔"

"اچھا جی!"

"کھانا کھایا تم نے؟"

"جی!" کام کرتے ہوئے کہا گیا۔

"کچھ دیر آرام کرلو۔"
"نہیں جی!" وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔
دونوں اسی طرح اپنے فرائض پورے کردیتیں۔
افق تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ہزار کا فرما تھا۔ ایک ایک کاغذ کو نمبر دیکھ کر فولڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی تہ بٹھانی ہوتی ہے۔ شام چھ' سات بجے دکان سے لڑکا آتا ہے تیار شدہ فرما لے جاتا اور مزید تیار کرنے کے لیے دے جاتا۔ کبھی کبھی فرمے کی جگہ خاکی لفافے بنانے کے لیے دے جاتا۔ ہفتہ وار اجرت مل جاتی۔
"افق! چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"
اس نے جھک کر کاغذ کی تعداد دیکھی اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ چھ سے ساڑھے چھ ہو گئے۔ فرما بن گیا۔ اس نے ٹھنڈی چائے پی لی' لڑکا آیا' فرما اٹھا کر لے گیا۔ نئے بنانے کے لیے رکھ گیا۔ اب یہ والے فرمے وہ رات کو شروع کرے گی۔
تھوڑی دیر لیٹ کر وہ کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ اماں کھانا بنانے لگیں۔ چند گھنٹے پڑھنے کے بعد اسے پھر سے کام سے لگ جانا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے چاروں افراد کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ افق گھر میں کرتی تھی۔ اماں اسکول کی کینٹین میں' دونوں بھائی پریس میں' بہت سالوں سے ان کی زندگی ہر روز ایسے ہی شروع ہو گئی تھی۔
اماں آٹھ پاس بھی نہیں تھیں۔ اسکول کی پرنسپل اچھی تھیں۔ انہیں کینٹین کے لیے رکھ لیا تھا۔ دو بجے تک وہ چھوٹی سی دکان نما کینٹین میں کاپی' پنسل' جوس' برگر بیچتی تھیں۔
شروع میں پندرہ سو ماہوار پر رکھا گیا۔ سال گزرنے پر ان کی تنخواہ میں چند سو بڑھ جاتے۔ اب انہیں ڈھائی ہزار ملتے تھے۔
جمال اور اسد سرکاری اسکول کے فنڈ سے پڑھتے تھے۔ بیماری کی صورت میں وہ فنڈ سے پیسے لے سکتے تھے جو انہوں نے کبھی نہیں لیے تھے۔ انہیں صرف کتابیں ہی چاہیے تھیں۔ جمال کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی اپنا نام فنڈ کی فہرست سے خارج کروا دے گا۔ فیس خود دینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں آدھے گھنٹے کی مسافت طے کر کے پیدل اسکول آتے جاتے تھے۔ انہوں نے اس بات پہ کبھی آنسو نہیں بہائے کہ شام کو کھیلنے کے بجائے انہیں پریس کیوں جانا پڑتا ہے۔
انسان کا پیٹ کتنا اچھا ہے۔ کتنا بھلا مانس' شریف' چپ' مان لینے والا' ایسے ہی افق نے کیا' افق نے آٹھویں تک اسکول سے پڑھا تھا۔ میٹرک پرائیویٹ کیا۔ آج کل ایف اے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بہت معصوم سی' کم صم سی لڑکی تھی۔ اتنا کام کرتی' کہ اماں اسے دیکھ دیکھ رونے کے قریب ہو جاتیں۔ انہیں ڈر لگتا کہ تختے پر جھکے جھکے وہ بڈھی ہو جائے گی۔ کبھی کمر اس کا کب نکل کر ہی چھوڑے گی۔
"افق بس کرو۔" رات گئے ان کی آنکھ کھلی تو حسب معمول کہا۔
"جی اچھا! ابھی کرتی ہوں۔" وہ اکلوتے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اماں کمرے میں سو رہی تھیں۔
اماں کے سامنے وہ کمر سیدھی کر سکے تو بھی کرتی۔ ورنہ اماں دو وقت کی روٹی پہ سب کو لے آتیں۔
ایک کمرے' برآمدے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر تھا۔ آہستہ آہستہ پیسے جمع کر کے اماں نے فرش اور دیواروں کی مرمت کروالی تھی۔ اماں ہر سال سفیدی کرواتی تھیں۔
اکلوتے کمرے میں لنڈے کا قالین بچھا تھا۔ کمرے کا یہی واحد سامان تھا۔ اسی پر وہ سب تکیے رکھ کر سو جاتے تھے۔ تکیے اٹھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ دیوار پر سامنے ایک گھڑی' ایک طرف کیلنڈر اور دوسری سامنے دیوار پر افق کے مرحوم والد کی ایک تصویر لگی تھی۔ برآمدے میں دو موڑھے' ایک میز اور ایک لوہے کی الماری رکھی تھی۔ موڑھوں کو اٹھا کر افق اپنا چوکی نما تخت بچھا کر فرما' خاکی لفافے بناتی' چھوٹے سے صحن میں چند گملے رکھے تھے۔ بس یہی سب کچھ تھا ان کی کائنات اس گھر میں۔
وہ سب خوش اور مطمئن تھے اپنی زندگی سے۔ دولت کے بارے میں صرف اتنا ہی سوچتے تھے جتنی ان کی ضرورت تھی۔
افق کے والد ایک فیکٹری میں ٹرک ڈرائیور تھے۔ دوسرے شہروں میں مال سپلائی کرتے تھے۔ لوڈنگ کے دوران وزنی مال ان پر آگرا۔ چند دن اسپتال میں رہ کر وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ فیکٹری مالکان نے چند لاکھ دیے۔ جس سے اماں نے یہ بوسیدہ گھر خرید لیا۔
آہستہ آہستہ جب ہر رشتے دار کی اصل شکل سامنے آنے لگی تو وہ زندگی کے سامنے ڈٹ گئیں۔ اپنے بچوں کی طرف دیکھتیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتیں۔
جو سبق انہوں نے خود کو پڑھایا' وہی اپنے بچوں کو ازبر کروا دیا کہ وہ یتیم ہوئے ہیں' لاچار نہیں۔ زندگی کا ڈٹ کا مقابلہ کریں۔ آنسو پونچھ لیں کہ انہیں صاف کرنے والا ہاتھ گیا اور حالات کو ہرا دیں اور انہوں نے واقعی رونا چھوڑ دیا۔ بنیاد میں سیسہ بھرا جائے تو دیوار کی جگہ پہاڑ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ماں ان کی بنیاد تھی۔ انہیں تو پہاڑ بننا ہی تھا۔
آہستہ آہستہ ان کے گھر کی صاف ستھری حالت کو دیکھ کر اکا دکا آنے والے رشتے دار سمجھنے لگے کہ وہ خوش حال ہو رہے ہیں۔ اگر وہ رات کو دو' دو بجے تک پریس میں کام کرنے والے جمال اور اسد کو دیکھ لیتے تو شاید حیران نہ ہوتے۔ پانچویں اور ساتویں جماعت کے بچے بستر پر سونے کے بجائے پریس میں مشینوں پر کھڑے کام کر رہے ہوتے۔ اگر وہ افق کو کئی کئی گھنٹے لفافے بناتے دیکھ لیتے تو اس کے ہاتھ چوم لیتے۔
اماں چھٹی کے دن افق کو گھر کا بھی کام نہ کرنے دیتیں۔ اس دن وہ انہیں پلاؤ یا آلو گوشت کھلاتیں۔ جمال اور اسد کو کھیلنے کے لیے بھیجتیں اور افق کو ساتھ لے کر انارکلی چلی جاتیں۔ اسے آئس کریم کھلا کر لاتیں۔ وقت اور حالات کے ہاتھوں ترتیب دی گئی ان کی زندگی ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس ٹھیک ٹھیک زندگی میں ایک گھنٹی بجی۔
"افق کے پاس آج کوئی کام نہیں تھا کرنے کے لیے۔ نہ فرما' نہ خاکی لفافے' دکان والے نے کہا کہ دس' پندرہ دن کے لیے کام نہیں آئے گا۔" آرڈرز نہیں آرہے۔ وہ اپنی کتابیں کھولے پڑھ رہی تھی۔ اس کی انگریزی زیادہ خراب تھی بار بار گرامر کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے پاس جو فون تھا۔ اس پر کم ہی کسی کی کال آتی تھی۔ کبھی کبھار ماموں کی یا فیصل آباد والے چچا کی۔ زیادہ تر اماں ہی اسکول کے آفس سے فون کرتی تھیں۔
فون اس کے پاس ہی رکھا تھا۔ بجا تو اس نے اٹھایا' کان سے لگایا۔
"میری عرشیہ سے بات کروا دیں؟"
"عرشیہ تو نہیں ہے جی؟" وہ اجنبی مردانہ آواز سن کر گھبرا گئی تھی۔
"فضا ہو گی؟"
"جی وہ بھی نہیں۔" وہ اور گھبرا گئی' اپنے ماموں اور چچا کے علاوہ اس نے کبھی کسی سے بات نہیں کی تھی۔
"عرشیہ بھی نہیں ہے' فضا بھی نہیں ہے تو شانزہ تو ضرور ہی ہو گی۔" ذرا ہنس کر کہا گیا۔
افق نے فون بند بھی نہ کیا' رانگ نمبر بھی نہ کہا۔
"کیسی لڑکی ہو تم' کچھ ہے ہی نہیں تمہارے پاس' اچھا چلو عائزہ بھی نہیں تو حریم' تحریم' زریم کوئی ایک تو ہو گی' دیکھو اب نہ مت کہنا' ٹھیک نہیں ہو گا' میں نے بتا دیا ہے پہلے ہی۔" وہ لی ہنسی۔
"نہیں' کوئی بھی نہیں ہے۔" اس نے ذرا سی بے چارگی اور افسوس سے کہا' جیسے خود سے ہی کوئی گناہ ہو گیا ہو۔
"کوئی نہیں' ہاہاہا۔" ایک طویل قہقہہ لگایا گیا۔ فون کرنے والا جی بھر کر لطف اندوز ہوا۔
"یار! کیا نام ہے تمہارا' کب سے ہو اس دنیا میں' تمہارے اس انداز پر جی چاہتا ہے کہ تمہارے قدموں میں بچھ جاؤں اور اپنی جان دے دوں۔ تم کہاں آگئیں ہم سے بد معاشوں میں۔ جواب دو جلدی سے۔"

"مجھے آپ کو اپنا نام نہیں بتانا۔" اس کے ہنسنے پر اسے غصہ بھی آیا اور عقل بھی کہ کوئی تنگ کر رہا ہے۔ اس نے فون بند کر دیا۔ پھر بجا اور بجتا ہی رہا۔ اس نے نہیں اٹھایا، پھر میسج آنے لگے۔ ہر میسج میں ایک نیا نام تھا۔

"اسماء ہو؟ شایان ہو؟ نمو ہو؟ جویریہ ہو؟ ہادیہ ہو؟ نادیہ ہو؟ سلویٰ ہو؟ حیا ہو؟"

اتنے نام، اتنے میسجز، اس کا ان باکس بھر گیا۔ پھر فون بجنے لگا۔ اماں آئیں تو اس نے فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اگلے کئی دن ایسے ہی کالز اور میسجز آتے رہے۔ افق کا سارا دھیان بٹ گیا۔ فون اٹھاتی نہیں تھی۔ لیکن فون بجتے ہی فون کی طرف دیکھنے لگتی۔ اب نہیں بھی بجتا تھا تب بھی دیکھتی تھی کہ بج کیوں نہیں رہا۔ میسج آتے تو پڑھتی۔ نہ آتے تو پہلے والے پڑھتی۔

چند دنوں میں ہی ایسا ہوا، لیکن ہو گیا۔ بیرونی دنیا سے زیادہ واسطہ نہیں تھا اس کا۔ جتنا بھی واسطہ تھا، اس میں ایسی شرارتی باتیں کرنے والے، خوب صورت آواز والے شامل نہیں تھے۔ اب وہ زریم، تحریم، شایان، سوچے جاتی، سوچے جاتی، مسکرانے لگتی۔ اس کا جی چاہا کہ اماں کو یہ لطیفہ سنائے، پھر سنا نہیں سکی۔

"چھوٹی ہو، بڑی ہو، موٹی ہو، لمبی ہو، پیاری ہو، پری ہو، کون ہو؟"

روزانہ نئے سرے سے اس کا ان باکس بھرنے لگا۔

"گونگی ہو، بول نہیں سکتیں، اپنی مترنم آواز میں گانا تو سناؤ، گالیاں ہی سنا دو یا اپنا کوئی سبق ہی۔ آج کیا کھاؤ گی، کہاں بیٹھی ہو، کیا کر رہی ہو، کچھ بولو، کچھ سنو، کچھ پوچھو، چلو کچھ کریں، چلو آؤ کھیلیں۔"

بچی بات تھی یہ دو، دو حرفی میسجز پڑھتے پڑھتے افق ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اماں نے سبزی بناتے بناتے اسے دیکھا۔ موبائل اس نے کتاب میں رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک پرانا رسالہ رکھا تھا۔

"کیا ہوا افق؟ ایسے کیوں ہنس رہی ہو؟"

"کچھ نہیں جی؟" ہنسی چھپا کر کہا۔

افق کا جی چاہا۔ اپنی کسی سہیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں ایک ایک بات بتائے۔ سہیلی اس کی کوئی تھی نہیں۔ کالج وہ جاتی نہیں تھی۔ بے چاری، خالہ زاد، ماموں زاد کوئی ان کے گھر آتا نہیں تھا۔ ماں بیٹی دنیا میں اکیلے تھے تو تجربات میں بھی اکیلے تھے اور افق کی تجرباتی زندگی کا تو ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ کہاں کا مشاہدہ اور کہاں کی عقل۔

افق دل کھول کر ان میسجز پر ہنستی رہی۔ کئی دن ایسے ہی چلتا رہا۔ ایک دن ایک انجانے نمبر سے فون آیا۔ اس نے اٹھا لیا، لیکن چپ رہی۔

"رکو، رکو۔ تمہیں قسم ہے اپنی آواز کی، جلدی بتاؤ اپنی آواز کی سرجری کہاں سے کروائی ہے؟"

اسی لڑکے کی آواز سن کر وہ پہلے سے زیادہ بوکھلا گئی۔

"جی۔" اتنا ہی کہا۔ اسے کیا پتا کہ آواز کی سرجری بھی ہوتی ہے۔

اور قہقہہ اتنا بلند ہوا کہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ بند نہ کیا، کہا بھی نہ گیا۔

"مجھ سے دوستی کرو گی۔" جھٹ سے پوچھا۔

"جی؟" اس کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلا۔

"جی۔ چلو ڈن ہوا۔ میرا نام امان ہے۔ ابھی پڑھ رہا ہوں۔ پھر جاب کروں گا۔ پھر شادی، صرف دو بچے کروں گا، لڑکے کا نام بازل رکھوں گا۔ لڑکی کا نام [illegible]" افق نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔ اس کی [illegible] بھیگ گئی تھیں۔

میسج آیا "فون بند کر دیا۔ کوئی آیا تھا کیا؟ میں کہہ رہا تھا کہ [illegible] رکھوں گا۔ [illegible] بنے گا، پیسہ کمائے گا، اس پیسے کو میں جمع کرتا [illegible] گا۔ جب بہت زیادہ ہو جائے گا تو ہوائی میں 2 [illegible] گھر لوں گا۔ ایک بازل کے لیے، ایک اپنی گرل فرینڈ کے لیے۔ گرل فرینڈ کو بیوی سے چھپا کر وہاں رکھوں گا، شش۔ مت بتانا کسی کو۔ اوکے۔ کیا۔"

"اف۔ توبہ۔ اللہ جی۔" افق کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

"کیا تم میری بیوی بنو گی؟"

ایک ذرا لمبے وقفے کے بعد یہ میسج آیا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ایک کرنٹ اس کے اندر سے ہو کر گزرا۔ انجان نمبر تھا۔ انجان شخص تھا۔ غلط انداز تھا، غلط ہی زمانہ تھا۔ اتنا وہ جانتی تھی، پھر بھی اس نے رات تک کئی بار اس فقرے کو پڑھا۔

"میری بیوی بنو گی؟"

ہر بار کرنٹ ہی کرنٹ سا لگتا۔ وہ ڈر جاتی۔ کانپ جاتی۔ پھر بھی بار بار پڑھتی۔

ساری رات اس فقرے کے آگے پیچھے بھاگتی رہی۔

اماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ منہ اندھیرے اٹھنے والی بے سدھ پڑی تھی۔ اماں نے اسکول سے چھٹی کر لی۔ اسے تیز بخار تھا۔ دونوں بھائی پریشان صورت لیے اسکول گئے۔ افق بیمار ہو گئی۔

اماں اس کی بیماری سے بہت پریشان ہو جاتیں۔ انہیں شرمندگی ہوتی۔ انہیں لگتا سب ان ہی کی وجہ سے ہے۔ اتنا کام کرتی ہے۔ وہ کتنے سالوں سے کر رہی ہے۔ کالج بھی نہیں جا سکی۔

انہوں نے سوچا۔ اسے ماموں کے یہاں بھیج دیں۔ ان کے بچوں سے دوستی نہیں تو سلام دعا ہی کی۔ ایک دو مہنگے سوٹ لے دوں گی۔ ماحول بدل جائے گا۔ چار دن تو ماموں مہمان بنا ہی لیں گے۔

شام تک اس کا بخار اتر گیا۔ فون کے ساتھ الٹ پلٹ کی رہی۔ اماں نے اس کی تیاری کی۔ کپڑوں کے لیے اسے ساتھ لے جانا چاہا۔ پر وہ نہیں مانی۔ ماموں کے بچے کالج، یونیورسٹی جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سلام دعا رکھتے تھے بس۔ مامی جی اسے کاموں میں لگائے رکھتیں۔ آتے ہوئے سیما باجی، زینو باجی کے استعمال شدہ کپڑوں، جوتوں کی گٹھڑی باندھ کر پکڑا دیتیں۔ اسد وہی بھگتے لے آیا۔

"افق باجی! ٹھیک ہو نا؟" وہ بے چارہ بہت فکر مند ہو جاتا تھا۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔"

"افق باجی! بیمار نہ ہوا کرو۔" وہ اور بے چارہ نظر آنے لگا۔ "مجھے بڑا رونا آتا ہے کسی کو بھی بیمار دیکھ کر۔"

"میں نہیں ہوتی اب بیمار۔" وہ مسکرائی۔

"میرے پاس کچھ اور پیسے بھی ہیں۔ میں چوک سے ملک شیک لا دوں۔" وہ پھر مسکرا دی۔

اماں اسے لے کر سڑک پار پارک چلی گئیں۔ سبزے پر وہ دیر تک ٹہلتی رہیں۔ جنگلے سے سڑک دیکھتی رہیں۔

"میری بیوی بنو گی۔" وہی آواز سبزے پر بچھ گئی۔ درختوں پر لہرا گئی۔ درختوں پر چہچہے پرندے ایک ساتھ خوب آسمان رنگا گیا۔

سبزے پر چاندنی بھی پھیل گئی اور قوس قزح بھی۔ پھول، پودے لہرا لہرا کر جھومنے لگے۔ یہ منظر اس کے اندر کا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔ بخار اتر گیا۔ اماں خوش ہو گئیں۔ پارک سے اسے آئس کریم کھلانے لے گئیں۔ فون کو ہاتھ میں لیے لیے ہی وہ سو گئی۔ پھر کوئی میسج نہیں آیا تھا۔

"میری بیوی، میری بیوی۔" اس نے رات کے نہ جانے کس پہر اور کس اوٹ میں چھپ کر کہا۔

ننھی سی، پیاری سی لڑکی بولی "ہاں" خود سے بھی چھپ کر، ڈر کر، کانپ کر، رات کے اندھیرے میں۔

کئی دنوں بعد فون آیا۔ بجتے بجتے بند ہو گیا۔ لیکن اس کا دل دھڑکتا رہا۔ پھر میسج آنے لگے، وہی الٹے سیدھے۔

"کوئی ہے؟ کوئی چڑیا، کوا، شیر، ہاتھی، چلو گھوڑا ہی سہی۔ گائے، بھینس بھی چلے گی۔"

"خاموشی اتنی حسین ہے تو کلام کتنا غضب ڈھائے گا۔"

اماں نے پوچھا۔ "افق! آٹا گوندھ لیا؟"
"جی شیرے۔" ہڑبڑا گئی۔
"شیرے۔!" اماں حیران پریشان۔

ڈر کے مارے اس نے رات تک فون کو ہاتھ نہ لگایا۔ جب سب سو گئے تو باورچی خانے میں جا کر چپکے سے کتاب کھول کر اس میں فون رکھا اور پڑھنے لگی۔ ایک بار' دو بار' نہ جانے کتنی ہی بار۔ اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی یا دل نہیں بھر رہا تھا' پتا نہیں....

☼ ☼ ☼

اس کے امتحان ہونے والے تھے' تو اماں نے اس کے سارے کام ختم کروا دیے تھے۔ وہ بی اے کے بعد اسے کوئی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر اب اس کا دھیان ہی قائم نہیں رہا تھا۔ ہاشی۔ شیرے۔ لکھا نظر آتا۔ وہ ہنس دیتی۔

فون آتے رہے' میسج بھی آتے رہے۔ وہ خاموشی میں ہی اس سے ہم کلام ہوتی رہی۔ وہ اس کی زندگی کا جز بن گیا۔ سانس کی طرح جو آتے جاتے دکھائی نہیں دیتی' لیکن ہوتی ہے اور بہت ضروری ہوتی ہے۔

چند دنوں سے نہ فون آ رہے تھے' نہ چپ چپی ہو گئی۔
"آخری بار اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ وہ مر جائے گا تو ہی جواب آئے گا۔"

افق کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ کتنا مستقل مزاج ہے اور اب یہ مستقل مزاج چپ ہو گیا تھا۔ مصروف ہو گا' بیمار ہو گا یا بھول گیا ہو گا۔

دو ہفتے گزر گئے' کیسے گزرے افق ہی جانتی تھی۔
"وہ مر ہی گیا ہو گا!" افق کا دل دہل گیا۔
"افق پڑھ لو۔" اماں نے کہا۔ پہلے انہیں کہنا نہیں پڑتا تھا۔

رات تک کوئی میسج نہیں آیا تھا۔
رات سے صبح ہو گئی۔ اماں اسکول چلی گئیں۔ وہ اکیلی رہ گئی۔
"کوئی ہے؟" اس نے پہلی بار وہ لکھا۔

رات گئے تک کوئی جواب نہیں آیا۔
دو دن گزر گئے۔ اتنی ہمت کر کے کیے گئے سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔
"کہاں گئے سب؟" پھر لکھ کر بھیجا۔
جواب پھر بھی نہ آیا' دو دن اور گزر گئے۔
"اب تو وہ مر ہی گیا ہو گا یقینا۔" فون بھی بند ہو گا۔ اس نے کال کے بٹن کو دبایا۔ پہلی ہی بیل پر۔
"یہاں ہیں سب' اور تم۔" سوال کا جواب لیے جواب کے لیے سوال۔
"اور تم۔" افق کا دل پھڑ پھڑانے لگا۔
"ارے بھئی۔ اور تم۔" وہ پوچھ رہا تھا۔
اس نے فون بند نہ کیا' سنتی رہی۔
"ڈر رہی ہو کہ کون لفنگا اور بدمعاش ہے۔ بولتی نہیں ہو' سانس بھی لیتی ہو کہ نہیں؟ کھا جاؤں گا نہیں تمہیں۔ قتل بھی نہیں کروں گا سچ۔ اب بھی تمہارا فون نہ آتا تو مر جاتا' اپنی قسم کھاتا ہوں' مر جاتا۔ بولو کیا کوئی ہے؟"

"ہاں!" اس نے کہا' اسے کہنا ہی پڑا' بیچاری لڑکی کو کہنا ہی پڑا' یقین جانیے کہنا ہی پڑتا' انسانی فطرت' عورت اور مرد کی ازلی جوڑی دار سانس اور کشش۔ کوئی اس کشش سے کہاں جا چھپے۔
"تمہارا نام۔" اس نے اتنے پیارے انداز سے پوچھا۔
"افق۔"

نام بتاتے ہی بات چل نکلی۔
افق کو ایک سہیلی مل گئی۔ وہ کب ملی' وہ اسے بتانے لگی۔

محبت نے عجب ستم ڈھایا اس پر۔ وہ اپنی اماں کی' گھر کی' کام کی چھوٹی چھوٹی سوچوں سے دور نکل گئی۔ اسے اس سے بات کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے کہا۔ اگر وہ اتنی ہی منکسر المزاج رہی تو فرشتہ بن گی۔ وہ ہنس دی۔
"تمہیں میری ہر بات پر ہنسی آتی ہے؟"
"آپ کی ہر بات ہنسانے والی ہوتی ہے۔"

"مجھے جوکر سمجھا ہے؟"
"ہاں سمجھ لیتی ہوں۔" کھی کھی کھی۔
"ایک دن ایسے ہی ہنستے میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔"
"ہائے اللہ!" اس کے سنجیدہ انداز پر وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔
"ہاہاہا!" وہ دل کھول کر ہنسا۔

اپنے تعارف میں اس نے اپنا نام امان بتایا تھا۔ کالج میں وہ اسی نام سے مشہور ہے۔ دراصل چند ماہ شوق شوق میں وہ ہاسٹل رہا تھا۔ ہاسٹل میں اندرون خانے انہوں نے بہت سے کارنامے انجام دیے تھے۔ ان کے گروپ کا نام "ایگل" تھا اور وہ سب ایک دوسرے کو فرضی یا نک نیم سے بلاتے تھے۔ یہ صرف ایک سیف سائیڈ پلان تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جائے اور بات تفتیش تک جا پہنچے تو کوئی ان تک پہنچ ہی نہ سکے۔ چوکیداروں کو بھی ان کے اصل نام معلوم نہیں تھے۔ آئے دن وہ نت نئی شرارتیں کرتے' ہاسٹل میں رہنے کا شوق پورا ہو گیا۔ وہ ہاسٹل چھوڑ آئے۔ نام ساتھ ہی لے آئے۔ امان نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ پچھلے دنوں فون پر لڑکیوں کو تنگ کرتا رہا تھا۔ ایک نمبر پر وہ ملی تو اس کی آواز' انداز پر فدا ہو گیا۔ وہ دوسرے شہر سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ ڈی ایچ اے میں ایک بنگلے میں اپنے چار دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔

وہ بات اس انداز سے کرتا کہ پیارا لگتا۔ اس میں ایک بات تھی کہ وہ سچ بڑے دھڑلے سے بولتا تھا۔ جب اس نے یہ کہا کہ وہ لڑکیوں کو تنگ کر رہا تھا' افق خاموش ہو گئی۔
"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔
"اپنے چھوٹے سے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔ چور' ڈاکو نہیں ہوں میں۔ قدر کرو میری' میں کتنا سچ بولتا ہوں۔ چاہتا تو یہ بات نہ بتاتا' تم سی بھولی لڑکی سے زیادہ تو بھالو عقل والا ہو گا۔ نہ بتاتا تو کیا معلوم کر لیتیں تم یہ؟"

اس نے اتنی بڑی دلیل دی کہ افق قائل ہو گئی۔
"ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا میرا' بور ہو رہا تھا میں' کالج جا نہیں رہا تھا۔ ایک جگہ پڑے پڑے تھک گیا تھا۔ ورنہ کالج میں مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ہر لڑکی میری دوست بننا چاہتی ہے۔"

کالج میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ یہ بات افق کو بری لگی۔ افق نے فون بند کر دیا۔ اسے بے عزتی کا احساس ہوا۔ اس احساس میں بھی اس نے امان کو برا نہ سمجھا۔ صرف اس کی حرکت کو ہی۔
"رونا مت۔" میسج آیا' پھر یہی میسج بار بار آتا رہا۔ وہ مسکراتی رہی۔

"بہت لڑکیوں سے دوستی ہے۔ بہت سوں سے بات کرتا ہوں افق۔ لیکن۔ "میری بیوی بنو گی۔" صرف تمہیں کہا' سمجھیں۔ میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں نے یہ صرف تمہیں ہی کہا۔ دوبارہ ایسے فون بند مت کرنا۔ ورنہ میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

افق نے کہا۔ "سب لڑکیوں سے دوستی چھوڑ دو۔"
اس نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "اچھا جی!"
"ان سے بات نہ کرنا۔"
"ٹھیک ہے۔"
"ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔"
"اچھا یار! ٹھیک ہے' اور کچھ؟"
"بس اتنا ہی۔" وہ فورا" سمجھ کر مان جاتی تھی۔
"تم سے ملنا ہے۔" اب وہ صرف یہی ایک بات کرتا۔
"دیکھتے ہیں۔" وہ ہنسی۔
"تو پھر ملو نا' پھر دیکھتے ہیں۔" التجا بھی' فرمائش بھی۔
"یہ بھی دیکھتے ہیں۔" وہ کھل کر ہنسی۔

☼ ☼ ☼

اس کا رزلٹ آیا۔ وہ فیل تھی دو پرچوں میں۔ امان بہت ہنسا۔ "یہی ہونا تھا۔"

افق کو دلی صدمہ ہوا۔ اماں کی ساری امیدیں خاک ہو گئیں۔ وہ دنوں اداس رہی۔ پھر سوچتیں' اتنا کام کرتی ہے' پھر ایسے میں کہاں کی پڑھائی۔ انہوں نے افق کو

سمجھایا کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کی روٹی بھی کھا سکتے ہیں۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔ کام نہیں تھا۔ آج کل وہ جو کام کر رہی تھی وہ تو بہت آسان تھا۔ ریڈی میڈ کپڑوں پر بٹن لگانے کا کام تھا۔ وہ ہینڈز فری کان میں لگا کر ایک طرف بیٹھی کام کرتی رہتی اور باتیں بھی۔

امان بہت مصروف انسان تھا۔ لیکن وہ ہر روز اس سے بات ضرور کر لیتا تھا۔

امان نے کہا کہ اس نے ٹاپ کیا ہے۔ وہ خوش تو ہوئی۔ لیکن حیران بھی ہوئی۔ امان سے بات کر کے وہ نہال ہو گئی۔ لیکن افق نے فخر ایسے کیا جیسے اس نے خود نے ٹاپ کیا ہو۔ اتنا دکھ تو اسے اپنے فیل ہونے کا نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس کے ٹاپ کرنے کی خوشی ہوئی تھی۔

اب وہ ملنے کی ضد کرنے لگا تھا افق میں حوصلہ نہیں تھا۔ افق سیکریٹریٹ کی طرف نئی فیکٹری میں کام کرنے لگی تھی۔ وہاں قرے اور خاکی لفافوں کی نسبت کام آسان بھی تھا اور پیسے بھی زیادہ تھے۔ اسے صرف چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا۔ ماہوار چھ ہزار۔ تین گھنٹے اور لگانے پر آٹھ ہزار۔ افق آٹھ بجے جاتی تین بجے تک واپس آجاتی۔ جمال اور اسد اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسے چھوڑ کر وہ اپنے اسکول چلے جاتے۔ امان کے بار بار کہنے پر اس نے اسے نیشنل کالج آف آرٹس کے آگے کھڑا ہونے کے لیے کہہ دیا۔ اسے اسی سڑک کے فٹ پاتھ پر سے گزرنا تھا۔

جمال آگے آگے چل رہا تھا اور اسد ذرا سا پیچھے چل رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے قدم افق کے بالکل برابر آ ملتے۔

"افق باجی! تیز چلو۔ آج اتنی آہستہ چل رہی ہو۔"

اس نے دو قدم تیز اٹھائے۔ پھر آہستہ ہو گئی۔ وہ کار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ کے بارے میں افق کو بتایا تھا اور افق نے اسے ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص اور کالی سیاہ چادر کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کار کے بونٹ کی طرف کھڑا تھا۔

پہلے امان نے اسے دیکھا۔ شاہراہ قائداعظم کی پرشور سڑک پر کشمیری حسن سے مجسمے کو سڑک پر چلتے دیکھا۔ حیران رہ گیا۔

افق فٹ پاتھ پر اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی۔ اس نے ایک بار نظر اٹھا کر نیلی شرٹ والے کو دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

امان زندگی میں لڑکی نام کی چیز سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑکیوں کو پسند کر لیتا تھا۔ دوستی بھی، فلرٹ بھی، لیکن متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ افق سے متاثر ہو گیا۔ اس کے حسن سے۔ اس نے رات کو فون کیا تو بولنا ہی بھول گیا۔

"تم اتنی خوب صورت ہو!"

اس نے اس انداز سے کہا جسے افق نہیں سمجھی تھی۔ دنیاوی پیمانوں سے ابھی وہ نہیں گزری تھی۔ خوب صورتی اگر کوئی فائدہ ہے تو وہ اسے فی الحال کوئی فائدہ نہیں دے رہی تھی اور اگر یہ کوئی خوبی ہے تو یہ خوبی ان کے لیے بے کار تھی۔

"مجھے نہیں معلوم میں کیسی ہوں۔" اس نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہو بھی نہیں سکتا۔" امان کا انداز کھو گیا۔

"مجھے معلوم کرنا بھی نہیں۔" اس بار بھی اس نے سچ ہی کہا۔

"اگر تم نے معلوم کرنا چاہا تو غضب ہو گا۔"

وہ حیران ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"ہمارے کالج میں ذرا جو خوب صورت لڑکیاں ہیں نا، وہ کمال کے ناٹک کرتی ہیں، پھر تم سی بھی ایسے ہی ناٹک کرتیں۔"

"ناٹک؟"

"چھوڑو اس بات کو بھی۔"

اس نے چھوڑ دیا۔ اتنی عقل والی نہیں تھی کہ باتوں سے ہزار ہزار مطلب نکال لیتی۔

امان نے کرید کرید کر اس سے بہت سے سوال کیے۔ ابا اور ان کی موت کے بارے میں۔ خاندان کے بارے میں، یہ سوالات اس نے پہلے نہیں پوچھے تھے۔ وہ اپنی باتیں کرتا، اپنی شرارتیں، تھوڑا بہت وہ جانتا تھا، جو کچھ پوچھتا افق سچ سچ بتا دیتی تھی۔

اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد اس نے بہت سنجیدہ گفتگو کی تھی اس کے ساتھ۔ اس کی باتوں سے افق کو اندازہ تھا کہ وہ امیر ہے۔ لیکن اتنا امیر ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے اپنے خاندان کے بارے میں بتانے لگا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ فیکٹری نہ جائے۔ وہ اسے چھ ہزار دے دیا کرے گا۔ اس کی یہ بات افق کو اتنی اچھی لگی کہ وہ خوشی سے نہال ہو گئی مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اس سے پیسے لے لیتی۔ فیکٹری نہ جاتی تو امان کو کیا بہانہ کر کے پیسے دیتی۔ امان سمجھ کر چپ کر گیا۔ افق کا انکار کرنا اسے بھی اچھا لگا۔

آنے والے دنوں میں وہ کئی کئی بار اس کے راستے میں کار روک کر کھڑا ہوتا۔ چادر کا ہلوٹ میں لپٹے وہ قریب سے گزرتی رہتی۔ ایک نظر دیکھتا اور اگلی نظر کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس نے اس سے زیادہ خود ہی اصرار نہیں کیا۔

اب امان چاہتا تھا کہ افق اچھے نمبرز سے امتحان پاس کرے تو وہ اسے کسی اچھے کالج میں داخل کروا دے۔ کم از کم اس کے پاس ایک اچھی ڈگری تو ہو گی۔ امان کے لیے وہ سب اچھی ڈگریاں حاصل کر سکتی تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتی تھی۔ ضدی تو وہ تھی ہی نہیں۔

✡ ✡ ✡

وقت اور زمانے نے کچھ چیزوں، کچھ افکار، کچھ قدروں کو نادر و نایاب بنا دیا ہے۔ اب چور بازاری اتنی ہے کہ شریف النفسی پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔ جھوٹ اتنا ہے کہ سچ کو اٹھا کر طاق میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ دغا بازی، فریب، چالاکی، مکاری، فرعونیت اس حد تک سرایت کر چکی ہے معاشرے میں کہ معصوم اور بھولے بھالے کسی بھولے بھٹکے آدم زاد کو گھر میں تالا بند کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سادگی، معصومیت، نیکی، شرافت، اعلا کرداری، یہ نوادرات کی فہرست میں درج ہو گئے ہیں۔ امیر لوگ لاکھوں، کروڑوں لٹاتے ہیں ان نوادرات کو اپنے گھروں میں سجانے کے لیے۔

سادہ، معصوم، بوکھلائی سی افق کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ہاتھ امان کے تھے۔ بات محض وقت گزاری، تفریح اور دل لگی سے شروع ہوئی۔ اب دل کی طرف جا رہی تھی۔ امان کے دل کی طرف۔

افق کے حسن کا تیر عین نشانے پر لگا۔ اس کی سادگی نے امان کا دل موہ لیا۔ کبھی جو اس نے عورت کے لیے ایک معیار بنایا تھا۔ افق اس معیار پر پوری اتر رہی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا ہے۔ وہ جانتا تھا آخری بھی ہو گا۔ وہ قسم کھا سکتا تھا۔ افق سے سادہ طبیعت لوگ نہ منزل بدلتے ہیں، نہ راستے۔ لوگ اور محبت تو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امان اس کی ہر ہر بات کو بہت پسند کرتا تھا۔

اس نے کبھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتا تھا۔ افق کے لیے یہی محبت تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ افق امان تک جانے میں اور امان افق کے پانے میں۔

✡ ✡ ✡

ایک پورا دن امان کا فون نہیں آیا اور نہ ہی اگلے دن۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن افق پریشان ہو گئی۔ اگر وہ فون نہیں کرتا تھا تو میسج ضرور کرتا تھا۔ تیسرا دن آ گیا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ چھپ چھپ کر فیکٹری میں روتی رہی۔

اتنے سے ہی دنوں میں اسے لگا کہ وہ اسے چھوڑ گیا ہے۔ یہ خوف مسلسل اس کے اندر قائم تھا۔ امان پر مکمل یقین کے باوجود یہ خوف گاہے بگاہے اس میں در آتا۔

چار دن گزر گئے اسے اپنے خوف پر یقین ہونے لگا۔ پانچویں دن امان کی کال آ گئی۔

"آپ کہاں تھے۔" اس نے پہلا سوال یہی کیا۔
"میں جیل میں تھا۔۔۔ دبئی جا رہا ہوں۔۔۔ وہاں سے آگے بھی جا سکتا ہوں۔۔۔ کسی سے کوئی رابطہ نہیں کر سکوں گا۔" جلدی جلدی کہا۔ اتنی ساری باتیں سن کر وہ سمجھ گئی کہ بس اب وہ جا ہی رہا ہے۔
"چھوڑ رہے ہیں مجھے؟" روتے ہوئے پوچھا۔
"میں جیل میں تھا افق۔۔۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا مجھ سے کسی کا۔۔۔ کل باہر آیا ہوں ضمانت پر۔ آج شام کو دبئی جا رہا ہوں۔" وہ چلایا۔۔۔ افق سہم گئی۔
"نہ جاؤ امان!" اس نے سہم کر بھی یہی کہا۔
"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟" وہ جلدی میں تھا۔ فون بند کرنا چاہتا تھا۔
"پاگل ہو جاؤں گی نہ جاؤ۔۔۔ مجھے اکیلے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" افق باقاعدہ رونے لگی۔
"میں جیل میں نہیں سڑ سکتا۔۔۔ تمہیں حالات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔۔۔ حالات بہتر ہوئے تو تم سے رابطہ کر لوں گا۔"
"ایسے نہ جاؤ امان۔۔۔" سب جان کر بھی اس کی ایک ہی ضد۔
"تو پھانسی لگ جاؤں؟" اسے پہلی بار اس پر شدید غصہ آیا۔
"کیوں ہو گی پھانسی؟" وہ ڈر گئی۔
"میں جا رہا ہوں۔" وہ فون بند کرنے لگا۔
"نہ جاؤ۔۔۔" پھر وہی بات وہی انداز۔
تو مر جاؤں۔۔۔؟
"میں مر جاؤں گی۔۔۔" وہ تیز آواز میں رونے لگی اب یہ جا رہا ہے نجانے کب آئے' آئے بھی کہ نہ آئے۔۔۔ "کچھ بھی نہیں ہو گا۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ یہیں رہو۔" روتے روتے بھی اس نے یہی کہا۔
"تمہیں نہیں پتا۔۔۔ کیسے ہو جائے گا سب ٹھیک۔" امان جھنجلا گیا ساتھ ہی ذرا سا لہجہ نرم کیا۔
"میں دعا کروں گی۔۔۔ میں بہت اچھی دعا کرتی ہوں۔ بہت دل لگا کر۔۔۔ اب بھی کروں گی۔"
"دعا۔۔۔!" امان کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو "کیا بک رہی ہو۔"
"جا رہا ہوں میں۔۔۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ افق نے دوبارہ نمبر ملایا تو فون آف تھا۔ وہ خوب ہی روئی۔ اماں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔
"کیا ہوا افق؟" نفی میں صرف سر کو ہلا کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ کتنی دیر باتھ روم میں ہچکیاں ہوا کرتی رہی۔
"وہ جا رہا ہے۔۔۔ وہ جا رہا ہے۔۔۔ وہ جا رہا ہے۔"
اسے صرف یہی یاد تھا۔
باقی معاملات کے بارے میں اس نے نہ سوچا نہ ہی ان پر غور کیا۔ حادثہ کیسے ہوا کب اور کیوں ہوا۔ حالات کیسے اتنے بگڑ گئے کہ اسے بھاگنا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک کہتا ہے امان کہ اس کے پاس عقل ہے ہی نہیں' وہ موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی تھی اپنی ہی بات کیے جا رہی تھی اور ایسے وقت جب امان کو جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا بھلا وہ یہ سوچتا کہ افق کا کیا ہو گا۔
پندرہ دن گزر گئے۔ رو رو کر وہ بیمار ہو گئی' فیکٹری سے اماں نے ایک ماہ کی رخصت لے دی اماں کہتیں اسے چور بخار ہے۔ رات کو آتا ہے دن کو چلا جاتا ہے اسی بخار میں شاید افق مر جاتی لیکن امان کا فون آ گیا۔
"کب مل رہی ہو؟" اس نے چہک کر پوچھا۔
جواب دینے کے بجائے وہ رونے لگی۔
"کب مل رہی ہو؟" سوال پھر کیا۔
"کبھی نہیں۔۔۔" رندھی آواز لیے کہا۔
"واپس جیل چلا جاؤں۔۔۔؟" وہ بہت خوش تھا۔
وہ خاموش رہی۔
بہت چھپ کر بھیس بدل کر امان دبئی جا رہا تھا لیکن ایئرپورٹ پر پکڑا گیا۔۔۔ اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس سے ایک بڑے بزنس مین کے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا' ڈرائیونگ امان کر رہا تھا لیکن رات گئے اپنے دوستوں کے ساتھ ایک پارٹی سے واپس آ رہا تھا' حادثہ سراسر حادثاتی تھا لیکن اسے حادثاتی ماننا نہیں جا رہا۔ انہیں ڈی ایچ اے سے رات

گئے گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا موقف تھا کہ ان سب نے ڈرنک کی ہوئی تھی۔
حادثے میں لڑکے کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ کافی زخمی ہو گیا تھا' امان کے والد اور دوسرے تینوں لڑکوں کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ کیس عدالت تک نہ جائے وہ جرمانہ بھرنے کو تیار تھے لیکن وہ مان نہیں رہے تھے۔ ناچار ان کے ارادے دیکھتے ہوئے ان سب کو ایک ایک کر کے مختلف ملکوں کی طرف بھگانا چاہا۔۔۔ مگر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا۔۔۔ وہ پھر جیل چلے گئے۔
وہ سب مقدمہ بھی لڑ سکتے تھے اور سالوں بعد ہی سہی انہیں سزا سے بھی بچا سکتے تھے لیکن اس سب میں ان کا حال تباہ ہو جاتا' وہ ایک گھنٹہ جیل میں رکنے کے لیے تیار نہیں تھے کہاں سالوں گزارتے۔
"اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہوتا ہے امان! اس نے میری دعا قبول کی۔"
جدید صدی کے جدید بچے کے لیے دعا جیسی چیز بہت پرانی اور فرسودہ سی تھی۔۔۔ جیسے اونٹوں پر سفر کرنا۔۔۔ جیسے ستاروں سے راستہ معلوم کرنا۔۔۔ جیسے طبیب سے علاج کروانا۔
"گھروں میں بیٹھی لڑکیاں اور کر ہی کیا سکتی ہیں سوائے رونے اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے کے۔"
اس نے جیسے کھلا تمسخر اڑایا۔ جس بات پر اسے یقین نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وہ مذاق ہی اڑاتا تھا۔ سب ایسے ہی کرتے ہیں وہ بھی یہی کرتا تھا۔ دعا اس کے لیے محض ایک رسم تھی۔
"ہاں! میں ضرور گھر میں بیٹھی تھی لیکن جس سے مانگا تھا اس پر ہر ممکن اعتقاد رکھ کر مانگا تھا۔"
امان نے اس کے فلسفے کو مانا نہیں لیکن بات اور انداز اسے یاد رہ گیا۔
ایسے ہی چند لمحوں کے لیے اسے خیال آیا کہ اچانک کیسے وہ بزنس مین پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فیصلہ واپس لے لیا اور جیسے جھٹ سے سب بگڑ گیا تھا ویسے ہی سب جھٹ پٹ سنور بھی گیا۔
اس نے پہلی بار خود سے افق کو دعا کے لیے اس وقت کہا' جب اس کے دو عدد پرچے اس کی پسند کے مطابق نہیں ہوئے تھے۔
"میں دعا کروں گی کہ تم پاس ہو جاؤ۔"
روایت زندہ رہی امان ٹاپ کر گیا۔
"میں جانتا تھا۔" اس نے اس انداز میں اطلاع دی جیسے بادشاہ تو میں ہی تھا نا۔۔۔ تاج پوشی بھی میری ہی ہونی تھی۔
افق احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ ایک وہ تھی ہر معاملے میں پیچھے تھی' اس نے ایف اے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور حقیقتاً "اس نے بہت محنت کی تھی۔ اس نے اے گریڈ لیا تھا۔
اس بار بھی اماں کو یقین تھا کہ وہ بہت اچھے نمبر لے گی الٹا وہ فیل ہو گئی' تو یہ جو عورت ہے وہ اس مرد کو اور مرد کی محبت کو اتنا سر پر کیوں سوار کر لیتی ہے کہ فیل ہی ہو جاتی ہے۔ پھر ایسی عورت تھی اور کسی کام کی نہ ہوتی نا۔۔۔ یہ سب سوچنے کا اس عورت کے پاس وقت نہیں ہوتا جو ناکام ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔
افق سب سے انجان ہو گئی۔۔۔ جمل سے اسد سے اپنی اماں سے۔۔۔ ان کے کام کر دیتی۔ ان سے بات کرنے کا وقت رہا نہ ڈھنگ۔۔۔ کم گو پہلے ہی تھی۔ اتنی کم گو بھی نہیں تھی اور باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔۔۔ خون کا تعلق رکھنے والوں کے بڑے خفی حقوق ہوتے ہیں۔ وہ حقوق نہیں جو کتابوں میں لکھ دیے گئے ہیں۔۔۔ کچھ غیر مرئی حقوق بھی ہوتے ہیں جنہیں انسانی رشتے اور تعلق قائم کرتے ہیں۔
جب وہ دونوں اسے فیکٹری تک چھوڑنے جاتے تو اتنی باتیں کرتے اور وہ ہوں ہاں بھی نہیں کرتی۔ چھٹی والے دن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے۔ افق کمرے میں ایک طرف بیٹھی رہتی۔ کتاب کھلی ہوتی۔
اماں سوچتیں فیل ہونے کا صدمہ لے لیا ہے۔ ماموں زاد کالج جاتی ہیں' یونیورسٹی جاتی ہیں یہ ٹیوشن بھی نہیں جا سکتی الٹا فیکٹری جاتی ہے۔۔۔
"تم فیکٹری چھوڑ دو افق!" اماں نے اس کا سر

سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم تھک جاتی ہو اور تمہیں پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ اماں!" اس نے کہہ دیا۔

گھر کے لیے تمہارے ماموں سے تھوڑا قرض لیا تھا مجھے صرف اس کے اترنے کا انتظار ہے..... تمہارے بھائی بڑے ہوتے تو میں کبھی تمہیں اتنا کام نہ کرنے دیتی۔"

"میں جانتی ہوں اماں۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"ایسے نہ کہیں اماں۔۔۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس کے رویے سے اماں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کما کر ان پر بہت بڑا احسان کرتی ہے اور انہیں پال رہی ہے جبکہ وہ سب تو ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے محنت کر رہے تھے۔

"تمہیں ٹیوشن رکھوا دوں۔۔۔ معلوم کروں کسی کوچنگ سینٹر کا۔"

اس بار میں اچھی تیاری کروں گی۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"مجھے تمہاری بہت فکر ہے افق۔۔۔" وہ آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ ان کے بچوں نے کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں ان کے بچے انہیں روتے دیکھ کر خود بھی رو دیں۔

"آج آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں۔"

"افق! نہ جانے کیوں۔۔۔ تمہارے لیے میں اندر ہی اندر ڈرتی رہتی ہوں۔۔۔ کوئی وجہ بھی نہیں..... کچھ ہوا بھی نہیں۔ لیکن بہت وہم آتے ہیں۔"

اس کا جی چاہا کہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر انہیں امان کے بارے میں بتا دے تاکہ اس کی اماں بے فکر ہو جائیں اور وہم کرنا چھوڑ دیں۔

اماں انھیں تو وہ بھی اٹھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگی۔ آج کل وہ ایک وظیفہ کر رہی تھی امان کی کامیابی اور ترقی کے لیے پھر تہجد پہ اٹھ کر ایک اور وظیفہ کرتی۔

امان نے کہا کہ اس کے والد کی فیکٹری میں آگ لگ گئی ہے۔ الٹا بیمہ کمپنی نے ہی مقدمہ کر دیا ہے ان پر۔ وہ بہت بری طرح سے پھنس گئے ہیں۔ بہت برے حالات سے گزر رہے ہیں۔

"امان برے حالات سے گزر رہا ہے۔"

افق کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ رات دن وظائف کرتی رہتی' نہ چاہتے ہوئے بھی نہ ملتے ہوئے بھی امان اسے کہہ دیتا کہ دعا کرنا۔۔۔

کئی بار وہ کہتا کہ اسے اس سے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے بددعا نہ دے دے۔

"کوئی خود کو بددعا دیتا ہے؟" افق پر امن جاتی۔

"ہوٹل جا رہا ہوں دعا کرنا۔ ٹیبل مل جائے خالی ورنہ وہ گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"کب سے کار بک کروائی ہے۔ ابھی تک نہیں آئی۔"

"ایک پریشانی ہے بتا نہیں سکتا۔۔۔ پر بہت پریشان ہوں۔"

"ایک آرٹیکل لکھا ہے اقوام متحدہ کے لیے دعا کرو آؤٹ اسٹینڈنگ رہے۔"

آرٹیکل آؤٹ اسٹینڈنگ ہو جاتا' ہوٹل میں جاتے ہی ٹیبل مل جاتی' کار آ گئی' کتاب مل گئی۔۔۔ مقدمے سے جان چھوٹ گئی' ان کی پریشانی دور ہو گئی۔۔۔ یہ سب اتفاق ہو سکتا ہے لیکن افق نے یقین کر لیا کہ وہ دل سے دعا کرتی ہے اس لیے اس کی دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے۔۔۔

دوسری طرف امان اسے کہتا کہ وہ اس کے لیے لکی سائن ہے' جیسے نجومی کسی خاص پتھر کو پہننے کے لیے کہتے ہیں اور وہ پتھر اچھا رہتا ہے۔۔۔ سب ٹھیک ہونے لگتا ہے۔ امان کے لیے وہ اب وہی پتھر بننے لگی تھی وہ ایسا ہی شخص تھا جو نہیں مانتا تو خدا کو بھی نہیں مانتا اور ماننے پر آتا ہے تو ہر انسان کو خدا مان لیتا۔

وہ انجانی ترکیب کا عجیب انسان تھا' ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ نرالا تھا۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مختلف بلاگز پر اپنی پریشانی لکھ کر ان کا حل مانگ لیتے ہیں۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے گوگل پر بار بار ٹائپ کرتے ہیں لیکن ایک بار

بھی اللہ کے پاس نہیں جاتے۔۔۔ اللہ تعالیٰ۔۔۔ اللہ میاں بہت احترام سے کہتے ہیں مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اتنا احترام کیوں۔۔۔

عجب اور نرالا ہونا برا نہیں ہے ہاں انجان اور لاعلم ہونا بہت ہی برا ہے۔۔۔

☼ ☼ ☼

اچانک بیٹھے بٹھائے افق کو جو خوف گھیر لیتے تھے ان کے زیر اثر ایک دن اس نے خوفزدہ ہو کر امان سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچا۔" جواب میں اس نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

"میں مر جاؤں گی۔۔۔ ایسے سوچنا بھی مت خدا کے لیے۔"

"کوئی نہیں مرتا۔۔۔ خدا کے لیے تو مر بھی جاتے ہیں انسان کے لیے بالکل بھی نہیں۔"

"میں مر کر دکھاؤں گی....."

"میں دیکھوں گا۔۔۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی۔"

"میں بھی مذاق نہیں سمجھ رہا۔"

اور میں مر جاؤں تو کوئی فکر نہیں؟؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔"

"بعد کی۔۔۔ میرے مرنے کے بعد کی؟؟" یہ کہتے ہوئے ہی وہ مرنے والی ہو گئی۔ دوسری طرف لوٹ پوٹ ہوتا قہقہہ بلند ہوا۔

"افق! ایسی باتیں کرو گی تو میں تمہیں اٹھا لاؤں گا اسی وقت۔"

سارا مرنا مارنا اڑنچھو ہو گیا۔ ڈر' خوف دائیں بائیں نکل گیا۔ افق چپ ہو گئی۔

"اب بولو نا۔۔۔ اب بولتی بند۔۔۔ تو میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اہم! پاپا جی کو یہ بھی معلوم ہو گا کب۔۔۔ ہو لیے پاپا جی.....!"

"میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں۔" رونے کی تیاری ہونے لگی۔

"مذاق نہیں ہیں امان کی جان۔۔۔ مختلف ہیں' عجوبہ ہیں' عجیب تر ہیں' پر مذاق نہیں ہیں' مجھے یقین نہیں آتا لیکن جھوٹ بھی نہیں سمجھتا۔"

"پھر ایک بات سن لو امان۔۔۔ اگر افق کو چھوڑنا ہی پڑے تو عزت سے چھوڑنا امان! مجھ سی بے کار لڑکی کی محبت بے کار نہیں ہے۔ اسے اتنا رتبہ تو ملنا چاہیے کہ عزت سے رکھا اور چھوڑا جائے۔"

"تم یہ سب باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"کیوں کہ میں غریب ہوں' یتیم ہوں۔ چھوٹے ایک گھر میں رہتی ہوں۔ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔ کیا ہے میرے پاس۔ سب کچھ تو تمہارے پاس ہے۔"

"اور جس دن تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارے پاس کیا کچھ ہے تو مجھ سے انسان کو تم اپنے قدموں پر گرا لو گی۔"

"ہر بات مذاق۔۔۔" اتنی سنجیدہ بات پر بھی ایسا جواب سن کر چڑ گئی۔

"میں یہ سب نہیں جانتا افق! نہ ہی میں اتنی گہرائی میں جا کر سوچتا ہوں۔ بس ایک بات معلوم ہے کہ تم مجھے پسند ہو اور رہو گی۔ آج بھی زندگی میں ہو کل بھی رہو گی۔ دوبارہ ایسی فضول باتیں نہ کرنا۔"

اور اس نے دوبارہ ایسی فضول باتیں کی ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی وہ ہمیشہ اسے عزت ہی دے گا۔۔۔ شادی کا وعدہ بھی اسی نے کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ نبھا نہ سکا تو وہ ننگ سچ بولنے والا اسے صاف صاف کہہ دے گا۔۔۔ اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اتنا سچا ہے تو وعدے کا پکا بھی ہو گا۔۔۔ امان اسے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔۔۔

امان نے کہا کہ اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرے تو اس نے بھی اچھے نمبروں سے ایف اے پاس کر لیا۔ خبر سنتے ہی اس نے ضد پکڑ لی کہ اب تو اسے اس سے ملنا ہی ہو گا۔ ساری رات کشمکش و پیچ میں گزار کر صبح نماز کے بعد دعا مانگ کر اور امان پر مکمل یقین رکھ کر وہ فیکٹری سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل آئی اور امان کے ساتھ

گاڑی میں آبیٹھی۔ اسے معلوم ہوا کہ دنیا کا ہر کام آسان ہے اس طرح امان کے ساتھ بیٹھنے سے۔۔۔ وہ بیٹھ گئی اور گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو ہی دیکھتی رہی۔ امان نے کئی بار گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ گود میں رکھے ہاتھوں سے نظریں بھی اٹھانے کے لیے تیار نہ تھی اور امان یہی چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہی بیٹھی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

"کیا ہوا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

مشکل سے اس نے صرف نہ میں سر ہلایا۔

"آنا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔؟"

سر ہاں میں ہلا نہ پائی میں۔۔۔ نظر اٹھا کر نہ دی۔

جو لالی گالوں پر آجا رہی تھی وہ شرم بھی تھی اور شرمندگی بھی۔۔۔ خوشی بھی اور پچھتاوا بھی۔۔۔ من چاہا بھی اور زبردستی بھی۔

یہ ملاقات اس نے امان کی ضد پر کی تھی اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زندگی بھر ایسی ملاقات دوبارہ نہ کرے۔۔۔

"تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے افق؟" امان نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ برف کا بت بن گئی۔ ہمت جاتی رہی اور جی چاہا کہ چلا کر کہے "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے جانے دو خدا کے لیے۔"

ہاتھ وہیں رہا۔۔۔ چیخ بھی اندر ہی رہی۔۔۔

اس نے امان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جیسے فاختہ ڈار سے بچھڑ کر سرد بارش میں بھیگ گئی ہو۔۔۔

کشمیری حسن کے اس طرح بیٹھے رہنے پر اور نظر اٹھا کر ایسے دیکھنے پر ہر رنگ و نسل کی عورت کو دیکھ چکے، پرکھ چکے، مل چکے، جانچ چکے، ڈانس فلور کے شہزادے کو اس ادا پر کمال کا پیار آیا۔

جن کے ساتھ وہ دوستی کے نام پر فلرٹ کرتا تھا۔ وہ تو اس کے گلے میں جھول جاتی تھیں یہ تو محبت کی فہرست کی لڑکی تھی۔ شادی کے خانے میں نام درج ــــ

"چلو میں تمہیں واپس چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس بار اس نے تائید میں سر ہلایا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ وہ واپس جانا نہیں چاہتی۔

"میں یہاں رہتا ہوں افق!" امان نے گاڑی روک کر ایک بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا۔۔۔ لایا تو وہ اسے اندر لے جانے کے لیے تھا لیکن مشکل ہی تھا۔

وہ اسے اس کے گھر پر چھوڑ گیا۔۔۔ وہ اس کے لیے چند تحائف لایا تھا اس کے پاس ہونے پر۔۔۔ پہلی بار ملنے پر۔۔۔ اماں سے اس نے بہانہ بنا دیا کہ فیکٹری کی ایک سہیلی اس کے ساتھ انارکلی بازار خریداری کرنے آئی تھی۔ سامان زیادہ تھا تو کچھ شاپرز اسے رکھنے کے لیے دے دیے۔۔۔ اماں نے لمحے کے ہزارویں حصے پر بھی اس کی طرف ایسے نہ دیکھا کہ تم کیا کہہ رہی ہو سچ کہ جھوٹ۔

اس نے سب کچھ اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔۔۔ دیکھا بھی نہیں۔

امان نے کہا کہ وہ اسے کالج میں داخلہ دلا دیتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔۔۔ اگر وہ کالج جائے گی تو فیکٹری کون جائے گا اور پھر گھر کیسے چلے گا۔

"میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتا ہوں۔"

"میں اماں سے اتنے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔"

"میں چاہتا ہوں افق! تمہارے پاس ایک ڈگری تو ہو۔"

"بی اے کے بعد میں یونیورسٹی ضرور جاؤں گی۔"

"اگر نہ گئیں۔۔۔" وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

"میں جاؤں گی۔"

"تم نہیں جاؤ گی۔۔۔" بے انتہا سنجیدگی سے کہا گیا۔

"تم ایسے کیسے۔۔۔" اسے دکھ ہو رہا تھا۔

"دیکھ لینا۔۔۔ تم زندگی میں کبھی کچھ نہیں کر سکتیں۔۔۔ لوگ ناکام ہوتے ہیں یا آخری نمبروں پر آتے ہیں۔۔۔ تم وہاں تک بھی نہیں جا سکتیں۔ تم جیسی لڑکیاں افق گھروں میں ہی رہ سکتی ہیں۔۔۔ اچھا ہے گھر میں ہی

رہو لیکن اگر ضرورت پڑے اور مستقبل بنانا ہو تو تم جیسی لڑکیاں بے کار ہیں۔ ہر سال میرا ایک لڑکی کے ساتھ ہی مقابلہ ہوتا ہے اور میں ہر بار اسے ہرا کر ٹاپ کر جاتا ہوں پر اس لڑکی کی محنت کی داد دیتا ہوں۔۔۔ کمال کی لڑکی ہے، اگر میں اس کی ٹکر پر نہ ہوتا تو اسی کے نام کے ڈنکے بجتے اور اگر تم اس لڑکی کی جگہ ہوتیں ــ فرض کیا صرف۔۔۔ نہیں یہ فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

امان ویسے سچ بولتا تھا۔ وہ یہ جانتی تھی لیکن اس سچ نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ چار سال جو اس نے دن رات محنت کر کے فربا بنایا اور چھ گھنٹے جو وہ فیکٹری میں کھڑے ہو کر کام کرتی ہے۔ ایک دن بھی کسی کو اس کے کام سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ فیکٹری کے چھ گھنٹے اور فربا بنانے کے سولہ گھنٹے اگر وہ کتاب پر لگاتی تو پاکستان بھر کے طلبا کو پیچھے چھوڑ دیتی۔ جو شخص سیکنڈ ہینڈ کتابیں خریدتا ہے اور جن کتابوں میں بہت سے صفحے پھٹے ہوئے ملتے ہیں اور انہی صفحوں سے کوئی سوال آجاتا ہے تو ایسے شخص کے گریڈ کٹتے ہوئے اس کی مشکلات بھی ضرور گننی چاہئیں۔ اگر وہ کالج جائے اور گھر آتے ہی اسے تین وقت کا کھانا ملے تو وہ بھی امان جیسے ہر طالب علم سے ٹکر لے سکتی ہے۔ جو بھی ہو، اسے خود پر شرمندگی ہوئی۔

پہلی بار اس نے اپنی زندگی کو شکوے کی نظر سے دیکھا۔ اس نے غصے میں گلاس زمین پر دے مارا۔ اسے غصہ آیا کہ اس کے پاس وسائل کیوں نہیں ہیں۔۔۔ وہ ہی کیوں غریب ہے۔۔۔ فیکٹری گئی تو سارا کام الٹا پلٹا ہو گیا۔۔۔ کہتے ہیں جس اناج میں "حرام کا ایک دانہ" آجائے وہ سارے اناج کو تباہ کر دیتا ہے۔ پہلے افق نے مزاج بدلے، وہ ہر وقت چڑچڑی رہنے لگی، بات بات پر غصہ کرتی، اماں حیران ہوئیں پھر پریشان رہنے لگیں، ایک دو بار پوچھا پر اس نے ایک لفظ نہ کہا۔۔۔ اماں انجانی سوچوں سے شرمندہ ہوتی رہیں۔

ابھی پچھلے دنوں ماموں کے چھوٹے بیٹے کی منگنی کی خبر آئی تھی۔ کبھی ماضی میں ماموں نے کہا تھا کہ وہ کشمیر کی کلی کو اپنے اس بیٹے کے ساتھ باندھ دیں گے۔ اماں بھی شاید اندر ہی اندر اس کی آس کی کونپل درخت بن گئی۔ اب کلی نے نہیں کہی تھی کیا معلوم پسند کرتی ہو اسے۔ بچپن تک اچھی ہی دوستی تھی دونوں میں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید۔۔۔ کچھ اور بھی ہو۔

"اس نے صرف اماں کی گود میں سر رکھ دیا۔۔۔ میرے لیے دعا کیا کریں اماں۔۔۔! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

اس دوران ایک اور واقعہ ہوا۔ جس فیکٹری میں افق جاتی تھی ان کے پارٹنرز کے درمیان لیبر کی کٹوتی کو لے کر جھگڑا ہوا۔۔۔ کبھی کسی کو فارغ کر دیا جاتا کبھی واپس بلا لیا جاتا۔ جھگڑا بڑھا اور فیکٹری غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دی گئی۔ افق حقیقتاً "بہت پریشان ہو گئی۔ باقی کاموں میں اتنے پیسے نہیں بنتے تھے اور کوئی کام وہ کر نہیں سکتی تھی۔ کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کرتی تو بمشکل ہی دو ڈھائی ہزار ملتے۔ اس نے اماں کو آرام کرنے اور خود ان کی جگہ جانے کے لیے کہا پر وہ نہیں مانیں۔

امان اپنے شہر گیا ہوا تھا، کبھی کبھار ہی اس سے بات ہوتی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس بار پاپا سے افق کی بات کرنے جا رہا ہے۔

"وہ نہیں مانیں گے۔" وہ افسردہ ہو گئی۔

"یہ تو ایسا ہی۔۔۔" اس نے بھی تسلی نہیں دی۔

"پھر؟" اب وہ یہی سوال پوچھ سکتی تھی۔

"وہ مانیں گے نہیں، یہ سچ ہے پھر ظاہر ہے کہ مجھے خود ہی اسٹینڈ لینا ہو گا اکیلے ہی۔"

"اکیلے کیسے۔۔۔"

"پاگل لڑکی! تم اور میں۔۔۔ میرے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں اور میرا مستقبل روشن ہے۔۔۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"وہاں جائیں تو کتنا اچھا ہو۔" ایک طرف افق کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ امان اسے اپنے بل بوتے پر پالے گا

چھوڑے گا نہیں۔اپنے خاندان کو جانتا ہے اسی لیے فیصلہ کرچکا ہے۔دوسری طرف وہ اسی فیصلے سے گھبرا گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے سب کچھ پلان کرلیا ہے۔" وہ ایسے ہی آرام سے 'اطمینان سے انتہائی سنجیدہ باتیں کیا کرتا تھا' جیسے چیونگم چبا رہا ہو یا مووی دیکھ رہا ہو اور اپنے ملازم سے کہہ رہا ہو "ہاں ہاں اورنج جوس ہی۔"

"امان کا مستقبل روشن ہے۔" افق بے فکر ہوگئی خاندان کی مخالفت اپنی جگہ۔امان کی حمایت۔

"پاپا سے 'ماما سے بات کروں گا۔۔۔ ہر طرح سے انہیں راضی کروں گا۔وہ مان جائیں گے۔ میری مان ہی جاتے ہیں۔ تمہیں دیکھیں گے تو اور مان جائیں گے۔"

"مجھ میں ایسا کیا ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر مان جائیں۔" افق کے آگے اس کا چھوٹا سا گھر گھوم گیا۔

"دیکھیں گے تو ان ہی سے پوچھ لینا۔جب وہ اپنی پلکیں بھی نہیں جھپک سکیں گے۔۔۔ بت بن جائیں گے۔" افق مسکرا اٹھی۔

"ایسی بھی بات نہیں ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم انہیں مجھ سے زیادہ اچھی لگو گی۔"



وہ ہر طرح کی تعلیمی سرگرمی سے تین ماہ پہلے ہی فارغ ہوچکا تھا۔یہ عرصہ اس نے پارٹیاں کرنے اور چند دوستوں کی شادیاں اٹینڈ کرنے میں گزارا تھا۔ اس دوران وہ دو بار گھر ہو کر آچکا تھا لیکن افق کو نہیں بتایا تھا یہاں چھپانا مقصد نہیں تھا عادت وجہ تھی۔ایگل گروپ کے سب ہی کارکنوں نے ساریاں بتیاں بجھا کر سگریٹ لائیٹر جلا کر مشترکہ حلف لیا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران کے اس عرصے کو ہر رنگ سے سجادیں گے۔ کوئی ٹینشن نہیں لیں گے۔جو جی میں آئے گا کریں گے جو دوسرے گا اس کا سر پھوڑ دیں گے۔

تو اس ایگل گروپ کے ہر رکن نے ہر وہ کام کیا جو ان کے جی میں آیا۔۔۔ ہاسٹل کے ہی ایک دوسرے گروپ کے ساتھ ان کی گرما گرمی ہوگئی 'انہوں نے ان کے کمروں میں ڈرگ اور شراب چھپادی اور چھاپہ پڑوادیا۔

ان ہی دنوں جب وہ زخمی ہو کر بستر پر تھا اس نے افق کو ڈھونڈ نکالا۔۔۔

جیسے کالے سیاہ آسمان پر پہلی تاریخ کا چاند ساری توجہ کھینچ لیتا ہے۔ایسے ہی افق کی آواز اور انداز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔اس نے "جی" کے نام سے نمبر محفوظ کرلیا۔ مختلف چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان چیزوں میں ایک بدنما یا عجیب ہی سی رکھی ہوئی مل جائے تو چلتے چلتے قدم رک ہی جاتے ہیں۔ذرا سا دیکھ لینے کے لیے کہ یہ ہے کیا۔اسی طرح افق کو ذرا سا دیکھنے کے لیے امان رک گیا۔

کسی لڑکی پر وہ اتنا وقت برباد نہیں کرتا تھا۔ جن لڑکیوں کو اس نے فون کالز کی۔۔۔ اس کی دلکش آواز سنتے ہی دوسری بار انہوں نے خود کال کی مگر اس لڑکی نے فون ہی بند کردیا۔اسے وقتی حیرانی ہوئی۔۔۔ پھر بات انا اور ذاتی ریکارڈز پر آگئی کہ یہ کون لڑکی ہے جو دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں۔۔۔ فون نہیں سنتی۔۔۔ میسج کا جواب نہیں دیتی۔۔۔۔ یہ کیا یہ لڑکی۔۔۔ اتنا تو وہ اس کے انداز سے سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بے چاری سے کے لیے "امان" پہلا تجربہ ہے۔امان کا یہ ذاتی ریکارڈ افق جیسی لڑکی توڑ رہی تھی۔ بات وقت گزاری سے آواز کی پسندیدگی تک آئی۔۔۔ ریکارڈ سے دل تک جانے لگی۔

دل لگی سے بات ذرا سنجیدہ ہوگئی۔امان نے سوچا کہ بے چاری حد سے زیادہ شریف ہے۔اور غلط کو غلط ہی سمجھ رہی ہے 'وہ غلط کو غلط سمجھنے والی اسے ٹھیک لگی۔اتنی لمبی فہرست میں کوئی ٹھیک بھی ہونا چاہیے۔ وہ بے چین تو نہیں ہوا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جب اس

نے سوچا کہ بھاڑ میں جائے تو سوچنے کے کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سے اسے میسج لکھ رہا تھا اور انتظار بھی کر رہا تھا اسے لگا کہ اس کی ایک رگ اس خاموش لڑکی کے ساتھ پھڑک رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈرامہ کیا اور اس کا جواب آ گیا۔ اسے اچھا لگا۔ خوشی ہوئی۔

اسے افق پسند آ گئی۔ اس نے افق کو باقی لڑکیوں سے الگ ہی رکھا۔ اس سے اپنی ذاتی باتیں شیئر کرلیتا جو وہ کسی اور سے نہیں کرتا تھا اسے کبھی باہر ملنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ اسے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر ڈسکس نہیں کرتا تھا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک آنکھ دبا کر اس کا کوئی دوست "کیسی ہے وہ" کہہ کر افق کے بارے میں پوچھے۔

زمانہ جدید کے لوگوں میں زمانہ قدیم کی افق پر اس کا دل آ گیا۔ وہ اسے بے حد پسند تھی۔

وہ اس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ پہلی بار صرف اسی سے کوئی وعدہ کیا تھا وہ جانتا تھا۔ افق کے معاملے میں وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا۔

اس کے جیل جانے پر بہت سی لڑکیوں نے فون کر کے اپنی پریشانی ظاہر کی' اپنی مدد پیش کی لیکن جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد جو آواز اس نے افق کی سنی اس نے اسے حیران کر دیا۔ اسے اس پر پیار آیا وہ اسے اور اچھی لگنے لگی۔

پاپا خود ہی لاہور ڈی ایچ اے آ گئے۔ اپنے دوست کی آمد کے بارے میں بتانے لگے وہ سنتا رہا۔

"تمہارا دھیان کہیں اور ہے؟" انہوں نے برا مانا۔

وہ سنبھل کر بیٹھا۔ "کب آ رہے ہیں انکل؟"

"وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔ اس بار خاندان کے ساتھ آ رہا ہے بہت سے لوگ اس کے انتظار میں ہیں اس بار۔"

"ضرور ہوں گے۔" وہ ابھی بھی متوجہ نہیں تھا۔

"تم مجھ سے اپنی بات کرلو۔ یا میری سن لو یا مجھے وقت دے دو لکھ کر کہ اس وقت بات کریں۔" آواز سختی اور غصے سے تن گئی۔

"مجھے کرنے دیں بات۔" وہ جان چکا تھا کہ اس دوست کے بارے میں کیوں بتایا جا رہا ہے۔

"ایک لڑکی ہے..." بمشکل ہی سے مناسب بات شروع کر سکا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ "آگے...؟"

اس سوال "آگے" نے اس کی جرأت کو پیچھے ہی کر دیا کیونکہ آگے پیچھے اور کچھ بتانے کے لیے تھا ہی نہیں۔

"افق... وہ مجھے پسند ہے اور بس۔" کیونکہ یہ سب انہیں جاننا نہیں تھا۔ انہیں جو جاننا تھا وہ وہ بتا کر شرمندہ ہی ہوگا۔

"وہ میرے کالج سے نہیں ہے..."

"اس شہر سے تو ہے نا..." ان کے انداز میں گہری ناز تھی۔

"آپ چلیں گے میرے ساتھ۔" اور تفصیل دو اور کیا بتاتا۔

"ضرور چلوں گا لیکن تم جانتے ہو کہ جانے میں پہل میں نہیں کرتا... تم انہیں یہاں بلوا لو۔"

"وہ ایسے نہیں آ سکتے..." بات پھر وہیں آ گئی تھی۔

"پھر کیسے آ سکتے ہیں وہ...؟"

اسے لگا کہ اس کا باپ ایک اچھا وکیل مناظر ہے وکیل استغاثہ بھی اور جج بھی اعتراضات بھی وہ اٹھائیں گے اور فیصلہ تو کرنا ہی انہیں ہے۔

وہ جھنجلا گیا وہ جان گیا کہ پاپا کیا سمجھ رہے ہیں انہیں لگ رہا ہو گا کہ وہ آگے پیچھے چلتی قیمتی کاروں میں ان کے فارم ہاؤس پر آئیں گے۔ جہیز ساتھ ہو گا اور اسی دوران سب معلوم ہو جائے گا کہ کون کس کے ہم پلہ ہے۔

"تمہاری کلاس کے نہیں ہیں وہ۔"

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ پھر وہ ایسے ہنسے جیسے پہلے سے ہی جانتے تھے۔

ان کی شکل پر آنے والے تاثرات دیکھنے لائق تھے۔ وہ کبھی کو الٹی انگلی سے نکالتے تھے نہ ہی سیدھی

ہے۔ وہ چیونٹے میں سوراخ کر دیتے تھے۔ تپش کے ذرا پاس رکھ دیتے تو وہ پگھلا کر نچوڑ لیتے تھے۔

"تمہیں یاد ہو گا کہ تم ایک مسئلے میں کس بری طرح سے پھنس گئے تھے... وہی کار ایکسیڈنٹ والا مسئلہ۔"

"یاد ہے۔" حیران ہوا۔

"جانتے ہی ہو گے کہ میں نے کیسے تمہیں اس مسئلے سے نکالا۔ کس کس سے رابطے کیے میں نے... یہ سب تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے کیا۔ وہ اپنے والدین کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر تم کسی مسئلے میں پھنس جاؤ... تم سے کوئی قتل ہو جائے' تم جیل چلے جاؤ یا تمہیں لوگ ادھر لے جائیں... کسی دشمن کی پکڑ میں آ جاؤ تو کسی گورنر' کرنل' جنرل' منسٹر کو فون کروا سکتے ہیں... چلو کسی چھوٹے سے ایس پی کو ایم پی اے کو... اگر تم دیوالیہ ہو جاؤ تو کسی بینک سے تمہیں چند کروڑ کا لون دلوا سکتے ہیں؟"

اس کے باپ نے تین فیکٹریاں رات سوتے میں سپنے دیکھتے دیکھتے ہی نہیں لگا لی تھیں۔ وہ تو فیکٹری میں کام کرنے والے چوکیداروں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

اس کا چہرہ اتر گیا لیکن اس نے اپنے باپ کی ہر بات کو درست مانا۔

"مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔" محبت کا لفظ اس نے استعمال نہیں کیا اور اسی کا سہارا لیا جس سہارے سے اسے ہر چیز مل جایا کرتی ہے۔

"تمہیں کیا اچھا نہیں لگتا سن... چند سال پہلے تم ایک ہالی ووڈ کی ماڈل کے بارے میں بہت باتیں کرتے رہے ہو اور تم یہ دعوا بھی کرتے رہے ہو کہ تم اسے ضرور حاصل کرو گے تم نے اپنے کمرے کی دیواروں کو اس کی تصویروں سے بھر دیا تھا۔"

"وہ بچپنا تھا۔" اسے وہ ماڈل یاد آ گئی۔

"تو یہ سب کیا ہے...؟"

"میں سنجیدہ ہوں۔" اس نے پہلو بدلا۔

"جیسے تم خلائی سفر پر جانے کے لیے سنجیدہ تھے۔"

"وہ مشکل تھا۔" اپنے پاپا کی یادداشت پر وہ عش عش کر اٹھا۔

"یہ بھی مشکل ہے سن... بہت مشکل بلکہ ناممکن..."

"مجھے افق سے ہی شادی کرنی ہے پاپا... آپ مان جائیں گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" ہمت آرام سے درخواست کی۔

"فیصلہ کر چکے ہو؟" آرام سے ہی پوچھا گیا۔

وہ خاموش ہی رہا۔

"ٹھیک ہے کرلو... تعلیم تو مکمل کر ہی چکے ہو۔ شادی بھی کرلو۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ پھر میرا تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا۔"

"پاپا پلیز..."

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔

"آ کر ان سے مل لو۔"

"میں ان سے مل چکا ہوں کئی بار..." آغا کا تذکرہ اسے برا لگا۔

"پھر ماریہ؟"

"ماریہ مجھے پسند نہیں ہے۔" اس کے اعصاب تن گئے۔

"تم اسے ایک بار پرپوز کر چکے ہو... واپسی پر تم کافی ڈسٹرب رہے تھے اس کے انکار پر..." وہی مکمل کی یادداشت۔

"افق اس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔"

"صرف خوب صورتی پر ہی فدا ہو گئے ہو... تو پھر ڈبل ڈبل کر دو نا... ڈبل فائدہ لو... ماریہ خوب صورت بھی ہے' آغا کی بیٹی بھی۔" دے تلی والا انداز تھا۔

"پاپا!" اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔

"سن..." انہوں نے آنکھوں کو گہرا زاویہ دیا اور آواز میں تنفر اور تنبیہہ بھری۔ "اگر میں تمہیں کسی جھوٹے مقدمے میں جیل کروا دوں تو تم یا کوئی کیا کرے گا... باہر آ جاؤ گے... شادی کرلو گے پھر اس لڑکی سے... تو سن... اپنی پشت پر ایک ہاتھ ایسا ضرور رکھو' جو وقت پڑنے پر جھکی بھی دے اور ہاتھ بڑھا کر گڑھے سے بھی نکال لے... یہ ہاتھ تمہیں خود بنانا

ہے۔"

اپنے باپ کے دلائل کے سامنے وہ ابھی بچہ تھا۔

"تمہارے جیسے لڑکوں کی پسند' محبت' عشق سے میں خوب واقف ہوں' چند دن پہاڑوں پر چڑھتے ہیں پھر سمندروں سے عشق کرنے لگتے ہیں پھر غاروں میں جا چھپتے ہیں' چند دن جنگل جنگل۔۔۔ پھر شہر شہر' گاؤں گاؤں' تم ایک جنس ہو اور کئی دوسری جنسوں میں حلول کرتے ہو' جڑتے ہو ٹوٹتے ہو اور پھر واپس خود میں آجاتے ہو۔۔۔ تو میں تمہارا باپ ہوں۔ خود میں جھانک کر دیکھو۔ تم چاہتے کیا ہو۔۔۔ کیا صرف وہ لڑکی' ہر چیز' ہر رتبے سے بالاتر صرف وہ لڑکی۔۔۔؟ وہ لڑکی تمہیں پسند ہے ہمیشہ رہے گی یہ جانتے بھی ہو کہ نہیں۔۔۔" کندھے پر تھپکی دے کر وہ چلے گئے۔

زبردستی کے وہ قائل نہیں تھے ہاں ترکیب عمل کے بہت بڑے مداح تھے۔ اگلے ہی ہفتے اسے ساتھ لے کر امریکا آگئے کہ انہیں شرمندہ کروائے اور آغا سے صرف مل لے پھر بے شک انکار کردے۔

آغا ان کے دوست تھے لیکن دولت نے ان میں چار پانچ پر زیادہ ہی لگا دیے تھے اسی لیے ان کی پرواز سب میں اونچی تھی' دوستی میں چھپے ہوئے گہرے عناد اور بغض کو غلام علی ہی بھانپتے تھے' کسی اور طرح تو آغا کی دولت ہاتھ آتی نظر نہیں آرہی تھی انہوں نے بہت بار کوشش کی کہ وہ ان کے پارٹنر بن جائیں' کئی بار امریکا بڑے بڑے منصوبے لے کر گئے لیکن وہ سگار پیتے سنتے رہتے۔ سب سن کر آخر میں سر ہلا کر دیتے۔

"ضرور کرے۔۔۔ ضرور کرے۔۔۔ بیسٹ آف لک۔"

ان کی اتنی بار کی بیسٹ آف لک کے باوجود غلام علی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔۔۔ کھوٹے سکے اور کھوٹے بیٹے کی طرح انہیں یقین تھا کہ یہ آغا بھی ضرور کام آئے گا۔ غلام علی کو یقین سا تھا کہ وہ رشتے داری پر آہی جائے گا۔

ہوٹل سے یہ لوگ پہلے ان ہی کے پاس گئے۔ ماریہ نے شاید شوق شوق میں پاکستانی لباس پہنا تھا۔ سفید شیفون کی قمیص اور سفید ہی چوڑی دار پاجامہ۔۔۔ دوپٹا ہلکا گولڈن تھا اور ستاروں جیسا جھلملا رہا تھا۔

عدن نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے تین انگلیوں سے اس کے ہاتھ کو چھو کر ہائے کا جواب دیا۔ دوپٹا جو اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ وہ کبھی کندھے سے ڈھلکتا کبھی گردن سے۔ وہ اٹھا کر کے گردن میں جھن پڑتی پھر بھی ذرا سا ہلتی تو وہ ڈھلک کر گرنے کو آجاتا۔ تو وہ اسی مشغلے میں مشغول تھی۔

عدن ٹھیک آٹھ سال بعد اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ گویا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ لوگ بدل جاتے ہیں لیکن کیا وہ وقت کے ساتھ ساتھ اور سے اور خوب صورت ہوتے جاتے ہیں۔ ایک بار خوب صورت پیدا ہونے والے پھر بس کیوں نہیں کرتے۔ مصری حسیناؤں کی فرعونیت سی ادا لیے وہ لاتعلق سی ایک طرف بیٹھی تھی۔

عدن کی بہن شمائل نے اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی مگر وہ چند ایک بار ہونٹ کھول کر بند کیے بیٹھی رہی' یہی کام عدن نے کیا تھا اور اس کا جواب بھی یہی ملا تھا۔

ڈنر کے لیے انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ اس کے پاپا اور ماریہ کے ڈیڈ پہلے سے ہی وہاں موجود تھے' عدن کی ماما' ماریہ کی ماما سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ڈنر کے لیے وہ باہر جانے لگیں تو ماریہ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی' اٹھی تو دوپٹا پھر پھسل کر اڑا اور قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ عدن ذرا سا جھکا اور دوپٹے کو پکڑا وہ خود جھک کر اٹھانے والی نہیں تھی' وہ بنا دوپٹے کے ہی نکل جانے کے ارادے سے تھی۔ اتنے نخرے نے کبھی انسانوں کے نہیں اٹھائے تھے' کہاں ایک کپڑے کے اٹھاتی۔

شیفون کے جھلمل کرتے دوپٹے کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدن نے ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر جمایا۔۔۔ اور دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"آسمان سے اتر کر سیدھی یہیں آرہی ہو؟"

اس نے جیسے سنا ہی نہیں قدم بڑھائی آگے چلنے لگی۔۔۔ عدن بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔۔۔ چند قدم

آگے چل کر اسے خود سے دو قدم پیچھے محسوس کر کے اس نے گردن موڑی۔

"ابھی تک ویسے ہی ہو۔"

عدن نے اپنا جاندار قہقہہ اس کی پشت پر چھوڑا۔ جب وہ انیس سال کا تھا تو تیسری بار امریکا ان کے پاس گیا تھا۔ پہلی بار وہ صرف چھ سال کا تھا دوسری بار صرف نو سال کا اور تیسری بار میں نئے سے نئے جوش اور نت نئے خیالات سے بھرا انیس سالہ عدن تھا۔ پاپا تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ صرف تین بار ہی گیا۔

پاپا نے اس سے بار بار کہا تھا کہ وہ ماریہ سے دوستی کر لے۔۔۔ اس کے ساتھ گھومے پھرے۔۔۔ اس کے دوستوں سے ملے۔۔۔۔ لیکن ماریہ کا ذکر اتنی بار سننے کے باوجود وہ اس بات کے لیے بالکل بھی راضی نہیں تھا وہ اپنی مرضی سے بولتا تھا' دوست بناتا تھا اور لڑکی نام کی چیز کو اس نے اب تک صرف زچ ہی کیا تھا۔ ماریہ کے ساتھ بھی وہ یہی سب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس نے گھٹنوں تک اسکرٹ' لانگ شوز اور لمبے بالوں کی پونی ٹیل میں ایک حور اسپورٹس کار میں بیٹھتے دیکھ لی اور کھڑے کھڑے ہی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف اسی سے شادی کرے گا بلکہ ساتھ ہی لے کر جائے گا۔

دو دن سے لوگ ان کے یہاں تھے لیکن ماریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی مام نے بتایا تھا کہ وہ کسی ایجنسی کے ساتھ پیرس ماڈلنگ کے لیے گئی ہے۔ ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے لیے جانے کے بجائے وہ سارا دن ماریہ کا گھر میں ہی انتظار کرتا رہا۔ لنچ ہو گیا' ڈنر ہو گیا' رات گہری ہو گئی لیکن وہ نہیں آئی' انتظار کرتے کرتے وہ کھڑکی کے پاس ہی کرسی پر اونگھنے لگا

کار کے ٹائر چرچرانے کی آواز پر وہ جاگا جب تک گردن نکال کر دیکھا۔ اس کی پشت ہی نظر آئی' چڑ کر عدن بیڈ پر جا سویا' شادی کا ارادہ کر کے وہ اسے اپنی بیوی ہی سمجھ بیٹھا تھا اور ان کی بیوی اتنی دیر سے گھر آئی تھی' رات دیر تک جاگنے کے باوجود وہ صبح جلدی اٹھا کہ وہ پھر نہ چلی جائے' لیکن وہ دیر تک سوئی رہی۔ لنچ ٹائم پر ناشتا کیا۔

"ہائے۔" وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ نامناسب سا لباس پہنا تھا' شیشے کی میز پر ٹانگیں رکھی تھیں اور ان ہی ٹانگوں کی سیدھ میں کاؤچ پر وہ آکر بیٹھا تھا۔

"او ہائے!" اس نے ہاتھ آگے کیا۔ "کیسے ہو۔۔۔ کب آئے۔۔۔؟"

"ایک ہفتے سے یہاں ہوں۔" اس نے جیسے شکوہ کیا۔

"گڈ۔۔۔ دیکھ لیا امریکا؟" ہر پاکستانی کو امریکا میں ایسے سوالات سے ہی کیوں نوازا جاتا ہے۔

"میں امریکا دیکھنے نہیں آیا۔"

"تو۔۔۔؟" براؤن بریڈ کا پیس اس نے ادا سے کترا۔

"اکیلے کیسے دیکھ لوں۔۔۔" اسے نئی ترکیب سوجھی۔

"تمہارے مام ڈیڈ بھی تو آئے ہیں۔" فریش جوس کا گھونٹ لیا۔

"اگر تم پاکستان آؤ تو میں تمہیں خود سارا پاکستان گھماؤں۔"

وہ ہنسی۔ جوس کا ایک گھونٹ لیا "پاکستان گھومنا کون چاہتا ہے۔"

پاکستان سے تو عدن کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔۔۔ بے عزتی اسے اپنی آفر کے ایسے مذاق اڑائے جانے پر ہوئی۔

گلاس میز پر رکھ کر وہ اٹھ کر چلی گئی' عدن منہ دیکھتا رہ گیا۔۔۔

اگلے تین دن وہ اس کا منہ دیکھنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ رات گئے آتی۔ صبح سویرے ہی چلی جاتی۔ بہانے سے اس نے پوچھا تو مام نے بتایا کہ آج کل ریہرسلز چل رہی ہیں۔ بہانے کر کے وہ اسٹوڈیو ہی آگیا۔ کسی کمرشل کے لیے ریہرسل کی جا رہی تھی' سو کے قریب لوگ تھے' عدن نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔۔۔ اسے دیکھ کر وہ صرف مسکرائی اور اپنا کام کرتی رہی۔۔۔ ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عدن لنچ ٹائم کا انتظار کرنے لگا۔۔۔ لنچ ٹائم آیا۔۔۔

نیل ہوئی اور وہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک طرف چلی گئی۔ وہ ایک طرف کرسی پر ہی بیٹھا رہ گیا۔ دوبارہ جب وہ نظر آئی تو لنچ بریک ختم ہو چکا تھا۔۔۔ درمیان میں اس نے ایک بار اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور وہ لوٹ کر باہر آگیا۔ اگلے دن اس سے ملاقات ہوئی تھی تو جیسے اسے یاد ہی نہیں تھا کہ وہ اسٹوڈیو آیا تھا۔

"لنچ کے لیے چلیں ماریہ۔" اس سے پہلے کہ وہ پھر نکل جائے اس نے اسے دیکھتے ہی آفر کی۔

اس نے صرف ہونٹ سکیڑے یعنی نہیں۔

"ڈنر کے لیے؟" اس بار اس نے سر بھی نفی میں ہلا دیا۔

"کیوں؟" غصہ دبا کر وہ بولا۔ عدن کو انکار کیا جا رہا تھا۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں شوٹنگ پر جا رہی ہوں۔۔۔ تم چاہو تو ساتھ آجاؤ۔"

وہ جانتا تھا ساتھ لے جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔

"اپنے مہمان کے ساتھ تمہیں ایک وقت کا کھانا تو کھانا ہی چاہیے۔"

"تم میرے مہمان نہیں ہو۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ساریہ کے ہاتھوں پہلا تھپڑ عدن کے گال پر آلگا۔

"تمہارا مہمان نہیں ہوں دوست تو بن سکتا ہوں نا؟" تھپڑ کھا کر بھی عدن نے ہمت نہیں ہاری

اس نے رد عمل میں ایک ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ چونکہ وہ اسے شادی کر کے اپنے ساتھ لے جانے کا پکا ارادہ کر ہی چکا تھا سو اسے انگریزی القابات سے نہیں نوازسکا' خاموشی سے اس کی ادا کو پی گیا' یعنی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کس قدر خوب صورت ہے' اسی لیے ایسی ادائیں سیکھ لی ہیں۔

چند دنوں بعد وہ اسے لان میں بیٹھی مل گئی۔

"کیسا رہا شوٹ؟" اس کے پسندیدہ موضوع سے بات شروع کی۔

"ونڈر فل!"

"فارغ ہو؟" وہ اپنی بات کی طرف آنے لگا۔

اس نے کچھ دیر سوچا "تقریباً۔"

"باہر چلیں۔۔۔" اس کا جی چاہا کہ اجازت چھوڑے اسے اٹھا کر گاڑی میں بٹھائے اور نکل جائے۔

"ٹھیک ہے چلو۔۔۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں نے ایک ساتھ سینما میں مووی دیکھی اور کافی پینے کے لیے ایک اوپن ریسٹورنٹ میں آگئے۔

"تم ایسے ہی سب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہو؟" بے حد رومانٹک ماحول میں سنجیدگی سے کی گئی یہ بات عدن کو اچھی نہیں لگی لیکن وہ اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"سب کو نہیں' صرف تمہیں۔" عدن نے بہت پیار سے کہا۔

اس نے ساری سی لمبی گردن کو ادا سے لٹکا سے خم دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک کر دائیں ہاتھ کو دائیں گال پر رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ الفاظ سے ہی ظاہر کرنا نہیں جانتی تھی۔

"میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔۔۔؟" وہ اصل بات کی طرف آنے لگا۔

"جیسے تم ہو۔۔۔" کافی پیتے جواب دیا۔

"کیسا ہوں میں۔۔۔؟" اس کا دل لڑکیوں کی طرح دھڑک رہا تھا۔

"وہم کہاں ہے تمہاری۔۔۔؟" سر کو ذرا سا جھکا کر پیچھے اس کی طرف دیکھنے کی اداکاری کی' نئے نئے محبت کے غبارے سے بھرے عدن کے ایک اور چانٹا آکر لگا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" یہ سوال اس نے اس لیے کیا کہ شاید وہ مطلب نہ ہو جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے کندھے اچکائے اور کافی کا مگ اٹھا کر منہ سے لگا لیا جیسے سنائی نہیں' اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔

اتنے دنوں سے عدن بہت جوڑ توڑ کر چکا تھا۔ اگر وہ بے حد خوب صورت تھی تو وہ بھی کم نہیں تھا۔ اگر

مس یونیورس تھی تو وہ مسٹر پاکستان تو ضرور ہی تھا۔۔۔ ایک پوائنٹ یہ ہوا۔۔۔ دونوں کے والد آپس میں دوست ہیں' دوسرا پوائنٹ۔۔۔ دونوں اس رشتے پر خوش ہوں گے تیسرا پوائنٹ اور سب سے اہم پوائنٹ کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرے گا امریکیوں کی طرح نہیں کہ چند دنوں میں چھوڑ جائے امریکا ایسے دھوکے باز معاشرے میں عدن جیسے ہیرے کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔۔۔ یہ پوائنٹ زبردست تھا۔۔۔ بیٹھے بٹھائے اس نے اپنے اندر بے تحاشا خوبیاں کھوج لیں۔۔۔ اور اسے اپنی ذات اعلا و ارفع نظر آنے لگی دنیا کا ہر شخص ماریہ کے لیے بے کار اور ناکارہ نظر آنے لگا اور ماریہ اسے اپنی محبت کا دم بھرتی نظر آئی۔

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" اس نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

کافی کا مگ اس نے سامنے میز پر رکھا اور دونوں ہاتھ پیٹ کی طرف باندھ لیے۔ "رئیلی؟" اس کی ہمت بلند ہی اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اتنی اچھی کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔" اپنی طرف سے اس نے دھماکا کیا۔

"گڈ!" وہ اسی انداز سے بیٹھی رہی۔

"تم سے محبت کرتا ہوں ڈیئر۔" دوبارہ اس لیے کہا کہ اسے اچھی طرح بتا دے کہ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ ایشیا کے مرد کی محبت بہت بڑی چیز ہے۔

"مجھ سے تو ہر دوسرا لڑکا محبت کرتا ہے۔"

"مجھ میں اور ان میں فرق ہے۔" اب وہ دلائل پر اتر آیا۔

"کیا فرق ہے؟" اب وہ دلائل لینا چاہتی تھی۔

"میں سچی محبت کرتا ہوں۔" اسے صرف یہی بات سمجھ میں آئی کہنے کے لیے۔

"سچی محبت کسے کہتے ہیں؟"

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اسے یہی جواب مناسب لگا۔

"میں تم سے شادی کیوں کروں؟"

"کیونکہ میں تمہارے لیے پرفیکٹ ہوں۔" گردن کو اٹھا کر فخر سے کہا۔

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگ گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

(باقی آئندہ ماہ)

۲

دوسری قسط

سمیرا حمید

محبت من محرم

"آج رات میرے ساتھ چلو گے میرے فرینڈز نے ایک پارٹی دی ہے۔" سارس سی لمبی گردن تن گئی۔ اتنی سی بات پر وہ یہ سمجھا کہ وہ اسے اب سب سے ملوانا چاہتی ہے۔

"کیوں نہیں۔" اس نے بہت جوش سے ہامی بھری۔

جس وقت وہ اس کے ساتھ پارٹی میں گیا اس کی آن بان شان کی ہوا نکل گئی۔ پارٹی اور وہاں موجود لوگ اتنے ہائی فائی اور ہائی فیشن ایبل تھے کہ ان سب میں وہ ٹاٹ کا پیوند ہی لگ رہا تھا۔ اس نے بھی برانڈڈ چیزیں ہی پہنی ہوئی تھیں۔ جینز۔ سوٹ ہینڈ بینڈز....

جیل لگے کانوں سے اوپر کی طرف کھڑے بال چمکتا دمکتا منہ ہونٹوں پر بلائنڈ پنک لپ اسٹک یہاں آنے سے پہلے گھنٹہ تو اس نے باتھ روم میں ہی گزارا تھا اگلا ایک گھنٹہ ڈریسنگ روم میں۔ پھر۔ پھر یہ سب کیا ہو گیا؟

وہ سب وہاں بالی وڈ کی فلموں کے ہیرو ہیروئن لگ رہے تھے۔ خود کو مسٹر پاکستان سمجھنے والا صرف "مسٹر" بھی نہیں لگ رہا تھا۔

جس پہلے لڑکے سے ماریہ نے اسے ملوایا اس نے پیلے رنگ کی اسکن ٹائٹ پینٹ پہن رکھی تھی۔ سفید ململ کی طرز کے کپڑے کی شرٹ جو پیچھے گھٹنوں سے اوپر تھی اور آگے سے پیٹ تک۔ اور جب وہ حرکت کرتا تو وہ ذرا سا پیٹ پر سے اوپر اٹھ جاتی۔

مکمل ناول



ہیئر اسٹائل فنی تھا۔ شوز سرخ تھے۔ گلے میں رسیاں سی پہن رکھی تھیں۔ اس سب الٹے ملٹے میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہر لڑکی، لڑکا اپنی جگہ پر ایک الگ برانڈ بنا گھوم رہا تھا۔ سب کے اسٹائلز مختلف تھے۔ کچھ کے عجیب تھے۔ کچھ کے عجیب تر اور اس سب میں ایک ہی چیز مشترک تھی کہ وہ سب نیلی، سبز، بھوری آنکھوں والے ایک سے بڑھ کر ایک شان دار لگ رہے تھے۔

اس کے چہرے پر در آنے والے تاثرات کو ماریہ نے طنزیہ نظروں سے دیکھا جیسے پوچھا۔

"کیا واقعی تم میرے لیے پرفیکٹ ہو؟"

اس نے بھی اس کی نظریں پڑھ لیں۔ "دیکھ جاؤں گا یہ سب بھی۔"

کچھ دیر تو ماریہ اس کے ساتھ رہی۔ پھر غائب ہو گئی۔ وہ اکیلا ہی ادھر ادھر اٹھتا بیٹھتا رہا۔ پارٹی فائیو اسٹار ہوٹل کی چھت پر تھی۔ کچھ ہی دیر میں تمام روشنیاں گل کر دی گئیں۔ خوب ہوہا ہوئی۔ آسمان پر فائر ورکس سے پہلے پھول بنے۔ پھر دس سے الٹی گنتی لکھی جانے لگی۔

"نائن۔ ایٹ۔ سیون۔" سب یک زبان کان پھاڑنے لگے۔

"سکس۔ فائیو۔ فور۔" ہر نمبر الگ رنگ سے آسمان پر جگمگاتا اور پھر پھیل کر معدوم ہو جاتا۔

"تھری۔ ٹو۔ ون۔"

"اف اتنا شور۔" عدن نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ "ون" کے ساتھ ہی ڈانس فلور کی لائٹس روشن ہو گئیں۔ صرف وہ ڈانس فلور سے ذرا ہی دور تھا۔ اس کا فلور مختلف روشنیوں سے جل بجھ رہا تھا اور فلور کے عین اوپر لگا بڑا گلوب روشن ہو گیا۔ وہاں دس جوڑے کھڑے تھے۔ وہ مختلف پوزیشنوں میں پوز بنائے جامد کھڑے تھے۔ لڑکیوں نے گھٹنوں تک اونچی فراک پہن رکھی تھی۔ اونچی ٹیل اور ہیل بہت اونچی پہنی تھیں۔ فلور کی لائٹس روشن ہوتے ہی شور کچھ دیر کو تھما۔ میوزک بجنا شروع ہوا۔ میوزک کے بجتے ہی ایک ایک کر کے ہر جوڑے نے اپنا اپنا جامد پوز توڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔

"اوہ!" عدن کا منہ کھل گیا۔ جوڑے جیسے ہی کھلے فلور پر اس کی نظر ماریہ پر پڑی۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ تھی، اس کی شخصیت کے سحر کے سامنے وہ خود کم ہو گئی تھی۔

دو گھنٹے تک اس فلور پر ڈانس ہوتا رہا۔ ہارنے والے ساتھ ساتھ نکلتے رہے۔ دس سے چھ اور چھ سے چار رہ گئے۔ تیسرے نمبر پر ماریہ بھی باہر آ گئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ پسینے سے گیلی ہو رہی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کی فراک اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی تھی۔ دونوں نے اتنے کمال کا ڈانس کیا تھا کہ عدن حسد سے جل کر خاک ہو گیا۔ یہ امریکی ہر کام میں اتنے آگے کیوں ہوتے ہیں اور اتنے باکمال۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد ریکس نے ڈانس فلور پر مون واک کی اور مون واک کرتے وہ مائیکل جیکسن کا باپ لگ رہا تھا۔ ایک طرف کھڑی ماریہ جوش سے "ہو، واؤ" کرتی رہی۔ اگر عدن اس سے اتنا حسد نہ کر رہا ہوتا تو وہ بھی تالی مارتا اور "واؤ، واؤ" ضرور کرتا اس کے ایسے شان دار بے عیب ڈانس پیش کرنے پر۔

عدن کو اس کا جواب مل گیا تھا۔ وہ اسی لیے اسے پارٹی میں لائی تھی۔ اب اگر مذاق میں ہی کسی کلب میں دونوں کا ڈانس مقابلہ کروا لیتی تو سب عدن کا ڈانس دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بہت کم عدن نے کمال انداز سے ماریہ کے لیے جواب دیا تھا۔ امریکن ہیرو کے سامنے تو وہ زیرو ہی تھا تا اپنے گروپ میں وہ بے شک باکمال تھا۔

چند مہینے وہ ماریہ کے عشق میں گھومتا رہا۔ کبھی طنز میں آ جاتا کہ ماریہ کو ضرور مزا چکھائے گا۔ یہ اس کی پہلی بھرپور بے عزتی تھی جو کسی نے کی تھی۔ خاص کر کسی لڑکی نے۔ وہ بھولا تو نہیں، لیکن یاد کر کے تکلیف بھی ہوتی۔ جب پاپا پوچھتے۔

"ماریہ کو فون کیا۔ ہائے ہیلو کیا اس سے؟" وہ منع کر آیا تھا۔

پھر کبھی امریکا نہیں گیا۔ پاپا ہی اسے لے کر جاتے تھے۔ کچھ سال بعد جب وہ جانے لگے اور اسے بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر اگلے چکروں میں انہیں بھی اندازہ ہو گیا کہ ماریہ نامی چیز ان کے ہاتھ آنے والی نہیں اور اب یہ ماریہ نامی چیز ان کے گھر آئی تھی مہمان بن کر۔ ہمیشہ کی طرح کم گو سی۔ اپنے آپ میں ہی گم تھی۔ لان میں ڈنر کے دوران اس کے ڈیڈی اس کی پلیٹ بھرتے رہے۔ منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کچھ کہتے تو وہ مسکرانے لگتی۔

عدن کو محسوس ہوا کہ وہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے انداز سے دھماکہ خیزی غائب تھی۔ وہ جو اسے اپنے انسان اور ماریہ ہونے پر فخر تھا۔ آج وہ فخر اس کی ذات میں سے نہیں جھلک رہا تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس کی مام ایکسٹین کی ہیں اور وہ ازبک بیوٹی ہے۔

"کتنی بار سرجری کروا چکی ہو؟" اس نے موقع ملتے ہی اس کے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے سوالیہ انداز لیے دیکھا۔

"اب تو شاہکار بن چکی ہو۔"

ایک دم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلی اور یہ پہلی مسکراہٹ تھی جس میں طنز اور تمسخر نہیں تھا۔

"تعریف کر رہے ہو؟" آنکھیں ترچھی کیں۔

"کچھ سال پہلے ایسا صدمہ ملا تھا کہ اس قابل بھی نہ رہا۔" ماریہ کی آنکھوں میں سوچ سی در آئی۔ جیسے وہ دکھانا چاہ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا تھا۔

"کیسا صدمہ تھا؟"

"کمال سے بڑھ کر۔" اسے دیکھتے ہی سب کچھ عدن کی زبان سے نکلتا ہی چلا گیا۔ اس نے خود کو نہیں روکا۔

"ہنسی کا ہی کسی ریکارڈ کو خراب نہیں ہونے دیتا۔ مجھے ایک بار وہ اس میں مبتلا ہوا تھا۔ ایک بار تو ہیرو کو بھی اس میں مبتلا ہونا چاہیے تھا۔"

"تو کیسے میں جاننا چاہوں گی کیا تھا وہ؟"

"بتانے کے لیے تو مجھے ساری عمر چاہیے۔ ہے تمہارے پاس اتنا وقت؟ ساتھ ساتھ بتاتا جاؤں گا۔"

وہ اتنی زور سے ہنسی کہ گردن موڑ کر اس کی مام اور ڈیڈی نے اسے دیکھا اور یہی کام عدن کے ماما پاپا نے کیا۔ غلام علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ منظر بے حد حسین لگا انہیں اور اس منظر سے بنتا پس منظر بھی۔

"کمال ہو جائے گا۔" دل میں سوچا۔ "کمال ہی ہو جائے گا۔"

ڈنر کے بعد ان کے اصرار کے باوجود وہ ان کے گھر نہیں رکے۔ اگلے دن عدن ہوٹل چلا گیا۔ ماریہ کو لے کر مختلف جگہیں گھمائیں اور وہ ساتھ ساتھ رہی۔ ہنس بھی دیتی تھی۔ بول بھی لیتی تھی۔ چند دن وہ اسے ایسے ہی لیے گھومتا رہا۔ دو بار اس کے مام ڈیڈ پھر ان کے گھر آ گئے۔ عدن سے بھی لمبی لمبی باتیں کیں۔ ادھر ادھر کے کئی سوال پوچھے۔

"اب آگے کیا کرو گے؟" انداز ایسا تھا کہ کتنے پانی میں ہو میاں؟

"اپنا اسپتال بناؤں گا۔ اسی کے لیے پلاننگ کر رہا ہوں۔"

"سرجن نہیں بنتا؟"

"اس کے بارے میں چند سال بعد سوچوں گا۔"

"یعنی ابھی پیسے بنانا چاہتے ہو۔ اپنے باپ پر گئے ہو۔" عدن کو برا تو لگا۔ لیکن ان کے مقام (دولت کے مقام) کو دیکھ کر خاموش ہی رہا۔

"شادی کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟"

"کوئی نہ کوئی تو مجھے پسند کر ہی لے گی۔" بہت بھونڈے انداز سے انکساری دکھائی گئی۔

"تمہاری بھی کوئی پسند ہو گی؟" سگار کو منہ میں لیا اور تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"جو بھی 'اسے جچا' یا تھا۔" آنکھوں کا زاویہ ذرا دور بیٹھی ماریہ کی طرف موڑا۔ وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے اور ماریہ اردو بہت کم سمجھتی تھی۔

انہوں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور کمال انداز سے نظریں واپس موڑیں کہ وہ جان نہ سکے کہ وہ اس کی نظر کے تعاقب میں گئے ہیں۔

"کالج کے زمانے میں تمہارے باپ کے بہت معاشقے چلے تھے۔" اتنا کہہ کر وہ جناتی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اپنے بارے میں بتاؤ! کیا کیا؟ کیا کالج میں؟" اتنا کہتے انداز سرگوشی جیسا ہو گیا۔ جیسے دو دوست آپس میں بیٹھ کر رازداری کی باتیں کرتے ہیں۔

عدن کو اندازہ ہو گیا کہ اس انسان نے امریکا میں اسٹورز کی چین کیسے بنالی۔ نظر کی نظر پر تھی ان کی۔

"چلو! جوانی میں سب چلتا ہے۔ کیا خیال ہے؟" بہت عقل والے انسان تھے۔ سیدھی طرح بات بھی نہیں کررہے تھے اور سب سیدھے جواب بھی لے رہے تھے۔

اس نے ناچار سرہلا دیا۔ ماریہ سے متعلق اشاروں میں بھی ابھی کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سارے اشارے اکٹھے کررہے تھے۔

"تمہاری ایک بات مجھے پسند ہے۔ تم میں تحمل بہت ہے۔ میری اور غلام علی کی بہت بار لڑائی ہوئی۔ لڑائی بھی کیا۔۔۔ صرف میں ہی لڑا۔۔۔ لیکن غلام علی نے جی جان سے دوستی نبھائی۔" پھر جناتی قہقہہ بلند ہوا۔ "وہی تحمل مجھے تم میں نظر آرہا ہے۔"

نہ جانے یہ تعریف کا کون سا انداز تھا۔ عدن خوش نہیں ہوسکا۔

اس رات وہ واپس گئے تو غلام علی غلام نے عدن کو بڑھ کر سینے سے لگالیا۔

"ڈیر سن۔۔۔ مبارک ہو۔"

وہ سمجھا ہی نہیں۔

"تم نے کیا جادو کیا ہے تنازر؟ وہ خود کہہ گیا ہے تمہارے اور ماریہ کے لیے۔ مجھے امید تو تھی لیکن اس طرح کی بہت سی امیدیں وہ دلائے رکھتا ہے۔ بہت بار میں نے اسے اپنا پارٹنر بننے کے لیے کہا۔ لیکن بنا نہیں۔ اس بار مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ۔۔۔ کہہ رہا تھا امریکا میں ہی اسپتال بن جائے گا۔"

جو کچھ ہو رہا تھا، وہ عدن کے سامنے ہی تھا۔ لیکن اس اچانک خبر پر وہ بوکھلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریہ کبھی نہیں مانے گی۔ اب وہ کیسے مان گئی، کیا وجہ ہے؟

"ہو سکتا ہے انہوں نے ماریہ سے نہ پوچھا ہو۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ آغا کے کام کرنے کی تمیز ہے۔"

عدن بہت سی کیفیات کا ایک دم شکار ہوا۔ پہلی کیفیت حیرانی کی تھی۔ خود پر حیرانی۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ تو ماریہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا اور اتنے سال وہ ماریہ کو ہی دوسری لڑکیوں میں ڈھونڈتا رہا ہے۔ یہ ہی اس کی پہلی پسند اور محبت تھی۔ تھوڑی بگڑی ہوئی تھی۔ لیکن ٹھیک ہوجائے گی۔ اس کے عورتوں کے لیے مقرر کیے گئے معیار سے ذرا آگے پیچھے تھی۔ لیکن اتنا تو چل ہی جاتا ہے اور پھر اس سے زیادہ نادر موقع کہاں ملے گا! ماریہ کو اپنے آگے پیچھے گھمانے کا، اس سے بدلہ لینے کا، اسے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کا، شوہر بن کر اسے ہرانے کا۔

دوسری کیفیت میں اسے افق یاد آئی۔ آج کل وہ اس سے بات نہیں کررہا تھا۔ ایک آدھ میسج بھیجا تھا۔ افق سے متعلق کیفیت بہت عجیب تھی۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ افق دراصل ماریہ کا ہی نعم البدل تھی۔ ماریہ جتنی ہی حسین، لیکن افق صرف حسین تھی۔ ماریہ سب کچھ تھی۔ ماریہ تو اتنا کچھ تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو بونا سمجھتا تھا۔ ماریہ ہی اس کی فکر کی لڑکی تھی۔ ایک ایسی لڑکی جسے دھتکارے کر پیچھے کہا جاسکے کہ "جاؤ! مجھے تم سے بات نہیں کرنی" جس کا فون نہ اٹھایا جائے۔ ایک ایسی لڑکی نہیں جو روتی ہے، رلاتی ہے۔

کھڑے کھڑے عدن نے ماریہ اور افق کو اوپر نیچے کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ زندگی کا مزہ ایک ایسی ہی لڑکی کے ساتھ ہے جو غلطی بھی کرے۔ ناراض بھی خود ہی ہوجائے اور کان پکڑ کر "سوری" بھی کہلوائے۔ ایسی نہیں کہ وہ خود ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگے۔

عدن بہت ذہین تھا۔ ایسے ہی نہیں وہ دو دن میں ایک کتاب ہضم کر کے ٹاپ کرجاتا تھا۔ تبدیلی کو … کرتا تھا۔ خاص کر کسی کو جواب وہ نہیں تھا۔ اس…

… سے دوستی کی تھی اور سب ہی اچھی تھیں لیکن افق ان سب میں اچھی تھی اور اچھے … اچھی زندگی کے ضامن نہیں ہوتے۔ وہ اتنے پیچھے ہوتے ہیں کہ برے لوگ انہیں روند کر ان کی … پر اپنے محل بنالیتے ہیں۔ تو ایسے روندے جانے والوں کے ساتھ کون زندگی گزارے۔

غلام علی غلام نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ اپنا باپ خود نہیں ہے۔ وہ اپنے خون کو جانتے تھے۔ جس محبت محبت کی رٹ اس نے لگائی تھی۔ ایسی رٹ تو وہ آئندہ زندگی میں بھی بہت بار لگائے گا۔ محبت تو اسے بہت بار ہوگی۔ ہر محبت کو وہ حاصل کرنا چاہے گا اور ہر محبت کو بھول بھی جائے گا۔ یہ محبتیں ساحل پر قدموں کے نشانات سے بھی کم وقتی اور کمتر ہوتی ہیں۔ بظاہر وہ اس ریت میں بری طرح … کر پورا مکمل نشان بناتے ہیں۔ لو۔۔۔ اور سمندر کی ایک معمولی لہر اس معمولی نشان کو اس کی اوقات دکھا جاتی ہے۔

… ماریہ کو ڈنر کے لیے لے گیا اور جس وقت وہ ماریہ کو گھر بھی پہنچا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت افق روتی ہوئی … سے باہر نکلی۔

"بھابھی جی!" وہ ادھر سے ان کا دروازہ کھول کر … کہ وہ سب رات کا کھانا کھارہے تھے۔

"بھابھی جی۔۔۔ اماں۔۔۔" ننگے پاؤں بنا دوپٹے کے وہ کھڑی تھی۔ وہ سب فوراً اٹھے۔ اس کے ساتھ … اماں کچن میں چولہے کے پاس بے ہوش پڑی تھیں۔ افق زاروقطار رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

… کے ساتھ جاکر اماں نے سرکاری اسپتال سے ٹیسٹ کروائے تھے۔ ٹیسٹ ٹھیک نہیں تھے یا … کرنے اور پڑھنے والے ڈاکٹر۔ سرکاری اسپتال سے انہیں دوائیں مل گئیں۔ وہ کھاتی رہیں۔ درد … ٹھیک نہیں ہوا۔ جیسے تیسے اسکول چلی جاتیں۔ … ہوجاتیں۔ نہ ظاہر کرتیں۔ نہ ہی بتاتیں کہ کتنا درد ہے۔ بس دوا کھالیتیں۔ درد کو چھپائے رکھتیں۔

"ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہو جائے گا۔" کرتے کرتے انہیں باورچی خانے میں چولہے کے پاس پہلا ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں اٹھا کر اسپتال لے جانے تک دوسرا ہوا۔ جمال اور اسد پریس گئے تھے۔ افق ہاتھ پیر مسلتی رہی۔ بھابھی گود میں سر رکھے بیٹھی رہیں۔ جھاگ سی ان کے منہ سے نکلنے لگی۔ بے جان سی ہو گئیں۔

"اماں۔۔۔!" وہ پاگلوں کی طرح انہیں پکار رہی تھی۔ اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ دنیا میں آگ کیسے لگتی ہے۔ جسم سے جان کیسے نکلتی ہے۔ بے سہارا رہ جانے کا اصل مطلب کیا ہے۔ قیامت کسے کہتے ہیں۔

ایمرجنسی میں تیسرا اٹیک ہونے سے ڈاکٹرز نے انہیں بچالیا۔ بھابھی کے شوہر اور ان کے سسر ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ بھابھی خود حالات کے پیش نظر بری خبر کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

دو دن اماں ایمرجنسی میں رہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کھری کھری سنا رہا تھا۔

"جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو لے آتے ہیں۔ تیسرے اٹیک سے کیسے ہم نے بچایا ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں۔ ابھی بھی ان کی حالت بہت پیچیدہ ہے۔ نہ معلوم کن ڈاکٹروں کے پاس ان کا علاج ہو رہا ہے۔"

بھابھی اور ان کے شوہر سر جھکائے سنتے رہے۔ ماموں کو فون کردیا تھا۔ وہ ایک دو دن میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ چچا دو گھنٹے گزار کر جاچکے تھے۔ اکلوتی پھوپھی ملتان میں رہتی تھیں۔ فون کر کے انہوں نے بھی حال چال پوچھ لیا تھا۔ جمال اور اسد کو بھابھی نے ناشتا کرادیا اور اس کے لیے بھی بنا کر ان کے ہاتھ اسپتال بھیج دیا۔ دوپہر کے بعد بھابھی بھی آجاتیں۔ شام کو ان کے شوہر آجاتے۔ ڈاکٹر سے بات کرتے۔ ضروری دوائیاں لادیتے۔ اسد اور جمال کے پریس کے مالک نے پیسوں سے کچھ امداد کی تھی۔ وہی پیسے استعمال میں آرہے تھے۔ تین دن سے وہ بہن بھائی

سہمے سہمے آنے والے وقت سے ڈرتے رہے کہ اب کیا ہو۔ اب کیا ہو جائے۔ ان کی پیاری صورتیں مرجھا گئیں۔ ان کی اماں ایمرجنسی میں تھیں۔ زندگی اور موت کے درمیان۔ زندگی کو جھیلنے کے لیے وہ تین اکیلے تھے۔ کم تھے۔

اسد اور جمال اپنی ماں کے ہمت اور حوصلے کے سکھائے سارے سبق بھول گئے اور افق کے سینے سے لگ کر خوب روئے۔ بار بار اس سے پوچھتے۔

"اماں ٹھیک ہو جائیں گی نا۔ باجی! بتاؤ نا کب ٹھیک ہوں گی؟"

باجی خود سرہلا کر روتی رہتی۔ ان تین دنوں میں اس نے بار بار اپنے سر پر آسمان گرتے دیکھا۔ خود کو بھرے بازار میں بے یار و مددگار کھڑے دیکھا۔ جنگل میں گم ہوتے دیکھا۔ اس بردکھ کا ہر احساس ہو بہو گزرا۔ ہر احساس نے اسے چیخ چیخ کر رلا دیا۔ ڈر کے مارے اس کا نام و نشان نکل گیا۔ اس نے دل سے یہ خواہش کی کہ کاش! اپنی ماں کی جگہ پر وہ ہوتی۔ تین دن اور تین راتیں وہ احساسات کے لمبے لمبے سفروں سے ہو کر آئی۔ دعائیں مانگتی رہی۔ گڑگڑاتی رہی۔

آس پاس کے چند دور و نزدیک کے رشتے دار آکر دیکھ کر چلے گئے۔ اماں کے اسکول کی پرنسپل آئیں۔ اسٹاف آیا۔ ان سب کے اس طرح آنے پر افق اور ڈر گئی۔ تین دن بعد اماں کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ گھر آگئیں۔ ان سمیت گھر میں سب کو چپ لگ گئی۔

ماموں فیصل آباد سے ایک اور بار ہو کر چلے گئے۔ اس کا جی چاہا کہ ماموں کے قدموں میں گر جائے۔

"خدارا ہماری مدد کیجیے۔ ڈاکٹر نے اتنی خطرناک باتیں کی ہیں اور نہیں تو آپ زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ چل کر ڈاکٹر کی بات اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ وہ تو نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟"

اتنے سوال تھے افق کے پاس۔ اس نے چند ایک پوچھے۔ ماموں نے اسے اچھے سے تسلی دے دی۔

☼ ☼ ☼

"کچھ بتا افق؟"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ سر پھر گھٹنوں میں دبا لیا۔

"ماموں کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں۔ علاج سے اچھا پرہیز ہے۔ اچھی خوراک کھائیں۔ دوا لیں۔ ورزش کریں۔ ڈاکٹروں کی تو عادت ہوتی ہے بکواس کرنے کی۔" وہ رٹے ہوئے انداز میں بولی۔

"اور چچا۔۔۔؟" "نہیں بلاؤ یہاں۔"

"انہوں نے کہا کہ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو میں انہیں یہاں بلا لوں۔ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔"

"اب کیا ہوگا افق؟" وہ بے چاری بہت گھبرائی اور پریشان تھیں۔ افق کی ہاں آئی منہ بولی خالہ کے لیے۔ افق ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ پھر رونے لگی۔

"بھابھی جی! کچھ کر دیں۔ میری اماں کو۔۔۔ کچھ ہو نہ جائے۔"

بھابھی بے چاری خود سفید پوش گھرانے سے تھیں۔ اس سب کے دوران ان کے بھی چند ہزار لگ گئے تھے۔ مزید اور بھی چند ہزار ہی دے سکتی تھیں۔ انہوں نے ہی اپنے بھائی سے اسلام آباد بات کی۔ وہ وہاں سی ڈی ایچ میں ملازم تھا۔ اس نے اپنے طور پر تھوڑے بہت ڈسکاؤنٹ کی بات کی۔ لیکن اس سب پر بھی انہیں بائی پاس سرجری کے لیے کافی پیسے چاہیے تھے۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہا تھا کہ اگر مریض کو مارنا ہے تو انتظار کرو۔ چند ماہ ہی لگیں گے۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو فوراً "بائی پاس" کروا لو۔ یہ بات بھابھی کے شوہر نے اپنے گھر بلا کر کی تھی۔ رپورٹس ان کے پاس تھیں۔ انہوں نے اسلام آباد اپنے سالے سے بھی بات کر لی تھی۔ وہ جتنی مدد کر سکتا تھا۔ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اپنے گھر رکھنے 'خدمت کرنے' باقی بھاگ دوڑ کرنے کے لیے تیار تھا۔

پاس تھے۔ صرف پیسہ تھا۔ اسکول کی میڈم اور باقی فیملی کا چندہ ہزار روپے چکے تھے۔ اماں کا علاج ایک تیم سرکاری اسپتال سے ہوا تھا۔ بہت سے اخراجات انہیں خود اٹھانے پڑ رہے تھے۔ اسد اور جمال کے ہزار لوہے لے آئے تھے اپنے استاد سے۔ ان کے کے پاس تو صرف تین ہزار روپے تھے۔ اب کوئی ایسا شخص نہیں بچا تھا جس سے وہ پیسے لے سکتے تھے۔ افق اسکول کی میڈم کے پاس ہی گئی۔ انہوں نے دس ہزار اور دے دیے تھے۔ جو مدد کرنے والے تھے وہ پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کی اپنی چادریں محدود تھیں اور جن کی محدود نہیں تھیں وہ مدد کرنے والے نہیں تھے۔ ان کے پاس بیچنے کے نام پر ایک چھلا بھی نہیں تھا کہ جسے بیچ دیتے۔ گھر کا محدود سامان تھا۔ محدود تعلقات تھے اور بس۔ اماں بستر کی ہو کر رہ گئیں۔

ایک ایک روپیہ بچانے کے لیے وہ تین بہن بھائی ایک ہی وقت کی روٹی پر آگئے۔ وہ بھوکے بھی رہ سکتے تھے۔ انہیں اپنی جان سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ پیٹ تو ایک بھی نہیں تھا۔ اماں کے لیے ڈاکٹر نے ایک چارٹ دیا تھا۔ خوراک کا۔ انہیں ہر صورت وہی دینا تھا۔

رات گئے اماں سو جاتیں تو تینوں بہن بھائی باورچی خانہ میں بیٹھ کر چپکے چپکے باتیں کرتے۔

"افق باجی! کچھ کرو نا۔" جمال کو ڈاکٹر کی بات پر بڑا یقین تھا۔ اس نے چند مہینے ہی کہا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ محبت اور پناہ کے نام کے اکلوتے سہارے کے بارے میں اگر کوئی ایسی پیش گوئی کر دے تو کیا ہوتا ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔ بس وہ نظر نہیں آتا۔ جن پہ بیت کر گزرتا ہے انہیں ہی معلوم ہوتا ہے۔

"میں دعا کرتی ہوں۔" تسلی کے نام پر اس کے بس یہی الفاظ تھے۔

"دعا تو میں بھی کرتا ہوں۔" اسد بولا۔

وہ تینوں ایسے نظر آتے تھے۔ جیسے تینوں کا بالٹی بالٹی بھر خون نکال کر بہا دیا گیا ہو۔

"جاؤ! سو جاؤ تم۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے افق باجی!" اناركلی کی سنسان سڑکوں اور گلیوں سے رات گئے اکیلے آنے والے کو اب ڈر لگ رہا تھا۔

"مجھے بھی لگتا ہے۔" جمال بھی بولا۔

"مجھے بھی۔۔۔" افق نے سوچا۔ بولی نہیں۔

وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہ بار بار اٹھ اٹھ کر اماں کو دیکھیں گے کہ ان کی سانسیں چل رہی ہیں نا۔ وہ کچن میں ہی چوکی پر بیٹھی رہ گئی۔ فون اس کی گود میں تھا۔ اس نے عدن کا نمبر پھر سے ملایا۔ فون بند جا رہا تھا۔ جب اماں ایمرجنسی میں تھیں تو تین دن بعد اس نے فون کیا تھا۔ فون تب بھی بند ہی ملا تھا۔ فون اس سے ایک ہفتہ پہلے سے ہی بند مل رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کے ایک دو میسج آگئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ "وہ آج کل بہت مصروف ہے اور نہ جانے کب تک فارغ ہو۔ وہ خود رابطہ کرے گا۔"

جس وقت افق باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ اس وقت تک وہ اپنے نکاح سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کی چند دوسری دوست لڑکیوں تک اس کی شادی کی خبر پہنچی تو وہ اسے فون پر فون کرنے لگیں۔ یہ وہ چند لڑکیاں تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ وہ ان سے شادی کرے گا۔ وہ اسے اپنی فیملی سے بھی ملوا چکی تھیں۔ عدن کے پاس ایک پرسنل نمبر بھی تھا' جو صرف فیملی اور چند قریبی دوستوں کے لیے ہی تھا۔ دوسرے نمبر پر اس سے ہر طرح کے رابطے تھے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان لڑکیوں نے پرسنل نمبر تک بھی رسائی حاصل کر ہی لی۔

ان کے نمبر حاصل کرتے ہی اس نے پرسنل سم کو جس سے وہ افق سے بات کیا کرتا تھا۔ اپنے کمرے کے باتھ روم کے فلش میں بہا دیا۔ وہ نیا اکلوتا نمبر استعمال کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک بار سوچا کہ وہ افق کو فون کرے اور اسے بتائے کہ اس کے پاپا نہیں مان رہے۔ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی صحت کی خاطر وہ ان کی پسند سے شادی کر رہا ہے۔

پھر اس نے اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ ایک تو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ دوسرا افق کے لیے تو بالکل نہیں تھا اور پھر اس نے افق کے ساتھ کیا ہی کیا تھا؟ ہاتھ تک تو کبھی اسے لگایا نہیں تھا۔ صرف بات ہی کی تھی نا۔۔۔ نہ کبھی ڈیٹ پر لے کر گیا۔

یہ سب سوچتے اس کے اندر کہیں ایک ہلکی سی خلش ضرور تھی۔ بے حد معمولی۔ اور یہ معمولی سی خلش بھی دلہن بنی ماریہ کو دیکھ کر جاتی رہی۔

شادی کے دوسرے ہی دن وہ لوگ دبئی آ گئے۔ اتنی سی بات تھی۔ اس سب میں نہ کوئی نقصان ہوا، نہ ہی گھاٹا۔ جب ہم کسی ایک چیز سے دور ہوتے ہیں تو کسی دوسری چیز کے قریب ہو ہی جاتے ہیں۔ یقین جانیے یہ فلسفہ بالکل سچا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن کا آنا۔ یہ فلسفہ عدن جیسے لوگوں کے لیے ہے۔ ان ہی پر صادق آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

افق کے پاس اب کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں بچا تھا جس کے پاس جا کر وہ پیسے لے آتی۔ مدد اور سہارے کے نام پر اس کے پاس ایک ہی انسان تھا۔

"اماں۔"

اسپتال سے آئے اماں کو تین ہفتے گزر گئے تھے۔ ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سفید رنگ پیلا ہو گیا تھا۔ اس دوران وہ ایک بار پھر چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے پرانی ہی بات کی افق سے۔ افق کا منہ لٹک گیا۔

سرکاری اسپتال والوں نے تو پہلے ہی اماں کو مار دیا تھا "سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" کہہ کہہ کر وہ نہ درد کو پکڑ سکے۔ نہ ہی مرض کو۔ اب وہ کیا کریں گے۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ افق پاگلوں کی طرح امان کو فون کرتی رہتی تھی۔ میسج لکھتی۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خود اتنی پریشان تھی کہ اس نے سوچا ہی نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا فون اتنے دنوں سے کیوں بند ہے۔

چوتھے ہفتے اماں کے سینے میں درد اٹھا۔ بھابھی کے ساتھ جو اس بار وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ دونوں کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب بھگتو۔"

رات بھر اماں درد کو برداشت کرتی رہیں۔ آہیں بھر رہی تھیں۔ لیکن ان کا وجود بتا رہا تھا کہ ان کے اندر کیا چل رہا ہے۔ وہ تینوں دم سادھے ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اسد اور جمال ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ افق کبھی ہاتھ سہلاتی، کبھی سینہ۔ رات ان سب نے سولی پر گزاری۔

صبح ہوتے ہی افق بڑی سی چادر میں لپٹ کر دی اکیلی ہی آ گئی۔ یہ خیال اسے پہلے بھی آیا تھا۔ لیکن چاہ کر بھی جا نہ سکی۔ ہر دن یہی سوچتی آج تو امان ضرور ہی فون کرے گا۔

آج آج کرتے کئی ہفتے گزر گئے۔ اس کے گھر سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ کوئی دوست مل جائے گا۔ ورنہ کوئی ملازم تو ضرور ہی ہو گا۔ کوئی پیغام دے سکتی ہے وہ انھیں۔ رکشہ کروا کر وہ عین اس کے گھر کے باہر رکی۔ بیل دی۔ چھوٹا دروازہ کھولا گیا۔

"السلام علیکم جی۔ وہ امان ہے؟" چوکیدار کی بڑی بڑی مونچھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"امان۔" اس نے سوچا۔ "گورا صاحب۔؟ گورا تو وہ بہت تھا۔" افق نے سر ہلا دیا۔ "وہ ہیں؟"

"نہیں۔"

"کہاں ہیں وہ۔۔۔؟"

"وہ صاب لوگ ہیں۔ نہ ہمیں بتاتے ہیں۔ نہ ہم پوچھتے ہیں۔" خان نے غصہ نہیں کیا، لیکن چڑ گیا۔

"ان کا کوئی فون نمبر ہو تو مجھے دے دیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہتے اس کی آواز بھیگ گئی اور اس کے ساتھ ہی پورچ میں تھوڑا سا شور ہوا۔ چوکیدار نے جھٹ بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ طویل پورچ سے ایک کار آتی نظر آئی۔ کار پر نظر پڑتے ہی افق چوکیدار سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ "کار میں کون ہے۔ کیا اس کا کوئی دوست۔۔۔" لیکن چوکیدار اندر کی طرف دوسرے دروازے کے پاس کھڑا تھا اور وہ گیٹ کے باہر چھوٹے دروازے کی طرف۔ لمبی شان دار کار باہر نکلی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے سیاہ، سفید گھنی اوپر کی طرف اٹھی مونچھوں والے شخص کی نظر ایسے ہی لمبی سی چادر میں لپٹی لڑکی پر پڑ گئی۔ اس نے نظر پڑتے ہی کار کو روکنے کا اشارہ دیا۔ چوکیدار بھاگا کھڑکی تک گیا۔

"کون ہے یہ؟"

"گورا صاحب کا پوچھ رہی ہے جناب۔"

"عدن کا؟" یہ کہتے ایک اور نظر اس پر ڈالی۔ دراصل جو پہلی نظر پڑ گئی تھی، وہی واپس مشکل سے پلٹی تھی۔ اپنے زمانے میں وہ رنگین مزاج مشہور تھے۔ آج بھی اکثر اٹھی نظریں اس خطاب کی گواہی دے جاتی تھیں۔ سیاہ چادر میں پریشان صورت حسن پر دوسری نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ کون ہے۔ اپنے خون کو جانتے تھے۔ اگر وہ اس پر فدا ہوا تھا تو غلط نہیں ہوا تھا۔

ڈرائیور نے کار واپس پیچھے کر لی۔ کار سے اتر کر وہ اندر چلے گئے۔ افق کو لے کر چوکیدار اندر آ گیا۔

انھوں نے صرف اتنا ہی کہا "آؤ ہمارے ساتھ۔" یہ نہیں بتایا کہ یہ صاحب کون ہیں۔

ڈرائنگ روم کے چوڑے لکڑی کے منقش دروازے کے بالکل عین سامنے بڑے سے سفید رنگ کے صوفے پر وہ مونچھوں والا، دونوں ہاتھوں کو صوفے کی پشت پر دائیں بائیں پھیلائے، دائیں پیر کو بائیں گھٹنے پر رکھے شان سے بیٹھا تھا۔

نظر پڑتے ہی افق نے چادر سنبھالتے سلام کیا۔ ان مونچھوں کی طرف اس کی پہلی نظر ملی تو دوبارہ ان کی طرف دیکھتے رہنے کی اس کی ہمت جاتی رہی۔

"بیٹھو!" سلام کا جواب نہیں دیا۔ ہاں اس بار اسے بیٹھنے تک کہا۔

ان کے سامنے رکھے ایک صوفے پر وہ بیٹھ گئی۔

"اب بولو۔"

اس انداز پر وہ گھبرا گئی۔ کیا بولے کہ امان کہاں ہے؟ اپنے باپ کی عمر کے شخص کے سامنے۔۔۔ کیسے؟

"کون ہو تم لڑکی؟" لہجے میں اس سوال سے ہی اتنی ہتک نمایاں کر دی گئی کہ اس کی رہی سہی ہمت جاتی رہی۔

"افق۔" وہ بمشکل بولی۔ نظریں لکڑی کے چمکتے فرش پر تھیں۔

"نام سے مجھے مطلب نہیں ہے۔ کام بولو۔ کون ہو، کیا ہو، یہاں کیوں آئی ہو؟" مکمل کے فنکار بنے تھے اس وقت۔ جان بوجھ کر ہتک آمیز انداز اپنا رہے تھے۔ وہ بالکل ہی نفس ہو گئی۔ جی چاہا بھاگ جائے۔

"مجھے امان سے ملنا تھا جی۔" جب وہ کمزور سی نالائق سی ہو جاتی تو بہت جی، جی کرتی۔

"امان کون؟" وہ جانتے تو تھے کہ ان کے سیالکوٹیے بیٹے نے ایک عدد فیشن ایبل نام رکھا ہوا ہے اپنا لاہور شہر میں۔ لیکن انجان بن گئے۔

اب وہ سٹپٹا گئی۔ اسے لگا۔ سامنے بیٹھا شخص ضرور ہی امان کا باپ ہے۔ ورنہ کوئی انکل ہو گا۔ اس کے گھر میں اس کے جاننے والے ہی ہوں گے نا۔

"عدن۔" اس نے کھکھیا کر اس کا نام لیا۔ امان نے اسے اپنا اصل نام بتا تو دیا تھا۔ ساتھ ہی منع بھی کیا تھا کہ وہ اسے کبھی اس نام سے نہ پکارے اور اصل نام اس نے اسے دیکھنے کے بعد بتایا تھا۔ ورنہ اکثر لڑکیاں تو اس کا اصل نام جانتی ہی نہیں تھیں۔

"عدن؟" حیران ہونے کی اداکاری کی۔ "تمہارا کیا لگتا ہے وہ؟ کیسے جانتی ہو تم اسے؟"

وہ جینز ٹی شرٹ میں کٹے بالوں اور بنا دوپٹے کے آئی ہوتی تو اس سے یہ سوال نہ پوچھے جاتے اور ایسے حلیے میں آئی کوئی بھی لڑکی بہت مزے سے کہہ جاتی۔ "ہو وا ایبل آر یو ٹو آسک۔" (تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے)۔

الفاظ کو اس انداز سے ڈھالا گیا۔ جیسے عدن کوئی سات پردوں میں رہنے والا مرد ہے۔ نظریں نیچی رکھنے والا، ٹخنوں سے اونچی شلوار پہننے والا اور سامنے بیٹھا شخص کوئی گدی نشین ہے اور کسی نامحرم لڑکی کے منہ

سے اپنے بیٹے کا ذکر سن کر کانپ اٹھا ہے۔

انفی شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ لکڑی کے تازہ پالش شدہ فرش سے نظریں اٹھا کر اس نے صوفے پر بیٹھی شخصیت کی طرف دیکھا اور جھٹ نظریں جھکا لیں۔

"وہ مجھے جانتے ہیں۔"

آواز کانپ رہی تھی۔ انداز بڑا ترس آمیز تھا۔ صوفے پر بیٹھے شخص کا جی چاہا کہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائے اور پھر سامنے بیٹھی پری کو اٹھا کر ہوا میں اچھال دے۔ اس کی ایک ایک حرکت قابل توجہ تھی۔ نظریں جھکانا۔ نظریں اٹھانا۔ ہتھیلیوں کو پیوست کیے بیٹھے رہنا اور اس طرح بیٹھنا کہ جیسے جنبش پر ٹوٹ جائے گی۔ کسی عجائب خانہ میں رکھی جانے والی مورت ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ان کے عین سامنے۔ اکیلی۔ صرف ایک چادر کی حفاظت میں۔

"کالج میں پڑھتی ہو اس کے ساتھ؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر کیسے جانتی ہو اسے؟" جھنجلا کر پوچھا گیا۔

وہ چپ رہی اور لگ رہا تھا کہ وہ اٹھ جائے گی جب اگلا سوال آ گیا۔

"کہاں سے آئی ہو؟"

"انار کلی سے۔" ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"انار کلی ہو... مزار سے آئی ہو۔" بہت ہی بھونڈا مذاق تھا۔ بھونڈے انداز سے کہا گیا تھا۔ بھونڈے انسان نے کہا تھا۔

"جی۔" اس نے جھٹ سر اٹھا کر دیکھا۔

"کس محل سے آئی ہو؟" دونوں بازو بدستور دائیں بائیں صوفے کی پشت پر پھیلے تھے۔ اس سوال پر گھٹنے پر رکھا پاؤں ہلنے لگا۔

"گھر سے آ رہی ہوں اپنے۔" ایک ہاتھ سے پیشانی پر آئے بال پیچھے کیے۔

"گھر سے یہاں کیوں آئی ہو؟" وہ تو اسے بٹھائے ساری زندگی زچ کر سکتے تھے اور کتنے مزے میں گزرتی ایسی زندگی۔

"مجھے کام تھا عدن سے۔" نظریں اٹھا کر انہیں دیکھ کر التجا سے کہا۔

"کیا کام تھا؟" پیر زور و شور سے ہلنے لگا۔

عدن ہوتا تو وہ بتا دیتی۔ ان صاحب کو کیسے بتائے۔ تھوڑی ہمت کی۔

"مجھے بتا دیں وہ کہاں ہیں۔ میری بات کروا دیں۔"

"تم کام بتاؤ۔ میں عدن کا بھی بتا دیتا ہوں۔"

خاموش بیٹھی لفظ جوڑتی رہی کہ ایک بار پھر کیسے التجا کرے کہ عدن کا بتا دیں۔

"میں باپ ہوں اس کا لڑکی...! بتاؤ، تمہیں کیا کام ہے؟"

وہ باپ تھا عدن کا اور ہونے والا سسر تھا اس کا۔ تو اس کو ذرا سی ڈھارس ملی۔ گو اپنی اوقات یاد تھی۔ لیکن مشکل کے وقت انسان اپنی اوقات بھول ہی جاتا ہے۔

"شاباش! بتاؤ کیا کام تھا؟" نرم لہجے میں کہا۔ اس بار انفی تو آبدیدہ ہی ہوگئی کہ ان سے اپنے سارے ہی دکھ درد کہہ ڈالے۔

"اماں کی سرجری کروانی ہے۔ مجھے پیسے چاہیے تھے عدن سے۔ اماں ٹھیک ہو جائیں گی تو ضرور ہی واپس کروں گی۔" اس پر اس کا انداز بڑا اعتماد تھا۔

"محمد بخش۔" اس آواز کی ایک بھڑک ماری۔ انفی ذرا سا ڈر گئی۔ محمد بخش دروازے میں نمودار ہوا۔

"میرے بیڈ روم سے میرا بریف کیس لاؤ۔"

بریف کیس آ گیا۔ چیک بک نکالی۔

"دس لاکھ ٹھیک ہیں؟" اتنی پیاری آواز میں پوچھا کہ انفی نے انہیں جان لیا کہ وہ تو اتنے اچھے ہیں۔ ضرور ہی ان دونوں کی شادی کے لیے راضی ہو جائیں گے۔ امی ایسے ہی ڈرتا تھا۔

"نہیں جی۔ اتنے نہیں۔ یہ بہت زیادہ ہیں۔"

"چھ لاکھ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں... نہیں... اتنے نہیں...۔"

"اچھے سے اسپتال سے سرجری کروانا ناں۔ چار لاکھ ٹھیک ہیں؟"

اس نے "نہیں" کہا۔ انہوں نے چیک لکھ کر سامنے شیشے کی میز پر رکھا۔

"چلیں لکھ دیا میں نے۔" وہ اٹھ کر چیک پکڑنے لگی تو انہوں نے...!

"آرام سے بیٹھو۔ کوئی ٹھنڈا گرم پیو۔ محمد بخش!" پھر بھڑک دار آواز نکالی۔ چیک پکڑے بغیر وہ واپس بیٹھ گئی۔

"میڈم کے لیے فریش جوس لاؤ۔"

تھینکس کر انفی کے گالوں پر سرخی سی آ گئی۔ ان کے سامنے اس کے سسر بیٹھے تھے۔ انہوں نے کتنے پیار سے اس کی مدد کر دی تھی۔ اب اس کی خاطر مدارات کر رہے تھے۔

"عدن سے بات نہیں کرو گی؟" بازی آنکھیں اس پر گاڑ کر اس گدھ نے پوچھا۔ انفی نے سر نفی میں ہلایا۔ یہاں ان کے سامنے کیسے بات کر سکتی تھی۔ بہت شرم کی بات تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی نہ ہوتیں تو وہ دیکھتی کہ انہوں نے موبائل کے بٹن کو پش کیا تھا۔

"ہیلو پاپا!" اسپیکر پر عدن کی آواز ابھری۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیسے ہو ہنی مون؟"

"فٹ فاٹ اور آپ کیسے ہیں؟"

"ماریہ کہاں ہے؟"

"لاؤنج میں ہے۔ سو رہی ہے۔"

"کیسا جا رہا ہے تمہارا ہنی مون ہائی سن؟"

"آپ کو بتایا تو تھا۔"

"ٹھیک ہے، خوب انجوائے کرو دونوں۔ ہماری طرح ہنی مون بھی شان دار ہی ہونا چاہیے۔"

انفی نامی انار کلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی لڑکی کو واقعی اب اٹھا کر ایک عجائب خانے میں رکھ دینا چاہیے تھا۔ اس جیسی لڑکیوں کو پنجرے بنا کر ان میں رکھ کر تالا لگا کر چابی گم کر دینی چاہیے۔ یہی ان کا اصل مقام ہے۔ اب وہ نظریں نہیں جھکا رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی اور اپنے ہونے والے سسر صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ اب وہ واقعی جنبش کرے گی تو ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو کر زمین کی آخری تہہ تک جا پہنچے گی۔ پیروں کی دھول بھی نہیں رہے گی۔

"عدن اپنے ہنی مون پر ہے ماریہ کے ساتھ۔ بچپن سے پسند کرتا تھا اسے۔ تمہیں نہیں بلایا اس نے شادی پر...؟" اس مونچھوں والے کو تو کسی تھیٹر میں کام کرنا چاہیے۔ اس نے کوئی جنبش نہ کی۔ نہ ہاں نہ ناں۔

غلام علی غلام کا جی چاہا کہ اب تو ضرور ہی اسے جا کر نیچ کریں۔ ایک انگلی سے ہی سہی۔ اور گر ہی لیں تو انہیں روکے گا کون؟ وہ اٹھے اور چل کر اسی صوفے پر آ بیٹھے جس پر وہ بیٹھی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو انفی کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ صدمے کا پہاڑ اس پر ٹوٹا تھا۔

"روتی کیوں ہو... ٹھیک ہو جائیں گی تمہاری امی۔" ذرا سا قریب ہوئے۔

بھرم ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ وہ رونے میں اور رواں ہو گئی۔

غلام علی غلام کا ہاتھ آگے بڑھا۔ سر پر پیار دینے کے لیے نہیں۔ گود میں رکھے ایک ہاتھ کو انہوں نے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ انفی رونے اور عدن کے صدمے میں اتنی مگن تھی کہ ذرا دیر میں چونکی۔

ہاتھ دو مردانہ ہاتھوں میں تھا۔ اچنبھے، حیرت اور سراسیمگی سے اس نے انہیں دیکھا اور لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ لڑکی سے عورت اور عورت سے سیانی بن گئی۔

عدن اپنی بیوی کے ساتھ ہے سنتے ہی وہ خود فراموش ہو گئی۔ وہ یہاں کیوں ہے۔ اس کا کام کیا ہے۔ حتیٰ کہ اماں کی بیماری بھی بھول گئی۔ اس لمحے میں اس پر بہت کرب ناک قیامت ٹوٹی۔ جیسے اس کے عین سر کے اوپر گرم سیال انڈیلا جا رہا ہے اور نیچے اس کے

ہاتھ' پاؤں بندھے پڑے ہیں۔ منہ کو سوئی دھاگے سے سی دیا گیا ہے۔ وہ مردانہ ہاتھوں میں ہاتھ کے آتے ہی وہ اس ساری کیفیت سے باہر آ گئی۔ لیکن اگلی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ قبر میں زندہ گاڑے جانے کی سی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ یہ سب اور ایسے۔ جیسے وہ سہہ رہی تھی۔ وہ اسے عورت سمجھ رہا تھا۔ صرف "عورت۔"

ذرا سے جھٹکے سے اس نے ہاتھ آزاد کروالیا۔ خوف زدہ اور بوکھلائے انداز میں اٹھی اور صرف دو قدم ہی چلی تھی۔

"پیسے نہیں چاہئیں؟" آواز میں لگاوٹ بھی تھی اور دھمکی بھی۔ دلار بھی تھا اور پچکار بھی۔

پیسوں کے نام پر اسے اماں یاد آ گئی۔ ان کی تکلیف یاد آ گئی۔ آنے والی ان کی موت یاد آ گئی۔ وہ رکی رہی قدم نہیں بڑھائے۔

"اپنی ماں کو مارو گی کیا؟" وہ اس کی پشت کی طرف صوفے پر بیٹھے بول رہے تھے۔

افق نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا کہ شاید یہ شخص وہ نہیں جو وہ سمجھ رہی ہے۔ شاید امیروں میں تسلی ایسے ہی دی جاتی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر گلے سے لگا کر۔ اس نے سوچا۔ وہ کم عقل ہے۔ یہ سب نہیں جانتی آخر کو وہ عدن کا باپ ہے۔ اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے ان کے بارے میں۔

دوسری طرف غلام علی غلام سوچ رہے تھے کہ لڑکی پیسوں سے تو شاید ہی قابو آئے۔ کم بخت مارے ان غریبوں میں عزت نفس بہت ہوتی ہے۔ عزت۔۔۔ عزت کو روتے پھرتے ہیں۔ چاہے ایڑیاں رگڑتے مر جائیں۔

"دھوکا دیا ہے نا عدنان نے تمہیں۔۔۔ ہے نا۔۔۔ تم جیسی معصوم سی پیاری سی لڑکی کا فائدہ اٹھایا ہے نا؟"

اتنی سی سچائی سے افق کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔

"میں جانتا ہوں اسے۔ بہت روکا بہت منع کیا۔ کالج میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ وعدہ کر چکا تھا۔ لیکن شادی اسے صرف ماریہ سے ہی کرنی تھی۔"

اسی کے باپ کے منہ سے عدن کے بارے میں ایسی حقیقت جان کر وہ دھواں دھواں ہو گئی۔

"تمہیں اس کے لیے رونے اور آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی۔" اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"یہ چیک لو اور اپنی ماں کی زندگی بچاؤ۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔"

افق نے ایک نظر گھنی مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ اس نے بے نام اشکوں کو پیچھے دھکیلا اور چار قدم کے فاصلے پر رکھی شیشے کی میز کی طرف بڑھ گئی۔ عدن کے دھوکے کے باوجود وہ اس کے باپ سے پیسے لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اس احسان کو لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچتی یا اپنی انا اور خودداری کے بارے میں؟

جیسے ہی وہ میز کی طرف جھکی دو ہاتھ اس کی پشت پر آ گئے۔

"خوش رکھوں گا تمہیں۔۔۔ اور تم۔۔۔"

اس کا وجود کانپ کر سمندر کے ریلے میں بہنے والا پتھر بن گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" چیک نیچے گر گیا۔ سب کچھ صاف اور واضح ہو گیا۔ مکمل تصویر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

"کیا کر رہا ہوں۔۔۔؟" کندھوں سے پکڑ کر اسے سیدھا اپنی طرف کیا۔ غرا کر کہا۔ "تمہیں نہیں پتا کیا کر رہا ہوں۔۔۔؟ بچی ہو۔۔۔ عدن کیا کرتا رہا ہے تمہارے ساتھ؟ اس سے زیادہ محبت دوں گا تمہیں۔"

یہ انداز' یہ الفاظ۔ افق کی ساری عزت بہہ کر اس کے پیروں میں آ گئی۔ عزت کا جانا کیسا۔ وہ تو اتنے پر ہی چلی گئی۔

"چھوڑ دیں مجھے۔۔۔" پہلی کوشش میں اس نے ڈر کر کہا۔ آواز بمشکل ہی نکلی۔ دونوں کندھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

"پاگل مت بنو لڑکی۔۔۔ سمجھ داری کا ثبوت دو۔ میں تمہیں دولت میں نہلا دوں گا۔"

اہانت پر افق کا جی چاہا کہ اس شخص کو آگ لگا کر جلا ڈالے۔ اس کی گردن نوچ لے۔

"چھوڑیں مجھے۔" وہ اتنی زور سے چلائی کہ آواز گھر کے آخری کونے تک گئی ہوگی۔ محمد بخش منقش دروازے کی اوٹ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کے منظر پر ایک نظر ڈالتے ہی سب سمجھ گیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چوکیدار کے پاس گیا۔

غلام علی غلام کا منہ اس کے منہ کے قریب آتا جا رہا تھا۔ وہ پشت کے بل میز پر جھک رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ غلام علی غلام کو خود سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہاتھوں میں سے دائیں ہاتھ کو اس نے اوپر اٹھا کر ایک زوردار تھپڑ غلام علی غلام کے منہ پر دے مارا۔ اب تک کی اپنی ساری قوت کو جمع کر کے۔

تھپڑ پڑتے ہی وہ باؤلے کتے کی طرح ہو گئے۔ اسے نیچے پٹخا۔

میز کے قریب۔۔۔ نیچے گرتے اس نے جھٹ میز پر رکھا شیشے کا گل دان اٹھا کر اسے دے مارا۔ گل دان بھی غلام علی کی ناک پر لگا۔ خون کی ایک لکیر سی نکلی۔ گل دان مارتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر میز کی دوسری طرف سے گھوم کر باہر بھاگی۔

"بخش۔۔۔ صوفی۔۔۔" ناک پر ہاتھ رکھے وہ دھاڑتے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ڈرائیور صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔ بخش خان کے ساتھ گیٹ کے پاس کھڑا رازداری سے باتیں کر رہا تھا۔ تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ خان کے ساتھ وہ جلدی جلدی کھسر پھسر کر رہا تھا اور اسے اندر کی صورت حال بتا رہا تھا۔

ابھی خان کے پاس آئے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ لڑکی پورچ سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ خان نے جھٹ چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ پیچھے غلام علی کی شکل نمودار ہوئی۔

"پکڑو اسے۔۔۔ بخش۔۔۔ چوکیدار۔۔۔ حرام زادہ! پکڑو اسے۔"

دونوں بوکھلائے منہ اٹھائے غلام علی کو دیکھنے لگے ناک پر ہاتھ رکھے وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

"کیا ہوا جناب آپ کو؟" بخش لپک کر اپنے صاحب کی طرف آیا۔ چوکیدار نے لڑکی کی طرف بھاگنے کا ڈراما کیا۔ جبکہ لڑکی بجلی کی طرح کھلے گیٹ سے نکل گئی۔

"کتے اس کے پیچھے بھاگ۔" غلام علی دھاڑا۔ بخش گیٹ سے نکلا۔ چوکیدار بھی نکلا۔ لڑکی سڑک پر دور جاتی نظر آئی۔

دونوں نے اس کے پیچھے بھاگنے کی مکمل اداکاری کی اور لڑکی دور سے دور ہوتی گئی۔ دونوں غلام علی کے ملازم تھے۔ اس کے غلام نہیں تھے۔ انسانیت رکھتے تھے۔ اپنے مالک سے تنخواہ لیتے تھے۔ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے ایمان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ مالک کی خصلت کو جانتے تھے۔ چوکیدار نے تو اس سے زیادہ ڈرامے دیکھے تھے۔ جب یہاں پانچ لڑکے رہتے تھے۔ جس وقت بخش جوس کا گلاس رکھ کر گیا تھا۔ وہ اسی وقت سے ذرا اوٹ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کوئی اپنی ہی مانگی دعا تھی جس نے افق کو بچا لیا تھا۔

کیا وہ واقعی بچ گئی۔ یا یہ وقت ہی طے کرے گا؟

ڈی۔ ایچ۔ اے کی کشادہ سڑک پر بھاگتے ہوئے اسے بہت شرم آئی۔ اس کی چادر اب اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ بالوں کی کئی لٹیں گردن اور پیشانی پر پھیل گئی تھیں۔ اس کا وجود بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ وہ ایک قدم تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اسے بھاگنا تھا۔ اپنی عزت کے لیے اسے بھاگنا تھا۔ سڑک پر قیمتی کاریں رواں دواں تھیں۔ سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ وہ بڑے بڑے پھاٹکوں اور بنگلوں کے آگے سے گزر رہی تھی۔ سانس اتنی پھول چکی تھی کہ اب دم ہی نکل جائے گا۔ بہت دیر تک ڈر کے بھاگتے بہت سی سڑکیں پار کرتے' وہ فٹ پاتھ نما جگہ پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ وہ وہاں اکیلی تھی۔ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

وہ اپنی عزت بچا کر وہاں سے نکلی تھی۔ نہیں۔ دراصل وہیں تو اس کی ساری عزت اتر گری تھی۔ عدن، جس سے وہ محبت کرتی رہی وہ اسے چھوڑ گیا اور اس کے باپ نے اس سے بڑھ کر کیا۔ آئندہ زندگی میں جتنے بھی دن وہ زندہ رہے گی کیا وہ اس طرح اپنا تار تار کیا جانا بھول جائے گی۔ اگر وہ دو دن بھی زندہ رہ پائی تو۔ اور پھر یہ زندہ رہنا نہیں ہوگا۔

افق کو بہت ترس آیا اپنی ماں پر۔ اپنے مرے ہوئے باپ پر جس کی اس جیسی بیٹی تھی۔ جسے اس طرح بھاگنا پڑا تھا۔ جسے اس طرح دھوکا دیا گیا تھا۔ جو اس جگہ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ جس کی چادر اتر گری تھی۔ جس پر صاف صاف سامنے سے حملہ کیا گیا تھا۔ جس کے سامنے پیسے پھینکے گئے تھے

تو یہ تھا وہ حسن جو اتنے غضب کا تھا کہ غضب ہی کر دیا تھا۔ حسن اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ لیکن آج تو وہ اپنا آپ دکھا ہی گیا۔ لیکن اگر وہ حسین نہ بھی ہوتی تو قریب قریب ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ کس کس بات کے لیے ماتم کرتی۔ اپنے لیے۔ اماں کے لیے یا ابھی جو ہوا اس کے لیے۔ اسے صرف ایک ہی چیز کے لیے ماتم کرنا چاہیے۔

اپنے "کم عقل" ہونے کے لیے

بہت دیر تک وہ وہاں ایسے ہی بیٹھی روتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اب وہ مر کر ہی گھر جائے۔ کاش! آج ہی قیامت کا دن آن پہنچے۔ حشر ہو۔ یوم حساب ہو اور وہ لوگوں کے گریبان پکڑے۔

"ہے (Hey)" آواز افق کے قریب ابھری۔ ساتھ ہی کندھے پر ہاتھ آیا۔ ڈر کر افق نے سر اٹھایا۔

"کیا ہوا؟" اس کی دھواں دھواں شکل پر نظر پڑتے ہی ایک ہاتھ میں کینوس بورڈ پکڑے لڑکی چونک گئی۔ لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ڈیر۔" سرخ بہتی آنکھوں سے افق نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی نے بیگ میں سے ٹشو نکال کر آگے کیا۔ افق نے ٹشو نہ پکڑا۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں صاف کیں۔

"بتاؤ نا۔ کیا ہوا۔ میں دس منٹ سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ وہ دیکھو۔ وہاں سے۔" لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کیا ایک طرف۔ افق سے ذرا سا دور اچھی سرخ گاڑی کی طرف۔ افق نے اٹھنا چاہا۔

"میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟"

افق نے نہ میں سر ہلایا۔ دنیا کا پتھر دل انسان بھی اس وقت اسے دیکھ لیتا تو موم ہو جاتا۔ کینوس بورڈ پکڑے اس لڑکی کو بھی بہت ترس آیا۔

افق اٹھ کر چند قدم آگے چلی۔ لڑکی نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آؤ! میرے ساتھ۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" لڑکی نے ہاتھ نہ چھوڑا اور ساتھ لے کر کار تک آ گئی۔ قطار در قطار وہاں کئی کاریں کھڑی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ پلیز۔" لڑکی نے دروازہ کھولا۔ افق ہونق بنی لڑکی کی طرف دیکھے گئی اور پھر بیٹھ گئی۔

لڑکی نے کار اسٹارٹ نہ کی۔ "اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

افق نے لڑکی کی طرف الجھ کر دیکھا۔ کیا بتائے کیسے اور کیوں۔؟

"نام کیا ہے تمہارا۔؟" لڑکی بہت پیار سے بول رہی تھی۔ اس کی آواز اور انداز دونوں ہی نرم تھے۔

"افق!" اس نے آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کر کے بتایا۔

"افق! وہاں ایسے بیٹھی کیوں رو رہی تھیں؟ بتاؤ مجھے۔ ہو سکتا ہے، میں کچھ کر سکوں۔ کچھ ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" افق چپ بیٹھی رہی۔

"جب تک تم بتاؤ گی نہیں۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"اماں مر رہی ہیں۔" وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ عدن اور اس کے باپ کا نام بھی زبان پر لانا اس نے حرام جانا۔

"ہسپتال میں ہیں وہ؟"

نفی میں سر ہلایا۔ "گھر میں ہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" نئے سرے سے اس کی ہچکی بندھی۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔" لڑکی نے کار اسٹارٹ کی۔ اس نے گھر کا پتا بتایا۔ لڑکی نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں دی۔ ٹشو ہاتھ میں پکڑائے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا اسے تسلی دیتی رہی۔

"بہت بیمار ہیں وہ؟"

"جی۔ اگر ان کی سرجری نہ ہوئی تو وہ مر جائیں گی۔"

"تم ایسے مت روؤ پلیز۔ ان کی سرجری بھی ہو جائے گی۔ بی بریو (بہادر بنو)۔" ساتھ ساتھ وہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے تھپکی دیتی رہی۔ اماں کی بیماری کی نوعیت پوچھتی رہی۔

کار پارک کر کے وہ افق کے ساتھ اس کے گھر آ گئی۔ افق نے لڑکی کو پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ وہ اماں کو اس کے رونے اور اس جگہ بیٹھنے کے بارے میں مت بتائے۔ اماں دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ بھابھی کو بھی مل گئی تھی "گا ہے بگا ہے انہیں آکر دیکھتے رہنے کا۔" لڑکی پورا پرس لے کر چلی گئی۔

جس جگہ افق بیٹھی رو رہی تھی وہ ایک پرائیویٹ گورنمنٹ کالج کی پارکنگ تھی۔ وہاں رش نہیں تھا۔ کاریں اس سے ذرا سے فاصلے پر پارک تھیں۔

حالت میں لڑکی جس کا نام وانیہ تھا۔ اپنی دو دوستوں کے ساتھ آئی۔ باہر ان کا ڈرائیور بھی تھا۔ انہیں ڈرائیور کے ساتھ جانا تھا اور ہر طرح کے اخراجات کے لیے وہ ڈرائیور سے کہہ سکتی تھی۔ وہ تین دن میں کر افق کی اماں کی سرجری کروا رہی تھیں۔

یہ ان کے لیے آسمان سے اتاری گئی امداد تھی یا نیکی، یہ خوشی کی تھی لیکن افق اندر تک اللہ کی مشکور تھی۔ ماں اس جیسی گناہ گار پر یہ بہت بڑا کرم تھا۔

اماں کے ساتھ افق اسلام آباد آ گئی۔ بھابھی کا بھائی وہاں ان کے لیے موجود تھا۔ اسد اور جمال بھابھی کے گھر کھیلنے گئے۔ نئے سرے سے اماں کے ٹیسٹ ہسپتال کے۔ انہیں چیک کیا گیا اور پھر بائی پاس سرجری کا دن آ گیا۔

اگر وانیہ جیسا کوئی اس کا رشتے دار ہوتا۔ اگر وانیہ جیسا اس کے پاس کوئی اور ہوتا تو اس دن اس کی انا اور عزت کا کٹورا ایسے خالی نہ ہوتا۔ امن نامی انسان کو لے کر وہ اندر ہی اندر بہت گھٹی۔ راتوں کو چھپ چھپ کر وہ بہت روئی۔ اپنا ہی منہ نوچ لینے کو اس کا جی چاہتا۔ خود کو مار لینے کا۔

ان کی اماں نے زندگی میں انہیں بہت سے سبق یاد کروائے تھے۔ محنت کرنے کے، نہ رونے کے، حوصلہ رکھنے کے، کسی سے کوئی امید نہ رکھنے کے، خودداری کے، وفاداری، زندگی کے سامنے ڈٹے رہنے کے۔ دنیا کو پرکھنے کا کوئی سبق وہ نہیں دے سکی تھیں۔ بھیڑیوں کی بھیڑ میں انسانوں کی شناخت کا اور انسانوں کی بھیڑ میں شیطانوں کی۔

"عورت جانتی کم اور سمجھتی زیادہ ہے۔"

یہ مقولہ ایک بڑی حقیقت ہے۔ لیکن عورت کو اس مقولے کو ہرا دینا چاہیے۔

"عورت جانتی زیادہ اور ہارتی کم ہے۔"

معاشی میدان میں انہوں نے بھوک کو ہرا دیا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بھوک پیٹ سے مارتی ہے اور انسان روح سے۔ جن انسانوں کی روحیں دوسرے انسانوں کے ہاتھوں مرتی ہیں ان انسانوں کو بڑی کرب ناک سزائیں ملتی ہیں۔ اندر ہی اندر۔ گھٹی گھٹی۔ چھپی چھپی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے تمہیں پروپوز نہیں کیا تھا۔ تم نے مجھے کیا تھا۔" فرزام نے یاد دلایا۔

"میں نے انکار نہیں کیا۔" دونوں کندھے اچکائے گئے۔

"اب جب میں تمہارے بغیر نہیں رہنا چاہتا تو تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"کیا۔؟ میں نے کچھ کیا؟" بالوں کو جھٹک کر پوچھا گیا۔

"کیا وہ سب میرے دوست تھے۔ کیا ڈرگ کا چارج مجھ پر لگا۔ کیا پولیس مجھے لے گئی۔ تم جانتے ہو کہ کالج میں کتنی باتیں ہو رہی ہیں؟" رومی نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"تم وہ سب باتیں سن رہی ہو اور مجھے نہیں۔۔۔؟"

"سن تو لیا تمہیں۔" وہ جھلا گئی۔

"اتنی سی بات پر تم ہمارا رشتہ توڑ رہی ہو؟"

"اوہ۔۔۔ تو یہ اتنی سی بات ہے۔" واہ واہ کا انداز۔

"یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔" مضبوط انداز میں جتایا گیا۔

"ایسی ہی سوچ تمہیں یہاں تک لے آئی ہے۔" وہ چڑ گئی۔

"یعنی سوچ۔۔۔؟" وہ برا مان گیا۔ پچھلے دو دن سے وہ سب کی باتوں کا برا ہی مان رہا تھا۔ لیکن کسی کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

"تم اس سب کو چھوڑو۔ کیا تم میرے بغیر رہ لوگی؟" اسے لگا یہ سوال بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس ہتھیار سے وہ ضرور گھائل ہو جائے گی۔

"کچھ فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔" کندھے پھر اچکے۔

"مجھے چھوڑنے کا فیصلہ؟" ہتھیار کا وار خالی گیا۔

وہ چپ رہی۔

"تم تو خاصے سمجھ دار ہو تم۔۔۔ اچھی بھلی زندگی کو تم نے الٹا دیا۔ اب تم کیا چاہتے ہو اس الٹ پلٹ میں میں تمہارا ساتھ دوں؟" خاموشی کے وقفے کے بعد وہ پھر اپنا پوائنٹ واضح کرنے لگی۔ "تم اب برطانیہ میں رہ نہیں سکتے۔ اگلے پانچ سال تک آ بھی نہیں سکتے۔ کیا میں پانچ سال تمہارا انتظار کروں؟ اور پانچ سال بعد تم صرف اپلائی کر سکتے ہو۔ اس کی بھی گارنٹی نہیں ہے کہ تم یہاں دوبارہ آ ہی جاؤ گے۔"

"تمہیں انتظار کرنے کے لیے کس نے کہا۔ تم تعلیم مکمل کرتے ہی پاکستان آ جانا یا ان سالوں میں ہمیں کسی اور ملک کے لیے اپلائی کروں گا۔ ہم وہاں رہ لیں گے۔"

"تم اپنی پلاننگ خود کرو۔۔۔ پلیز۔"

"یعنی تم میری پلاننگ کا حصہ نہیں بننا چاہتیں؟"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔" منہ بگاڑ کر کہا۔

"جب تم نے محبت کے لیے سوال کیا تھا تو میں نے جواب نہیں دیا تھا؟"

"وہ تمہاری مرضی تھی۔" منہ کا زاویہ ویسا ہی تھا۔

"پھر تم نے منگنی کے لیے کہا۔" اس نے میز پر مکا مارا۔

"تم انکار کر دیتے۔" اس نے ہاتھ لہرا کر گود میں رکھ لیا۔ وہ سر اٹیبل پر رہا۔

"میں انکار اس وقت کرتا جب مجھے تم سے لگاؤ نہ ہوتا۔ یہ سب تم بھابھی کے کہنے پر کر رہی ہو نا؟"

"میں فیڈر نہیں پیتی۔" مزاج اور انداز مزید بگڑ گیا۔

"رومی پلیز۔" اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ ارادہ بھانپ کر رومیہ نے یہ ہاتھ بھی میز پر سے پرے کر لیا۔

"رنگ میں تمہیں دے چکی ہوں فرزام! فیصلہ بھی کر چکی ہوں۔ تمہیں پسند بھی خود ہی کیا تھا۔ اب اپنا فیصلہ بھی خود ہی بدل رہی ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" پھر وہی محبت کا ہتھیار۔

"تم میرا اور وقت ضائع نہیں کر سکتے۔" بیگ اٹھا کر وہ چلی گئی۔

"رومی۔۔۔ رومی۔۔۔ رکو۔۔۔" کی آوازیں اس کے تعاقب میں گئیں۔ لیکن رومی تیزی سے سڑک پار کر کے ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور وہ واپس پلٹ کر سڑک کے ایک طرف بنے اوپن ٹی کارنر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ برطانیہ کے شہر لیڈز کی ایک پر رونق سڑک پر واقع ٹی کارنر ہے۔ یہاں دنیا میں پائی جانے والی مختلف قسموں کی مختلف ذائقوں کی چائے باآسانی مل جاتی ہیں اور یہ سب ذائقے رومی کو ہی پسند تھے۔

رومی نامی لڑکی جا چکی ہے۔

فرزام نام کا لڑکا مایوس بیٹھا ہے۔ سامنے رکھی

[illegible] ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ٹھنڈ لیڈز میں بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ دو دن پہلے اس کی ماما نے لسے انگوٹھی بھیجتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ رومی لوٹا گئی ہے۔"

انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ زیادہ وقت پاکستان میں گزارا تھا تو دھوم دھام سے پہنائی گئی منگنی کی انگوٹھی کے اس طرح واپس آنے پر گم گشتہ ہو گیا۔

"یہ کیا مذاق ہو بھلا۔"

"بھابھی سے پوچھ لو فرزام۔" وہ شاید بھابھی سے پوچھ چکی تھیں۔ اسی لیے آبدیدہ نظر آ رہی تھیں۔

اس نے بھابھی کو فون کیا۔ جسے اٹھایا ہی نہ گیا۔ پھر رومی کو فون کیا۔ وہ بھی نہ اٹھایا گیا۔ وہ بھابھی کے گھر گیا جو اس کے فلیٹ سے پندرہ منٹ کی دوری پر تھا۔

"یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ منگنی ہوتے ہی اس انتظار میں تھیں کہ وہ ٹوٹے اور وہ فرزام کو یہ سب کہہ سکیں۔

"آپ کو اس سے بات کرنی چاہیے۔۔۔ بھابھی وہ تو میرا فون بھی نہیں اٹھا رہی۔"

"بچی نہیں ہے وہ۔ کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہو گا [illegible]"

"ان پندرہ دنوں میں آخر ایسا کیا ہو گیا کہ اسے یہ سب کرنا پڑا۔۔۔؟"

"تم اسی سے پوچھو۔" ایسے کہا انہوں نے کہ مجھ کو اور میری بہن کی جان چھوڑو۔

فرزام رومی کے گھر گیا۔ وہ گھر پر نہیں ملی۔ اس کی [illegible] سے باہر نہیں نکلیں۔

[illegible] گھنٹہ انتظار کر کے وہ آ گیا۔

[illegible] فون کرتا رہا۔ لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ [illegible] چھوڑے اس کے لیے 'وائس [illegible] الگ بھیج دلتے گئے اس کا ایک جواب آیا۔

"its over now/Don't disturbe me"

(سب ختم ہو چکا ہے۔۔۔ مجھے پریشان مت کرو)

اس نے فوراً "کال بیک کی۔ وہ اس سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک ان میں بحث ہوتی رہی۔ وہ منگنی ختم کر چکی تھی اور اس کے ڈیڈ بھی اب اسے منا نہیں سکتے تھے تو وہ کیا چیز تھا۔

پندرہ دن پہلے وہ اپنے چار دوستوں دو برطانوی 'ایک برازیلین اور ایک جاپانی کے ساتھ منشیات کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ اکثر اپنے ان دوستوں کے پاس ہاسٹل چلا جاتا تھا۔ شام کو وہ ان کے روم میں بیٹھا تھا۔ جب انہیں گرفتار کیا گیا۔

وہ منشیات کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ اتنا ضرور جانتا تھا ان میں سے تین بھی کبھار اسے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب انہیں گرفتار کیا گیا تو فرزام کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے ایجنٹ بھی تھے۔ گرفتار کر کے سب کو کیا گیا۔ پندرہ دن کی تفتیش بھگت کر وہ آ گیا۔ کالج سے سب کا نام خارج کر دیا گیا اور اس پر جرم ثابت نہ ہونے کے باوجود اس کے کاغذات پر اسٹمپ لگا دی گئی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر اندر برطانیہ چھوڑ دینا تھا اور اگلے پانچ سال تک وہ دوبارہ نہیں آ سکتا تھا۔

مصیبت اچانک ہی آئی ہے اور یہ سب اچانک ہی ہوا۔ اس کا گرفتار ہونا' کالج سے نکال دیا جانا' برطانیہ سے بھی نکال دیا جانا' بہت تکلیف دہ تھا یہ سب۔ لیکن اس سے زیادہ تکلیف دہ کچھ اور تھا۔

"رومی" کا رنگ واپس کرنا' اس کا ایک ہی موقف تھا کہ وہ مجرم ہی ہے۔ ڈرگز سپلائی کرتا ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے دوست یہ کام کریں اور اسے معلوم نہ ہو۔ اسے واقعی معلوم نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تو وہ اتنی بڑی مصیبت میں خود کو پھنسنے دیتا۔

"ایک چھوٹے سے حادثے سے تم مجھ سے اتنی دور ہو گئیں رومی۔۔۔؟" جو کچھ ہو رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اتنی جلدی اس کی زندگی اتنی تلخ ہو گئی۔

"تمہاری اصلیت سامنے آ گئی۔"

"اگر یہ میری اصلیت ہوتی تو کیا میں صرف پندرہ

دلہن بعد باہر ہوتا۔ کیا وہ مجھے ایسے چھوڑ دیتے؟"

"تمہیں کالج سے ایسے ہی نہیں نکالا گیا۔"

"کالج نے اپنی ساکھ کے لیے یہ کیا۔"

"میں اپنی ساکھ کے لیے کر رہی ہوں۔"

رومی نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اسے سن کر بھی وہ اس سے ملنے کے لیے بار بار کہنے لگا۔

دو دن بعد وہ اسے ملی اور اپنی مرضی کا فیصلہ سنا کر چلی گئی۔ جس شخص کا مستقبل پہلے روشن تھا، اب وہ تاریک ہو چکا تھا، جو انسان پہلے اچھا لگ رہا تھا، وہ اب برا لگ رہا تھا۔ اسے اٹھارہ دن پہلے وہ اس کے ساتھ مووی دیکھنے سینما گئی تھی اور اٹھارہ دن بعد وہ اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے! تعلقات ٹوٹ ہی جاتے ہیں، لیکن اس طرح۔ ایک دم سے۔ کیا تعلق توڑنے کے لیے لوگ اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں؟ جاپانی الیکٹرک ٹرین سے بھی زیادہ...؟

وہ چھٹی جماعت میں تھا جب یہاں آیا تھا۔ اس کا بڑا بھائی احمر ایف ایس سی کرتے ہی برطانیہ آگیا تھا، وہ اسٹوڈنٹ ویزے پر آیا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے آتے ہی ایک پاکستانی ہوٹل میں اچھی جاب مل گئی تھی اور پھر اسے اپنی ہونے والی بیوی تانیہ مل گئی کالج میں۔

احمر کی جاب اچھی تھی۔ اس نے صرف ایک سال کی کورٹ شپ کے دوران ہی تانیہ سے شادی کرلی۔ دونوں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ پاکستان میں احمر کسی غریب خاندان سے نہیں آیا تھا۔ اس کی ماما کنڈز گارمنٹس کا ایک اسٹور چلاتی تھیں۔ گلبرگ میں ان کی ایک کوٹھی تھی۔ کار تھی۔ تھوڑا بہت بینک بیلنس تھا۔ احمر کے برطانیہ آنے سے چھ ماہ پیشتر ان کے ڈیڈ کی وفات ہو چکی تھی۔

صرف ڈیڑھ سال میں ہی احمر نے ماما اور فرزام کو برطانیہ بلوالیا۔ وہ برطانیہ میں اپنا بزنس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے پیسے چاہیے تھے۔ اس نے ماما کو راضی کرلیا کہ وہ سب کچھ بیچ کر یہاں اس کے پاس آجائیں۔ وہ مل کر ایک جگہ رہ بھی لیں گے اور وہ کاروبار بھی کرلے گا۔ ماما نے سب کچھ بیچ کر پیسے اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس نے اپنے سسرال والے کے ساتھ مل کر ٹریولنگ ایجنسی کھول لی۔ فرزام نے اسکول میں ایڈمیشن لے لیا اور وہ اور ماما احمر کے ارینج کیے گئے ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔

یہاں تک سب ٹھیک تھا۔ احمر ماما کو ہر ماہ ایک بھلا رقم دے دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی اس کا کاروبار سیٹ نہیں ہوئے۔ پھر وہ اپنی بیوی کے ساتھ دو کمرے کے فلیٹ سے ایک بڑے اور کشادہ فلیٹ میں شفٹ ہو گیا۔ اس پر اس کا کہنا تھا کہ یہ فلیٹ تانیہ کے گھر والوں کی طرف سے تانیہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ ان کی ماں مسز گوہر پاکستان میں اپنا چلتا ہوا کام چھوڑ کر آئی تھیں۔ صرف اپنے دونوں بیٹوں کے مستقبل کے لیے۔ اپنے بیٹے احمر کی خوشی کے لیے۔ ورنہ انہیں اپنے کام سے بہت لگاؤ تھا۔ احمر نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ انہیں ویسا ہی کاروبار یہاں کروا دے گا۔ حالات ٹھیک ہو رہے تھے۔ لیکن صرف احمر اور تانیہ کے۔ دونوں نے الگ الگ کاریں لے لی تھیں۔ ان کے گھر کی سجاوٹ دیکھنے لائق تھی۔ ان کے شاپنگ بلز دیکھنے کے لائق تھے۔

ایک کاروباری عورت کو یہ سب باتیں سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن اب وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں۔ پاکستان میں کچھ بچا نہیں تھا۔ یہاں اثاثے کے نام پر ان کے پاس صرف فرزام تھا اور فرزام چھوٹا تھا وہ اسے یہ سب باتیں بتا کر احمر سے باغی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ فرزام اپنی ڈگری مکمل کرلے اور ایک جاب حاصل کرلے۔ ابھی فی الحال احمر ہی اس کے سب اخراجات پورے کر رہا تھا۔ وہ احمر سے کوئی بھی بات کر کے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جتنے پیسے احمر انہیں دیتا وہ پیسے وہ خاموشی سے رکھ لیتیں۔

پاکستان میں وہ ایک فعال زندگی کی مالک تھیں۔ یہاں فی الحال وہ چند کورسز کر رہی تھیں۔ وقت کا نبض پر ہاتھ تھا۔ جانتی تھیں۔ کسی بھی وقت خود کمانے کی نوبت آسکتی ہے۔ بیٹے، بہو اور ان کے درمیان ایک بھرم کا پردہ تھا۔ کسی بھی وقت پردہ چاک ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سب میں ایک گڑبڑ ہو گئی، تانیہ کے لیے۔ تانیہ کی چھوٹی بہن رومیہ، فرزام کی دوست بنی۔ پھر کالج میں بھی ساتھ ہو گئے۔ رومی، فرزام کے ساتھ بہت خوش ہوتی تھی۔ تانیہ یہ سب پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے میاں کے بھائی کو اپنے میاں کے سیٹ کیے گئے کاروبار میں حصہ دار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اگر رومی اور فرزام میں رشتہ استوار ہو جاتا تو اس کی ذہین و فطین بہن ضرور اس کاروبار میں سے فرزام کا حصہ نکلوا لیتی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی اپنا حامی بنالیا۔ لیکن رومی نے کسی کی نہیں سنی اور فرزام سے منگنی کروا کر ہی چین لیا۔

منگنی سے پہلے تانیہ کے پاس کوئی ایسی ٹھوس وجہ نہیں تھی جو وہ اپنی بہن کو بتاتی اور وہ فرزام سے دور رہتی۔ لیکن فرزام کے پکڑے جانے اور برطانیہ میں اس کی موجودگی پر پابندی سے اس کے ہاتھ بہت کچھ آگیا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنی بہن کا ذہن صاف کر دیا تھا۔

کالج میں ان دونوں کے مشترکہ دوست طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ چھوٹی سی خبر تھی۔ اخبار میں بھی آئی۔ مقامی ٹی وی چینل پر بھی۔ کالج میں ہر کسی نے اس بارے میں باتیں کی تو فرزام کے ساتھ پکنک پکنک کھیلنے والی اس کے چٹکلوں پر ہنسنے والی اس چھ فٹ کے لمبے خوب صورت ہینڈسم کے ساتھ فخر سے چلنے والی رومی ریشمی کی ہلکی سی گرم ہوا برداشت نہیں کر سکی۔ جو باتیں لوگ کہتی تھیں، وہ اب فرزام کے متعلق باتیں بنانے لگی تھیں۔ اس کی بہن اور گھر والے الگ اکسا رہے تھے۔ ساری جمع تفریق کر کے اس نے انگوٹھی اتار کر اس کی ماں کے ہاتھ میں دی۔ برطانیہ میں ہی تو فرزام کا مستقبل تھا۔ لیکن پاکستان میں کیا تھا۔ کسی دوسرے ملک میں قدم جمانے کے لیے نئے سرے سے محنت اور مشقت درکار ہوگی اور اسے اس لفظ مشقت سے چڑ تھی۔

"ماما! یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا؟" وہ مسز گوہر کی گود میں سر رکھ کر لیٹا، رو دینے کے قریب تھا۔

"شاید کسی اچھے کے لیے۔" مسز گوہر اچھا اچھا ہی سوچتی تھیں۔

"اس میں کیا اچھا ہے۔ ہر بار ایک ہی فلسفہ۔ جب میں یہاں نہیں آنا چاہتا تھا، آپ مجھے زبردستی یہاں لے آئیں اور اب میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تو پوری کی پوری حکومت ہی مجھے نکال باہر کر رہی ہے۔ یہ کون سی قوت ہے ماما! جس نے حکومت کو یہ حرکت دے دی کہ نکالو اس فرزام کو یہاں سے۔ اور پھر آپ کا یہ فلسفہ۔ کچھ اچھا نہیں ہے اس میں۔ کچھ بھی۔"

"یہ تمہیں آنے والے وقت میں طے کرنا ہے فرزام!"

"آپ ہمیشہ ایسے ہی سوچتی ہیں۔"

"بری سوچ تو نہیں ہے یہ...؟"

"کچھ ایسی فائدہ مند بھی نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ رومی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے۔"

"آنے والے وقت میں شاید وہ سمجھ جائے۔"

"شاید۔ کاش! ایسا ہی ہو۔"

"تم اسے بہت پسند کرتے ہو؟"

"صرف اسے ماما!"

"تمہیں اس میں کیا پسند ہے بیٹا؟"

مسز گوہر نے ہمیشہ اپنے دونوں بیٹوں کی پسند کو ہی پسند کیا تھا۔ تانیہ کی بار بھی احمر نے صرف ایک تصویر بھیج دی تھی اور فون پر بات کروا کر اپنی شادی کی تاریخ بتا دی تھی اور انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی تھی۔

"تمہیں اس میں کیا پسند ہے؟"

یہ سوال وہ پہلی بار فرزام کی کسی بھی پسند کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ اب انہیں لگتا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کی پسند پر مسکرا کر "ہاں" نہیں کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ انہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ جن چیزوں کو، لوگوں کو وہ پسند کر رہے ہیں، وہ پسند کیے جانے کے لائق بھی ہیں یا نہیں۔ چیزوں کی تو خیر ہے بدلی جا سکتی ہیں، حتیٰ کہ

جاسکتی ہیں۔ لیکن لوگوں کا کیا جائے ان کے بیٹے نے ثانیہ پسند کرلی۔ برطانیہ میں ہمیشہ کے لیے رہنا پسند کرلیا اور اس کا نقصان ابھی تو نہیں ہورہا تھا۔ آنے والے وقت میں شاید اسے بھی ہو۔

"یہ کیسا سوال ہے مام! بس وہ مجھے پسند ہے۔"

"تم اپنے جوتے 'کپڑے' موبائل 'لیپ ٹاپ اور ایسی ہی دوسری چیزیں کوالٹی دیکھ کر لیتے ہونا؟ تو چیزوں میں کوالٹی' ساخت اور انسانوں میں۔۔۔ تم نے اپنے دوست بناتے وقت بھی یہی غلطی کی اور اس غلطی کی تمہیں اتنی بڑی سزا ملی۔ خود کے ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ خود کے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔"

"محبت میں یہ سب نہیں دیکھا جاتا ماما۔۔۔ یہ خوبی۔۔۔ یہ خامی۔۔۔ یہ سب محبت میں نہیں چلتا۔"

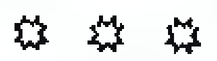
انہوں نے پیشانی پر پیار کیا۔ "میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری ہر خوبی اور خامی کو تسلیم کرتی ہوں۔ رومی کا کہنا بھی یہی تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ پھر اس نے صرف تمہاری خوبیاں ہی کیوں قبول کیں؟ اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ وہ تمہارے ساتھ خوشی میں رہی اور دکھ 'پریشانی میں چھوڑ گئی۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور چونکنے کی کیفیت لیے انہیں دیکھنے لگا۔ جیسے بچے چونک جاتے ہیں "آسمان پر تو کوئی بڑھیا نہیں۔"

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اس برے وقت کا۔ یہ وقت تمہیں بہت کچھ بتارہا ہے فرزام! جو وقت جارہا ہے اسے سنو۔ وقت کبھی برا نہیں ہوتا۔ ہاں انسان بہت برا ہوتا ہے۔ وقت تو بہت اچھی کتاب ہے۔ اسے پڑھو۔ سمجھو۔"

صوفے پر اسے سوچنے کے لیے چھوڑ کر وہ کوٹ پہننے لگیں۔

"میں احمر کی طرف جارہی ہوں۔ تم کھانا کھا کر اپنی پیکنگ دیکھ لینا۔ شاید مجھے آنے میں دیر ہوجائے۔"



"وہ یہاں سے جارہا ہے۔ تم اسے اس کا حصہ دے دو۔"

"کون سا حصہ؟ وہ جو اتنے سال یہاں رہا ہے۔ میں نے اس کے اخراجات پورے کیے۔ اس کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھائی۔" اپنی ماں کے اس مطالبے پر اسے بہت غصہ آیا۔ ابھی ثانیہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔

"احمر۔۔۔! اگر میں حساب کتاب کرنے لگی تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس کے باپ کی پراپرٹی میں اس کا حصہ بھی تھا۔ تمہارے برابر۔ سب میں نے تمہارے حوالے کردیا۔ غلط کیا۔ اس کے حصے کے پیسوں کا منافع صرف تم نے استعمال کیا اور میرے ہاتھ پر تم صرف چند ہزار پونڈز رکھتے رہے۔" بھرم کا پردہ مسز گوہر نے چاک کیا اور صاف صاف حساب پر آگئیں۔ فرزام کے ساتھ وہ زیادتی کیسے ہونے دیتیں۔

"اس پیسے سے کاروبار میں نے شروع کیا۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام میں نے کیا ہے اور آپ دونوں کو میں بہت پیسے دیتا رہا ہوں۔ اتنا تو کما کر دیا ہے میں نے ماما! آپ ایسے کیسے حساب اور حصے پر اتر آئیں؟ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنے سالوں سے کتنی محنت کررہا ہوں؟" احمر کو پہلے سے ہی خدشہ تھا کہ ماما ایسا کچھ کہیں گی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اب تم صرف یہ کرو کہ جو میرا چوتھائی حصہ ہے۔ وہ تم اپنے پاس رکھو۔ تم فرزام کو اس کے حصے کے پیسے دے دو۔ تم اسی قدر دے دو جتنے تمہیں ملے تھے۔" وہ تحمل سے بولیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بات کرنے کی دیر ہوگی اور وہ چیخنے چلانے پر آجائے گا۔ واویلا کرے گا اور وہ یہی نہیں چاہتی تھیں۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں ماما! آپ صرف اسی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ میری محنت آپ کو نظر نہیں آرہی۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا آپ دونوں کے لیے۔"

"میں نے تمہاری ہر بات مانی احمر۔۔۔! اپنا کاروبار تک تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ سب کچھ بیچ دیا۔"

"تو کیا میں نے آپ کو یہاں نہیں بلایا؟ آپ کے اخراجات نہیں پورے کیے؟ آپ کا خیال نہیں رکھا؟"

"احمر۔۔۔!" انہوں نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ "صرف فرزام اور اپنے حصے کا پیسہ میں کسی بھی بزنس میں لگادیتی تو مجھے اس سے کئی گنا زیادہ منافع ملتا جو تم مجھے دیتے تھے اور میں کسی بھی وقت اپنا پیسہ واپس نکال سکتی تھی۔ فرزام کے ساتھ میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں اس کے حصے کے پیسے واپس کرنے پڑیں گے۔"

"اور جو رات دن میں محنت کرتا رہا ہوں؟"

"اس رات دن کی محنت کا پھل تم نے خوب کھایا ہے۔" انہوں نے گھور کر ایک نظر دوڑائی۔ اس بات اور انداز پر احمر تلملا کر رہ گیا۔

"کون سے پیسے اور کیسے پیسے؟" ثانیہ زیادہ دیر تک اس گفتگو سے الگ نہیں رہ سکی۔

"ہم دونوں بات کررہے ہیں۔" مسز گوہر نے سختی سے کہا اور ثانیہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"آپ پوچھ لیں احمر! ماما سے کہ یہ کن پیسوں کی بات کررہی ہیں۔ ایسے ہی اتنی لمبی گفتگو میں اپنا وقت ضائع کررہے ہیں۔" وہ صاف صاف جتا رہی تھی کہ رقم دی تھی؟ اچھا! تو کوئی ثبوت ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے کیا ہے۔ کیا ثابت کروگے؟

احمر نے اپنی ماں اور سویٹ ہارٹ کی طرف دیکھا۔ سویٹ ہارٹ کا پیش کیا گیا خیال اسے پسند آیا۔

"ماما! آپ کن پیسوں کی بات کررہی ہیں؟"

"احمر۔۔۔!" مسز گوہر کو یقین نہیں آیا۔

"ثانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے ماما!"

ثانیہ نے اپنی ساس کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "اور کچھ ماما جی؟"

"تم ایسے نہیں کرسکتے۔" اتنا کہتے ان کی آواز کانپ گئی۔ پیسے دینے میں تامل کرے گا' ان کا خیال تھا مگر وہ تو صاف مکر ہی رہا تھا۔

"آپ اس لفنگے کی اتنی حمایت کیوں کررہی ہیں؟"

مسز گوہر نے بے یقینی سے اپنے پڑھے لکھے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی یہ الفاظ لاؤنج کی طرف آتے فرزام نے بھی سنے۔ وہ ماما کو لینے کے لیے آیا تھا۔ اکیلے کھانا کھانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ماما کو لے کر وہ باہر کہیں جاکر کھانا چاہتا تھا۔

"اپنے بھائی کو لفنگا کہہ رہے ہو؟" سب باتوں سے بڑھ کر انہیں اس بات کا زیادہ صدمہ ہوا۔

"تو جیل میں کون لوگ جاتے ہیں۔ کالج سے کن کو نکالا جاتا ہے۔ اس کا تو ویزا بھی منسوخ کردیا گیا ہے۔ اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں بدمعاش لوگوں کی؟"

"بدمعاش لوگوں کی کچھ اور نشانیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کے مال ہضم کرجاتے ہیں۔"

"ماما پلیز! آپ جائیں یہاں سے۔" احمر نے اتنے ہتک آمیز لہجے میں کہا کہ مسز گوہر کو چکر آگئے۔ فرزام لپک کر اپنی ماں کے پاس آیا۔

"یہ کیسے بات کررہے ہیں آپ ماما سے؟" دونوں بھائیوں نے کبھی ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ فرزام کی آواز یہ کہتے کافی بلند ہوگئی۔

"یہ تم مجھ سے کس طرح بات کررہے ہو؟"

"اس سے اچھے انداز میں ہی بات کی ہے جس انداز میں آپ نے ماں سے کی۔"

مسز گوہر اٹھیں۔ فرزام کا ہاتھ پکڑا۔

"چلو فرزام! یہ میرے اور احمر کے درمیان کی بات ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ کبھی بھی نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بھائی آمنے سامنے آئیں۔

"آپ کی آپس کی بات میں یہ مجھے بدمعاش کہہ رہے تھے۔"

"تو سچ ہی تو کہا ہے احمر نے۔" احمر کی سویٹ ہارٹ بولی۔

ان سب کے تعلقات اس نوعیت پر پہنچ چکے ہیں۔ اس کا اندازہ فرزام کو اپنے اکلوتے بھائی کے انداز سے اب ہورہا تھا۔ ٹھیک ہے لمحوں میں حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن یہ رشتوں' پیاروں اور لوگوں کو کیا ہوجاتا

ہے کہ وہ لمحوں کا وقت بھی نہیں لیتے بدلنے میں۔ مسز گوہر کو تانیہ کی یہ بات آگ لگا گئی۔

"ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے نا تمہارے خاندان والے؟ فرزام کے پیسوں سے ایک بڑا گھر انہیں بھی نصیب ہو گیا۔"

تانیہ کا منہ ایسے سرخ ہو گیا۔ جیسے دائیں بائیں گال پر زور زور سے تین چار تھپڑ لگے ہوں۔

"فرزام کے پیسے... مائی فٹ... اوقات ہے اس کی اتنی؟ اب تک تو اپنے بھائی کے پیسوں پر پل رہا ہے۔"

"اب تک تم اس کے پیسوں پر پل رہی ہو اور دوسروں کو بھی پال رہی ہو۔"

مسز گوہر اب پیچھے ہٹنے والی نہیں تھیں۔ فرزام کو ان پیسوں کے معاملات کے بارے میں نہیں معلوم تھا اب تک اس نے ایک بے فکری کی زندگی گزاری تھی۔ مسز گوہر اسے کسی بھی معاملے کی ہوا لگنے دینا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے متنفر ہو جائے' لیکن اتنی احتیاط کے باوجود ان سے بُرا ہی ہوا۔

احمر اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ بات واقعی بڑھ گئی تھی۔

"آپ کو جو کرنا ہے کر لیں ماما جی!" تانیہ نے "ماما جی" کو کھینچ کر کہا۔ "یہاں سے جائیں اب۔"

مسز گوہر کی زندگی بھر کسی نے اس طرح بے عزتی نہیں کی تھی' جو اب ہو رہی تھی۔

"اپنا لہجہ اور الفاظ سنبھال کر بات کریں مسز احمر... پلیز۔" فرزام نے یہ بات تحمل سے ہی کی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے دو لوگ بہانے اور بھڑکنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ اس لیے احمر فوراً" بھڑک اٹھا۔

"تم اپنی زبان سنبھالو اور نکلو یہاں سے۔ جاؤ... دفع ہو جاؤ۔"

وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرزام گھبرا گیا۔ جو بھی تھا' وہ احمر سے ڈرتا تھا۔ اس کا احترام تو بہت ہی کرتا تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا وہ۔

مسز گوہر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ پیسے مانگنے کی دیر تھی کہ یہ سب ہو گیا۔ اب پاکستان میں وہ کیا فٹ پاتھ پر رہیں گے۔ ان کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں لہذا وہ حالات اب بن گئے تھے۔ اگر وہ یہاں رہتیں تو بھی احمر انہیں سپورٹ نہ کرتا۔

"چلو آؤ فرزام! میرے ساتھ۔" انہوں نے اسے لے جانا چاہا۔ لیکن اس انداز پر فرزام کو جس معاملے نے آن گھیرا تھا' وہ اس کی بابت بات کرنا چاہتا تھا لیکن مسز گوہر اسے چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"پلیز ماما! دوبارہ میرے گھر ایسے لڑائی جھگڑا کرنے مت آیئے گا۔" احمر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا۔ مطلب گھر آیئے گا ہی مت۔

"کیا ماما آپ سے لڑ رہی ہیں؟ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟" فرزام جاننا چاہتا تھا۔ مسز گوہر نے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔"

"میں بکواس کر رہا ہوں؟"

"فرزام! چلو میرے ساتھ۔"

"ایک سیکنڈ ماما... ذرا کلیئر کر لینے دیں۔ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ آپ ایسے بات کیوں کر رہے ہیں؟"

"مجھے تمہیں ایک روپیہ نہیں دینا۔ سن لیا ماما آپ نے بھی؟ یہ سب میں نے رات دن کی محنت سے بنایا ہے۔ آپ ایسے ہی میرے ساتھ یہ سب نہیں کر سکتیں۔ فساد کی جڑ وہی پیسہ...."

"ماما! کوئی پیسوں کا مسئلہ ہے؟" فرزام اپنی ماما کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز گوہر نے خود کو بولنے سے روک لیا۔ اب تو لڑائی اور ہی بڑھتی نظر آ رہی تھی۔

"یہ مجھ سے میرے پیسے مانگ رہی ہیں' تمہیں دینے کے لیے۔" احمر نے زیادتی اور جھوٹ کی حد پار کرلی مزے سے۔ جب اس نے حد پار کرلی تو مسز گوہر نے بھی سوچا کہ کم سے کم فرزام کو اب تو سچ معلوم ہو ہی جانا چاہیے۔

"پاکستان میں جو ہماری پراپرٹی تھی۔ اسے میں نے احمر کے کہنے پر بیچ دیا اور سارے پیسے اسے دے دیے۔ اب اصولاً" اسے تمہارے حصے کے پیسے تمہیں دے دینے چاہئیں۔ چونکہ اتنا عرصہ یہاں رہی ہیں۔ یہ یہاں رہا تو اسے کالج تک بھیجا۔ ہر طرح کے اخراجات بھی کیے تو تھوڑے سے پیسے ابھی تک باقی بچے ہیں۔"

"تھوڑے سے احمر۔ ڈھائی کروڑ کا تو صرف میرا گھر ہی تھا۔"

"ڈھائی کروڑ یہاں پر ڈھائی کروڑ نہیں رہتے۔"

"ماما!" فرزام نے اپنی ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ابھی دو دن پہلے آپ نے مجھے کہا تھا کہ وقت کی زبان پڑھنا سیکھو۔ اب میں سیکھ رہا ہوں تو آپ کیوں بھول رہی ہیں؟"

"لیکن فرزام!" آنسو ان کی آنکھوں سے نکلنے لگے۔ تانیہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی' احمر "ہونہہ" کی صورت بنائے کھڑا تھا۔

"ماما! احمر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو ان سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔" مسز گوہر نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھا اور وہ چپ ہو گئیں۔ دونوں ماں بیٹا بلڈنگ سے باہر آ گئے بہت دیر تک واک کرتے رہے خاموشی سے۔

"دو دن بعد میں جا رہا ہوں ماما... یقین جانیے میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے عقل نہیں آئی۔ لیکن اتنے سے دنوں میں مجھے بہت عقل آ گئی ہے۔ اب میں مرد ہوں۔ رو نہیں سکتا اور ایسا کچھ برا بھی نہیں ہوا ہمارے ساتھ۔ جو کچھ ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔" وہ آنکھیں صاف کرتی اپنی ماں کو تسلی دے رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سب پر مسز گوہر بہت رو رہی تھیں۔

"آپ بھائی کے پاس ہی رہیں گی۔ جب تک پاکستان میں میں سیٹل نہیں ہو جاتا۔"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ تانیہ کے شوہر کے ساتھ میں کہاں رہوں گی؟"

"چند ماہ تو رہیں یہاں۔"

رات گئے تک ان کی واک جاری رہی۔

اگلے دن فرزام نے گتے کے ایک بڑے ڈبے میں کارڈز' کچھ شرٹس' چند کھلونے اور چند اور مختلف چیزیں رکھیں۔ ڈبا اٹھا کر ٹیوب سے وہ اپنے کالج آ گیا اور گیٹ کے باہر ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"روبی!" بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اسے آواز دی۔ وہ اپنی تین دوستوں کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔ وہ ان تین دوستوں کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ انہیں دور سے ہی ہاتھ ہلا کر "ہائے" کہا۔ انہوں نے بھی ہاتھ ہلایا اور وہیں کھڑی رہیں' نہ چاہتے ہوئے بھی روبی کو اس کے قریب آنا پڑا۔ منہ بنائے کھڑی رہی کہ بولو کیا بات ہے۔

"یہ تمہاری چیزیں لایا ہوں۔" اس نے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

روبی کا منہ اور بگڑ گیا۔ "گھر تو تم ملتیں نہیں۔ سوچا یہیں دے جاؤں۔"

"اس ڈرامے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جیسے تمہیں "محبت" کا ڈراما کرنے کی ضرورت تھی۔"

"کافی غصے میں لگ رہے ہو۔" وہ تمسخر سے ہنسی۔ "ٹیک اٹ ایزی۔"

"اب ہی تو غصے میں نہیں ہوں۔ پھر تو تم سے کبھی ملاقات ہوگی نہیں۔ تم میری دی ایک ایک چیز واپس کر دینا۔" وہ کہہ کر جانے لگا۔

"اپنی اگلی گرل فرینڈ کو دو گے' میری استعمال کی گئیں چیزیں...؟" وہ ہنسی۔

"اسے دکھاؤں گا اور بتاؤں گا کہ چیزوں سے محبت کرنے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ سچی محبت کرنے والوں سے ساتھ... صرف ہنسنے' گانے' مزے کرنے والوں سے... جب تک اسکول' کالج کی ہر لڑکی کا مجھ پر کرش رہا۔ اس وقت تک میں تمہیں عزیز رہا کہ "میں نے جیت لی فرزام نام کی ٹرافی۔" جب اسی کالج میں میرے خلاف باتیں کی گئیں تو تم نے ٹرافی کو

اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔"

"ہونہہ۔۔ اب تو تم پاگل بھی ہوگئے ہو۔" ہو بہو وہ اپنی بہن ثانیہ جیسی لگ رہی تھی۔

"بہت وقت پر پاگل ہوا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے۔ میرے ساتھ بہت بڑا معجزہ ہوا ہے۔ مجھے اتنا کچھ معلوم ہوگیا۔ اتنا سب کچھ تو کل بھی نہیں بتا سکتا۔ ورنہ میں تو ہر سنڈے تمہارے ساتھ مووی پر ہی جا تا رہتا۔"

"معجزہ تو میرے ساتھ ہوا ہے مسٹر فرزام۔۔! میری زندگی بچ گئی۔" بالوں کو جھٹک کر کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ دے کر اس نے کہا۔

"اور میرا دل۔۔ تمہاری زندگی نہیں بچی۔ صرف تمہاری پلاننگ محفوظ رہی ہے۔ ایک بڑا گھر ہو' خوب صورت شوہر ہو' ویک اینڈ پر پارٹی ہو' آؤٹنگ ہو۔۔ اس برائٹ پلاننگ میں تمہیں مشقت نامی چیز گوارا نہیں تھی۔ مشکلات تمہیں پسند نہیں اور پاکستان میں ایک تھرڈ کلاس زندگی کا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"اب تم جو چاہو' سوچو۔۔ میں تمہیں فارغ کر چکی ہوں۔" بھرپور طنز کیا۔ اسے طیش دلانا چاہا۔

"اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" جھک کر وہ کورنش بجالایا۔ روی پلٹ کر آگے چلنے لگی۔

"روی۔۔!" اس نے پیچھے سے آواز دی۔ روی نے صرف گردن موڑ کر دیکھا۔

"نہ جانے مجھے یہ بھی کیوں لگتا ہے کہ تمہاری زندگی میں آنے والے بھی تمہیں بار بار فارغ کریں گے۔ اگر ان میں تھوڑی سی بھی عقل ہوئی تو۔"

"ہونہہ!" کی شکل بنائے روی ڈبے کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس محبت کا اختتام بہت آرام سے ہوگیا' جس کا روی صرف چند ہفتے پہلے تک بہت دھوم دھام سے جشن مناتی رہی تھی۔



چھ ماہ وہ پاکستان میں جھنگ میں پاپا کے ایک دوست کے پاس رہا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا۔ کالج سے وہ نکالا گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی اور پاکستان میں ابھی کسی بھی کالج میں ایڈمیشن نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ سیشن شروع ہو چکے تھے۔ اسے سیشن ختم ہونے کا ہی انتظار کرنا تھا۔ انکل ہاشمی کی مدد سے اتنا ضرور ہوا کہ اسے ایک کوچنگ سینٹر میں انگلش ٹیچر کی جاب مل گئی۔ ایک اس کی انگلش بہت اچھی تھی اور وہ یہی پڑھا سکتا تھا۔ ماما نے اسے کچھ ہوئے پیسے دیے تھے۔ پیسوں کا اسے مسئلہ نہیں تھا لیکن اب وہ فارغ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زیادہ وقت کوچنگ سینٹر میں ہی رہتا۔ استقبالیہ پر بھی بیٹھ جاتا۔ جب وہ فر فر انگریزی میں بات کرتا تو انگلش کے لیے ٹیوشن کا پوچھنے آئے لڑکے لڑکیاں ایڈمیشن لے لیتے۔ کوچنگ سینٹر کا مالک اس سے بہت خوش تھا۔ اچھے پیسے دے رہا تھا۔

چھ ماہ جھنگ میں اس کا اچھا ہی وقت گزر گیا۔ پھر مسز گوہر بھی پاکستان آگئیں۔ ان کا آبائی شہر لاہور تھا۔ یہیں سے وہ برطانیہ گئے تھے۔ ان کے باقی رشتے دار بھی مختلف ملکوں میں سیٹل تھے۔ ماموں دبئی میں رہتے تھے اور احمر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ نہ ہونے کے سلسلے میں ناراض تھے۔ اتنے ناراض تھے کہ بات ہی نہیں کرتے تھے۔ خالہ کینیڈا میں تھیں اور ان کے شوہر قدامت پسند مذہبی تھے۔ انہیں گو ہر خاتون کے کٹے ہوئے بال پسند نہیں تھے اور فرزام کے چچا کے ساتھ بھی وہی معاملہ درپیش تھا' جو ان کا احمر کے ساتھ تھا۔ برسوں پہلے انہوں نے بھی ان کے حصے کی گاؤں کی زمین اپنے نام کروالی تھی۔

چند دن جھنگ میں رہ کر وہ دونوں لاہور آگئے۔ انکل ہاشمی نے ان کے لیے ایک کرائے کے گھر کا انتظام کروا دیا تھا۔ یہ گھر ایم او کالج کے قریب تھا۔ بمشکل چار مرلے کا ہوگا۔ تین کمرے نیچے تھے۔ دو کمرے اوپر تھے۔ انہوں نے ایک سال کا ایڈوانس کرایہ دے دیا۔ ان چھ مہینوں میں مسز گوہر نے کسی نہ کسی طرح سے احمر سے کچھ پیسے لے ہی لیے تھے۔ کچھ ان کی اپنی بچت بھی تھی اور پاکستان میں بنائے گئے سونے کے زیورات۔ چند زیورات انہوں نے ثانیہ کو دے دیے تھے۔ باقی ان کا خیال تھا کہ اسے ڈیزائن بدلوا کر دے دیں گی لیکن آنے والے وقت میں وہ جب اسے کچھ دینا چاہتیں تو انہوں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔

زیورات بھی انہوں نے بیچ دیے۔ دو بیڈ روم اوپر سیٹ کر لیے۔ سیکنڈ ہینڈ فرنیچر مناسب اور اچھی حالت میں انہیں آرام سے مل گیا۔ ان دونوں کو زیادہ سامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لاہور شہر میں اب پڑھنے والے کم ہی ہوں گے۔ لیکن پڑھانے والے جگہ جگہ اڈے بنا کر بیٹھ گئے۔ فرزام کو اس کا بہت فائدہ ہوا۔ وہ شام سے رات تک مختلف اکیڈمیوں میں ایک ایک' دو دو' پیریڈز لینے لگا۔ دن میں وہ مسز گوہر کے ساتھ ان کے کام کرتا۔

برطانیہ جانے سے پہلے مسز گوہر اپنے گھر میں بچوں کے روایتی ملبوسات بنانے کا کام کرتی تھیں۔ ایک اچھی لوکیشن میں ایک اسٹور کرائے پر لیا تھا۔ جہاں میٹریل تیار ہونے کے بعد فروخت کیا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ دوسرے اسٹورز میں بھی ڈسپلے کیا جاتا تھا۔ کوٹھی کے نیچے والے پورشن میں یہی کام ہوتا تھا۔ وہیں ان کا چھوٹا سا آفس بھی تھا۔ احمر سے جب بار بار انہوں نے اپنے ٹھیک ٹھاک چلتے ہوئے کام کے بارے میں کہا تو احمر نے ہزار مثالیں دیں۔ انہیں سمجھایا کہ وہ یہی کام یہاں بھی کر سکتی ہیں۔ بلکہ یہاں تو ان کے کام کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ انڈین اور پاکستانی تو ترستے ہیں کہ انہیں روایتی پہناوے مل جائیں۔ اتنی یقین دہانیوں پر بھی سب بیچ باچ چلی گئیں تو احمر میں ان کے ساتھ کھانا بھی آیا۔

انہوں نے پرانے کاریگروں سے رابطے کیے۔ لیکن جس معاوضے پر وہ لوگ اب پاکستانی انڈسٹری میں کام کر رہے تھے۔ وہ اتنا معاوضہ انہیں دے نہیں سکتی تھیں۔ اب انہیں کم معاوضے پر لیکن اچھے کام کرنے والے چاہیے تھے۔ کٹنگ کا کورس تو وہ برطانیہ سے کر آئی تھیں۔ ساتھ ہی دوسرے چھوٹے بڑے کنسلٹنسی لیے اب انہیں کٹنگ ماسٹر رکھنے کی تو ضرورت نہیں تھی۔ دو ماسٹر جی رکھے سلائی کے لیے۔ ایک کاریگر مشینی کڑھائی کے کام کے لیے اور ایک کاریگر فریم ورک کے لیے۔

ایک مہینے سے وہ شاہ عالمی بازار جا جا کر میٹریل اکٹھا کر رہی تھیں۔ پہلے انہیں یہ سہولت تھی کہ ان کے پاس کار تھی اور مخصوص دکان داروں کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں کسی کے بھی ہاتھ میٹریل کی فہرست بھیج دیتیں اور پھر جا کر چیک کر کے لے آتی تھیں۔ رنگ ساز کے ساتھ ماہانہ حساب کتاب تھا۔

شاہ عالمی میں انہوں نے پرانے دکان دار ڈھونڈنے چاہے۔ مگر ان میں سے صرف ایک ہی ملا۔ وہ ایک ہی بہت تھا۔ فہرست ہاتھ میں لیے انہیں بار بار بازار جانا پڑتا۔ پھر اتنا سامان دونوں کو اٹھا کر رکشے میں ڈال کر لانا پڑتا۔ فرزام تو انہیں سامان اٹھانے نہ دیتا۔ لیکن اپنے بیٹے پر اتنا بوجھ ڈالنا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شروع شروع میں فرزام شاپر ہی پکڑ لیتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے عجیب کام کیا۔ وہ ایک بڑا اور چوڑا کپڑا اپنے ساتھ لے آیا۔ سارے سامان کو اس میں باندھا اور دکان دار کی مدد سے اس نے وہ گٹھڑی اپنے سر پر رکھوالی۔ مسز گوہر کی چیخ نکل گئی۔

"فرزام! تمہاری گردن میں جھٹکا آجائے گا۔ خدا کے لیے ایسے مت کرو۔ پلیز اسے اتارو۔"

"نہیں ماما۔۔ میری گردن ٹھیک رہے گی۔۔ میں نے بہت سے لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ آپ مجھے بھی کرنے دیں۔"

"تمہیں عجیب نہیں لگ رہا؟" وہ خوف زدہ نظروں سے اس کے سر پر جمی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ اب گری کہ اب گری۔

"نہیں ماما! ایسی باتیں بھی عجیب لگتی ہیں کیا؟"

شاہ عالمی کے رش میں وہ دونوں جگہ بناتے آگے پیچھے۔ کبھی ساتھ ساتھ گزر رہے تھے۔

"مجھے تو بہت مزہ آرہا ہے اس روٹین کا۔ جانتی ہیں ایک بہت بڑی جاپانی کمپنی کا مالک اپنے گھر کی کیاریوں

کی خود دیکھ بھال کرتا ہے' کھاد ڈالتا ہے' کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ جب میں بھی اس جتنی بڑی کمپنی کا مالک بن جاؤں گا تو میں بھی ایسے ہی پودوں میں کھاد ڈالا کروں گا۔ اپنے جوتے پالش کیا کروں گا۔ پر مجھے اب معلوم ہوا ماما کہ وہ یہ سب کمپنی بنانے سے پہلے کرتا رہا ہے۔ بڑے کام سے پہلے ہی چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان لیکٹ سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں شرم نہیں کرنا چاہیے' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا ماما؟" ٹھوڑی والا سر اس نے ذرا سا موڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں! میرے بچے۔ اتنی عظیم باتیں کر رہے ہو کہ مجھے راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"ہاہاہا۔۔۔ آنکھیں صاف کرلیں نا۔ بات بات پر رویا مت کریں۔" وہ ہنسا تو وہ بھی ہنسنے لگیں۔

گھر میں کام شروع ہو گیا۔ دن میں فرزام نمونے لے کر انار کلی' کرشن نگر' باغبان پورہ' سنت نگر' بھاٹی دروازے' لاہور اسٹیشن' صدر' گوال منڈی' اچھرو بازاروں میں دکانوں میں جا جا کر آرڈر لیتا۔ دیکھنے میں وہ ذرا انگریز انگریز لگتا تھا۔ انگریزی لب و لہجے کی اردو بولتا تو بہت ہی پیارا' چھوٹا سا صاحب لگتا نمونے دیکھنے والے سوچتے کہ گورا صاحب کام کر رہا ہے۔ کوالٹی بھی اعلا ہو گی اور باقی میٹریل بھی اور ساتھ ساتھ وہ اپنے گاہکوں سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "انگریز کی صنعت کے بنے ہیں" جیسے جاپان کی مشینری' کوریا کی جیولری' ترکی کا فرنیچر اور اب انگریز کے کپڑے۔

پھر وہ بات بھی بہت اچھے انداز میں کرتا تھا' دکانوں میں جاتا تو اس کی مہمان نوازی کرنے کو ان کا جی چاہتا۔ انہیں آہستہ آہستہ آرڈرز ملنے لگے۔ وہ آرڈرز لیتا بھی اور سپلائی بھی کرتا ایک عدد سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل اس نے لے لی تھی۔ لیکن لاہور کی سڑکوں پر' خاص طور پر اچھرے اور بھاٹی دروازے کے بازاروں کی چھوٹی بڑی پھنسی ہوئی سڑکوں پر بائیک چلانا امریکا کے سب سے اونچے پل کے موٹے رسے پر بائیک چلانے کے قریب قریب برابر تھا۔ ہر بار واپسی پر آکر وہ کہتا۔

"تیرا لعل زندہ آگیا ماما۔ جلدی سے امیر ہو جائیں ورنہ میری خیر نہیں۔" وہ ہنس دیتیں۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کے دن تھے دونوں ماں بیٹا چھوٹی سی چھت پر کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ قریب قریب کی سب ہی چھتوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے سے بجلی نہیں آرہی تھی۔ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ نیند تو اسے بہت آرہی تھی۔ لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔

"پاکستان میں اب زیادہ ہی گرمی نہیں ہونے لگی؟"

"پہلے بھی اتنی ہی تھی۔" وہ ساتھ ہاتھ کا پنکھا بھی جھل رہی تھیں۔

"لیکن ماما! پہلے مجھے اتنی گرمی نہیں لگتی تھی۔"

وہ ہنسیں۔ "تب تم ایک کینال کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ جس کے آگے ایک کھلا لان تھا۔ بہت سے درخت اور پودے تھے گھر میں اور آرکیٹیکٹ نے گھر کو ایسے ڈیزائن کیا تھا کہ وہ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔"

"اچھا۔۔! ہمارے مالک مکان کو بھی ایسے ہی گھر ڈیزائن کروانا چاہیے تھا۔ دیکھیں! کتنا گرم گھر ہے ان کا۔ اتنی جلدی گرمی آجاتی ہے لاہور میں۔"

"چار مرلے کے گھر کو وہ کیا ڈیزائن کرواتا۔ پھر یہاں زیادہ تر لوگ موسم کو دیکھے بنا ہی گھر بنوا لیتے ہیں اور تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ ہمارے گھر میں ایئر کنڈیشنڈ تھا ہر کمرے میں۔ سارا گھر ہی ٹھنڈا تھا۔ جس کار سے تم اسکول جاتے تھے۔۔۔ وہ بھی۔۔۔ تمہارا اسکول بھی۔۔۔ تو بیٹا! ایسے لوگوں کو کیا معلوم کہ پاکستان میں کتنی گرمی اور سردی ہوتی ہے۔ یہ سب تو کسی اور کو ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"یعنی غریبوں کو۔۔۔"

"غریب ہونا برا نہیں۔۔۔"

"لیکن مشکل ضرور ہے۔۔۔ یہ جو ہمارے پڑوس میں آنٹی رہتی ہیں نا۔۔۔ بازار سے آرہی تھیں۔۔۔ سچ ماما! مرنے کے قریب تھیں۔ شاید بلڈ پریشر کا مسئلہ تھا انہیں۔ میں نے انہیں بائیک پر بٹھا کر گھر تک چھوڑنے کے لیے کہا تو کہتی ہیں۔ 'بھلائی! میرے شوہر نے مجھے چھتر مار کر گھر سے نکال دینا ہے۔" میں نے پوچھا "آنٹی! چھتر کسے کہتے ہیں تو بولیں کہ یہ "جو تم نے پیروں میں پہن رکھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تو شوز ہیں۔" تو وہ بولیں۔ "نہیں چھتر بھی کہتے ہیں۔"

مسز گوہر اتنا اونچا قہقہہ لگا کر ہنسیں کہ آواز ایک دو قریب کی چھتوں تک تو ضرور ہی گئی ہو گی۔

"کیوں اس کا اتنا سر کھایا تم نے۔۔۔ پاگل۔۔۔"

"میرا اپنا دماغ گرمی سے گھوما ہوا تھا۔ پانی کی جو بوتل میں پینے کے لیے ساتھ رکھتا ہوں۔ وہ میں نے سر پر ڈال لی۔ ایک چھوٹا لڑکا بازار میں برف والا پانی بیچ رہا تھا دس روپے میں اس سے بوتل بھروائی اور لڑکے سے کہا کہ تم ضرور بڑے ہو کر کسی بڑے ادارے کی باگ ڈور سنبھالو گے۔"

"کیوں آپ ولائی اسے؟ ایسے تو ہمارے ملک میں ہزاروں بچے ہیں۔ کہاں ان کے مستقبل بنتے ہیں۔"

"ارے ماما! اس کا ضرور بنے گا۔ اسکول کے انتظار میں تھا۔ تین روپے کا گلاس دے رہا تھا۔ میں نے کہا کہ "دس کا تو بیچو۔ اتنی گرمی میں بیٹھے ہو۔" کہنے لگا۔ "سترہ روپے کی برف آئی ہے۔ پانی مفت کا ہے۔ سات گلاس نکل جائیں گے آرام سے۔ اتنا منافع کافی ہے مجھے ملک میں اور مہنگائی نہیں کرنی۔"

"بہت خوب۔۔۔ کمال کا بچہ تھا۔"

"واپسی پر پیدل جاتا ملا۔۔۔ میں نے اسے گھر چھوڑ دیا۔"

"بہت خوب۔۔۔ تم بھی کمال کے بچے ہو۔" وہ ہنسیں۔

"اتنی بار اسپرے کیے ہیں میں نے۔ لیکن یہ مچھر آخر جاتے کیوں نہیں؟" وہ بار بار ریکٹ سے مچھر مار رہا تھا۔

"میرے سارے علاقے میں ہو گا تو ہی مچھر ختم ہوں گے وہ بھی شاید۔" وہ تیزی سے پنکھا جھلنے لگیں تاکہ مچھر فرزام سے دور ہی رہیں۔

"اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس کہ سارے علاقے میں اسپرے کروا دوں۔ لیکن اگر علاقے کے لوگ تعاون کریں تو میں پیسے اکٹھے کر کے کروا سکتا ہوں۔"

"فرزام! یہ عام لوگ ہیں۔ ان کی زندگیوں میں اتنے مسائل ہیں کہ یہ لوگ مچھر جیسے مسئلے پر سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ مچھر' مکھیاں' گرمی' بجلی کا نہ ہونا۔ یہ سب ان کے لیے معمول کے اور معمولی مسئلے ہیں۔"

"مسئلے حل کرنے سے حل ہو جاتے ہیں۔ ختم نہیں ہوتے تو کم ضرور ہوتے ہیں۔"

"جن کی زندگیوں میں روٹی کا مسئلہ ہو۔ وہ اور مسئلوں پر کیسے توجہ دیں؟"

"چلیں مان لیا۔۔۔ روٹی' مہنگائی' بے روزگاری۔۔۔ یہ مسئلے ہیں' لیکن ماما! گندگی۔۔۔ یہ تو مسئلہ نہیں ہے نا۔ غریب لوگ غریب ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ گندے کیوں ہیں۔ کیا صفائی ستھرائی میں بھی پیسے لگتے ہیں۔ گھروں کے سامنے گند ہے۔ اندر گند ہے۔ بچے گندے ہیں۔۔۔ میں نے گلیوں میں بغیر نیکر کے گندے سندے کپڑوں میں بہت بار بچوں کو دیکھا ہے۔ ماما! عورتوں کو ان سب کا تو خیال رکھنا چاہیے نا؟ گھروں کے آگے کوڑا پھینکنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ایک گلی کو صاف رکھنے میں کتنے پیسے لگتے ہیں۔۔۔ اور میں جب جب پائپ لگا کر گھر کے آگے دور تک کا حصہ صاف کرتا ہوں تو ساتھ والی آنٹی کے سارے بچے آکر میرے سر پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دو چھتوں سے لڑکیاں بھی مجھے دیکھتی ہیں۔ سچ ماما! میں بہت شکر گزار ہوں برطانیہ کا۔ اس نے میری بہت سے معاملات میں بہت اچھی تربیت کی ہے۔"

اس تربیت کا اس نے ذرا سا استعمال کیا اور گھر گھر جا کر پیسے لیے۔۔۔ وہ ہر ایک کے دروازے پر جاتا۔ مچھر

اور مچھر کے کاٹنے پر لیکچر دیتا۔ سب دروازوں کی پردوں کی اوٹ میں کھڑی سنتی رہتیں۔ کچھ پیسے پکڑا دیتیں۔ کچھ کہتیں کہ "ان کے ابو آئیں گے تو ہی جواب دیں گی۔" ایک آنٹی کو فرزام نے کہہ دیا کہ "کیا مچھر آپ کو آپ کے ابو سے پوچھ کر کاٹتا ہے۔" وہ تو ہنسیں۔ ساتھ کے گھروں کی تین اور آنٹیاں بھی دل کھول کر ہنسیں۔

اسپرے پر آنے والی کل لاگت فرزام نے لگائی تھی۔ گھر بھی گن لیے تھے۔ اب ہر ایک کو ایک جیسی رقم دینا تھی، پیسے اتنے زیادہ بھی نہیں تھے۔ کم از کم وقفے وقفے سے تین بار اسپرے ہونا تھا۔ کچھ نے بحث کر کے پیسے دیے کچھ نے بنا بحث کے دے دیے اور کچھ نے سرے سے دیے ہی نہیں۔ جنہوں نے نہیں دیے۔ ان کے فرزام نے اپنے پاس سے ڈال لیے۔ اس کے پاس بھی زیادہ پیسے نہیں تھے۔ لیکن اس نے سوچا کبھی تو آ ہی جائیں گے۔ فی الحال مچھروں کو نہیں آنا چاہیے۔ سو وقفے وقفے سے تینوں اسپرے ہو گئے۔ کشادہ گلی میں سڑک کی طرف نکڑ پر ان کا گھر تھا۔ اندر سے اندر اور گلیاں نکلتی تھیں۔

اسپرے سے انقلاب تو نہیں آیا۔ لیکن مچھروں کی تعداد بہت گھٹ گئی۔ جنہیں برداشت کیا جاسکتا تھا۔ گلی میں رہنے والی ایک آنٹی اسے ملیں تو بہت پیار سے بولیں۔

"بڑا چنگا ایں توں کاکے!" (بہت اچھے ہو تم لڑکے)

انہیں آرڈرز بھی مل رہے تھے اور وہ کام بھی کر رہے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ منافع زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ منافع جنریٹر کے پیٹرول میں نکل رہا ہے۔ ہر میٹریل کی قیمت ڈبل سے ٹرپل ہو چکی تھی۔ نیو ٹیشن میں بھی وہ ایڈمیشن نہیں لے سکا۔ اگر وہ ایڈمیشن لے لیتا تو آرڈرز اور سپلائی کا کام کون کرتا۔ کسی اور ورکر کو وہ فی الحال افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کڈز گارمنٹس کے لگژری اسٹورز سے بھی انہیں آرڈرز مل گئے تھے۔ لبرٹی اور مون مارکیٹ کے کچھ اسٹورز سے بھی بات چیت چل رہی تھی۔ لیکن وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ گلبرگ اور ڈیفنس میں کچھ اسٹورز ایسے تھے جن کے ساتھ بات چیت میں کئی گھنٹے گزر جاتے۔ وہ گھنٹوں بٹھا کر یہ سمجھاتے رہتے کہ انہیں کس طرح کے فیشن کے کپڑے چاہئیں۔ کن رنگوں کے اور کس کام کے ساتھ۔

فرزام نوٹ کر لیتا تھا۔ آکر ماں کو بتا دیتا تھا۔ لیکن سپلائی کے وقت وہ نقص نکالتے کہ آرڈر ویسا نہیں ہے اگر اتنے گھنٹے ماں ضائع کریں گی تو کٹنگ کا کام کون کرے گا اور اگر اتنے ہی گھنٹے فرزام ان سب کو نوٹ کرنے میں لگائے گا تو باقی کا کام کون کرے گا۔ لیکن وہ ان اسٹورز کو ہاتھ سے جانے بھی نہیں دینا چاہتے تھے ان سے انہیں بروقت ادائی ملتی اور تعریف قریب ان کی پسند کی ملتی۔

دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے اخبار میں ایک ورکر کے لیے اشتہار دے دیا۔

☆ ☆ ☆

ایڈ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمیں ایک گریجویٹ کی ضرورت ہے جو روانی سے انگلش بول سکے۔

"میں گریجویشن کر رہی ہوں۔"

"لیکن لیڈی! آپ ہیں تو نہیں نا۔"

"نہیں۔ لیکن ہو جاؤں گی۔"

"لیکن۔" وہ زچ ہو گیا۔ "دیکھیے! میں سمجھا ہوں کہ ہمیں گریجویٹ ہی کیوں چاہیے۔ کیونکہ اس ملک میں ایک گریجویٹ ہی اچھی انگریزی بول سکتا ہے۔"

"میری ایک بھابھی بی اے ہیں۔ وہ تو انگلش نہیں بول سکتیں۔" اس نے اتنی بے چارگی سے سچ بولا کہ فرزام اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"یہ انٹرویو اسی لیے تھے کہ معلوم کیا جاسکے کہ میرے پاس آنے والا بی اے انگلش بول سکتا ہے کہ نہیں۔"

"ایڈ میں لکھا ہے کہ اسے ڈیزائننگ کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیے۔ تو مجھے سمجھ بوجھ ہے۔ میں کسٹمر کی ڈیمانڈ کو آسانی سے سمجھ سکتی ہوں۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن لیڈی! آپ کو کسٹمر سے ڈیل نہیں کرنا۔ آپ کو کچھ کروڑپتیوں سے ڈیل کرنا ہے۔ جہاں سے آرڈرز لینے ہیں وہ اسٹورز گلبرگ اور ڈیفنس میں ہیں۔ کچھ سوسائٹیز میں ہیں۔ عام روٹین میں بھی ان لوگوں کو عادت ہوتی ہے انگلش میں ہی بات کرنے کی۔ ایڈ میں میل فی میل ضرور لکھا ہے لیکن ہماری ترجیح لڑکا ہے جو اپنی کنوینس پر آجا سکے۔"

"مجھے کڈز گارمنٹس میں بہت اچھا تجربہ ہے۔ میں جانتی ہوں میں آپ کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔" اس بار اور بے چارگی سے کہا گیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کو ایک اچھی جاب کی ضرورت ہے۔ لیکن۔" اس کی شکل پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے دکھ ہوا۔

"اچھی جاب کی نہیں ایک شریف جاب کی۔" اسے لگا لڑکی رونے ہی والی ہے بس۔

"یہ جگہ میرے گھر سے قریب ہے۔ میں یہاں پیدل آسکتی ہوں۔"

"میں آپ کے لیے ضرور کچھ کرتا۔ اگر کر سکتا۔" اس کی بے چارگی پر اسے ترس آیا۔

وہ چلی گئی۔ وہ وہاں آئی دس لڑکیوں اور پانچ لڑکوں میں سے چھٹی لڑکی تھی ایک فریش گریجویٹ لڑکے کو فرزام نے اوکے کر دیا۔ انٹرویو ان کے گھر میں ہی ہوئے تھے۔ جہاں ایک کمرے میں انہوں نے ایک میز اور دو کرسیاں رکھ کر اسے آفس بنا لیا تھا۔

رات کو وہ ماں سے اس لڑکی کا ذکر کرنا نہیں بھولا۔

"اس نے کہا کہ اسے ایک شریف جاب کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے بہت برے حالات دیکھے ہیں اس نے۔ کہہ رہی تھی کہ کڈز گارمنٹس کی اسے بہت سمجھ بوجھ ہے۔ ماں! آپ اسے اپنے ساتھ ہیلپر کیوں نہیں رکھ لیتیں؟"

"ہم ایک اور ورکر کی تنخواہ کہاں سے نکالیں گے؟"

"ہو سکتا ہے ابھی وہ کم پیسوں پر مان جائے۔ پھر آنے والے وقت میں ہم اسے زیادہ دے سکیں۔ میرے انکار پر وہ رونے والی ہو گئی تھی۔ کچھ کیجیے ماں۔"

"دیکھ لو۔ ابھی ہم اتنے منافع میں نہیں جا رہے۔"

نیچے آکر اس نے وہ فہرست نکالی۔ جس پر ہر امیدوار کا نمبر لکھا تھا۔ اس نے نمبر کو موبائل میں محفوظ کر لیا۔ تاکہ صبح اسے کسی بھی وقت فون کر سکے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یقیناً "آج وہ بہت مایوس ہو گی۔ اگر وہ ابھی فون کر دے تو شاید یہ اس کے لیے اچھا ہی ہو۔ اس نے فون کیا۔ وہ اس لڑکی کی آواز تو بالکل نہیں تھی۔ فرزام نے اپنا تعارف کروایا۔

"مجھے افق عبدالقدوس سے بات کرنی ہے۔ آج وہ میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی تھیں۔"

☆ ☆ ☆

اسے نو بجے آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ سوا آٹھ بجے ہی وہاں تھی۔ مسز گوہر خود فجر کے بعد نہیں سوتی تھیں۔ اپنا کام کرنے لگتی تھیں۔ اسے وقت سے اتنا پہلے دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ البتہ انہوں نے اسے کام سمجھا دیا۔ پہلے اسے ہر میٹریل کو دیکھ کر فہرست بنانا تھی کہ کون سا میٹریل کتنا ہے۔ بڑے کمرے میں سب میٹریل رکھا ہوا تھا۔ اس نے نو بجے یہ کام کر لیا۔ مسز گوہر حیران ہوئیں۔ وہ اچھی خاصی پھرتیلی تھی۔

"تم نے اس سے پہلے کہاں کام کیا ہے افق؟" اس کی پھرتی کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ وہ کسی بڑے ادارے میں کام کرتی رہی ہے۔

"نہیں۔" وہ بتاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی۔ "دو دن پہلے تک میں ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتی رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" انہیں محسوس ہوا کہ وہ اس بارے میں زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔

چھوٹے سے جس ریسٹورنٹ میں وہ کام کرتی رہی

تھی۔ اس میں اس سمیت دو اور لڑکیاں تھیں۔ دو لڑکے تھے، جو آرڈر لیتے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہو کر فاسٹ فوڈ کو ٹرے میں رکھ کر آرڈرز لانے والے بوائز کو دیتی تھیں۔ آنے والے کسٹمر خود بھی کاؤنٹر تک آکر اپنی ٹرے لے سکتے تھے اور تین لڑکیاں جب کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوں تو وہاں تک آنا کسی کو برا نہیں لگتا تھا۔ انق ہر روز کاؤنٹر سے اٹھ کر دس بارہ وزیٹنگ کارڈز ڈسٹ بن میں پھینکتی تھی۔ یہی حال دوسری لڑکیوں کا بھی تھا۔ انہیں ان کی خوب صورتی کی بنا پر رکھا گیا تھا۔

اس سے پہلے اس نے قذافی اسٹیڈیم میں نئے نئے بنے ہائپر اسٹار شاپنگ سینٹر میں نوکری کی تھی۔ وہاں بھی اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کا کام ریکس کو چیک کرتے رہنا اور ان میں رکھی گئیں مصنوعات کی کمی پر انہیں وہاں لا کر رکھنا تھا، وہ سارا وقت لوگوں کی نظروں میں رہتی۔ آتے جاتے اس کے ہاتھوں کو، کمر کو مس کیا جاتا۔ بہانے سے اسے کارڈز دیے جاتے۔ یہ سب تو کم تھا۔ اس کے ایک کولیگ لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کئی ہفتوں سے اس کا نمبر مانگ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کی جاب ملتے ہی اس نے شاپنگ سینٹر کی جاب چھوڑ دی۔

اس جاب میں ایک اور مسئلہ تھا۔ اسے دو بسیں بدل کر انارکلی سے قذافی اسٹیڈیم آنا پڑتا۔ اس کی آدھی تنخواہ کرایہ میں ہی نکل جاتی۔ اماں کی گھر واپسی کے بعد انہوں نے ایک وقت کا کھانا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ انہیں گرمی نہ لگنے دی جائے۔ انہوں نے سیدھا سیدھا اے سی کے لیے کہا تھا۔ علاج کے سارے اخراجات دانیہ نے اٹھائے تھے تو جو پیسے جمال کے پریس کے مالک اور اسکول کی میڈم نے دیے تھے۔ اس سے انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ اسپلٹ اے سی لگوالیا تھا۔ اماں نے بہت "نہ نہ" کی۔ لیکن اس نے بھابھی کے شوہر کو پیسے دے دیے۔ وہ اماں کی زندگی کے لیے زمین آسمان ایک کر سکتی تھی۔

اماں کی بیماری جا چکی تھی۔ لیکن زندگی جیسی بیماری ابھی ساتھ تھی۔ وہ اماں کے اسکول میں گئی۔ جہاں وہاں اسے تین ہزار میں ٹیچر رکھا جا رہا تھا۔ ایف اے پاس لڑکی کو اتنے ہی مل سکتے تھے۔ تین ہزار میں تو گھر کا گیس کا بل بھی ادا نہیں ہوتا تھا۔ اماں کے لیے جو مخصوص خوراک آنی تھی، وہ الگ۔ اس مقام پر یہ ہوا کہ انق ان سب کی اماں بن گئی۔ اپنی اماں کی بھی اماں۔ پہلے وہ صرف کام کرتی تھی۔ اب اسے کام کے ساتھ ساتھ سب کچھ سنبھالنا بھی تھا۔ اسے صرف دو وقت کی روٹی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے دو وقت کی روٹی جمع بھی کرنا تھی۔ اماں پر جو وقت آیا اور پھر اسے بھیک مانگنی پڑی۔ اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ جس پل پر سے وہ گزر کر آئی تھی۔ اس کے اختتام پر ایک عبارت لکھی تھی۔

"خود کو روندے جانے کے لیے تیار مت کرو۔"

اور انق اب کی بار کسی دکھ، تکلیف یا انسان کے ہاتھوں روندے جانے سے ڈرتی تھی۔ زندگی میں صرف جینا ہی نہیں آنا چاہیے۔ اگر پیچھے سیلابی ریلا آجائے تو بھاگنا آنا چاہیے اور اگر ریلا آ ہی جائے تو تیرنا آنا چاہیے۔ زندگی میں صرف کھانا اور سونا ہی نہیں آنا چاہیے۔

انسان کوئی جانور نہیں ہے کہ شیر صرف دھاڑ ہی سکتا ہے اور مچھلی صرف تیر ہی سکتی ہے۔ کوئل گائے گی اور سانپ پھنکارے گا۔ بندر درختوں پر چڑھے گا اور خرگوش صرف زمین کھود کھود کر سرنگ اور گھروندے بنائے گا۔ یہی سب تو انسان کو جانور سے الگ کرتا ہے کہ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے فطرت نے ایک خاص خوبی تک پابند نہیں کیا۔ پھر بھی لوگ جانوروں کی طرح خود پر بوجھ لدوا لیتے ہیں، چابک کھاتے ہیں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیر تک چاٹتے ہیں۔

انق نے تین ہزار کی وہ اسکول کی نوکری کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری نوکری کے بارے میں معلومات کرتی تھی۔ اگلی نوکری اسے ساڑھے تین ہزار میں ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پر ملی۔ اسے کاؤنٹر پر بیٹھ کر ٹوکن بیچتے ہوئے فون ریسیو کرنے ہوتے اور باری باری ہر ٹوکن نمبر کو اندر بھیجنا ہوتا۔ پھر اسے شاپنگ سینٹر کی جاب کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہاں اسے دس ہزار ملنے تھے۔ جیسے تیسے اس نے وہ جاب کی اور پھر [illegible] میں بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں آگئی۔ پہلے اسے صرف چھ ہزار ملتے تھے، لیکن جمال اسے بائیک پر یہاں چھوڑ جاتا تھا۔ جمال نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ جمال نے کہا کہ وہ پرائیویٹ پڑھ لے گا اور پڑھنے کا کیا ہے زندگی میں کبھی بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

رات کو دونوں بھائی پریس جاتے اور دن میں جمال ایک کپڑے کی دکان پر کام کرتا۔ اماں گھر میں اکیلی ہوتیں۔ بھابھی ہی آ آ کر پوچھتی رہتیں۔ مسز گوہر کے یہاں بھی وہ انہی کے ساتھ آئی تھی۔ انہی کے شوہر نے اخبار میں وہ ایڈ دیکھ کر دونوں کو بھیجا تھا۔ ریسٹورنٹ کے ماحول سے وہ عاجز آچکی تھی۔ اب وہ چند ہزار کے لیے خود کو ہر روز نیلام نہیں کر سکتی تھی۔ مسز گوہر نے اس سے کہا کہ منافع زیادہ ہوتے ہی وہ اس کی تنخواہ بڑھا دیں گی۔ ایک بند گھر میں ایک عورت کے ساتھ اسے کام کرنا تھا اور اسے بہت سکون تھا۔

جب وہ فیکٹری جایا کرتی تھی۔ تب ہی سے اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی ڈیزائنر بنے۔ اماں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ حالات اچھے ہوتے ہی وہ اسے ایک چھوٹا سا کورس تو ضرور ہی کرا دیں گی۔ ایک دو بار اس نے ایک دو خاکے فیکٹری کی ڈیزائنر کو دکھائے تھے۔ چند تکنیکی تبدیلیاں کر کے ڈیزائنر نے وہ کپڑے اپنا لیے تھے۔ اس میں سیکھنے کی زبردست صلاحیت تھی۔

اس نے گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے کام کیے تھے۔ فریم، گوند لگے خاکی لفافے، کاج، بٹن، ریڈی میڈ کپڑوں پر کالر لگانا، ڈیکوریشن پیسز کی تیاری، جیولری، [illegible] ڈیزائنر جوتوں پر اسٹون لگانے کا کام۔ وہ ہر کام تیزی سے کرتی۔ نفاست سے مکمل کرتی۔ یہی اس کا تجربہ تھا کہ مسز گوہر کی مدد کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ مسز گوہر کپڑے کی ہر سائز کی کٹنگ کرتی تھیں۔ اس پر پھر ایمبرائیڈری اور اسٹون ورک ہوتا، پھر انہیں سلائی کیا جاتا، آخری کام انہیں اچھی طرح دیکھ کر ٹانکوں کو چیک کر کے، سائز کو پھر سے ناپ کر پیک کرنے کا ہوتا، ہر آرڈر کو الگ الگ پیک کرنا ہوتا۔ کس رنگ، میٹریل، ڈیزائن کے نمونے کتنے بنیں گے۔ یہ بھی الگ الگ فہرست میں درج کرنا ہوتا۔ آرڈر ڈلیور کرنے کی تاریخ ذہن میں یاد رکھنی ہوتی، مسز گوہر کا اصول تھا کہ وہ ایک بھی دن آرڈر لیٹ نہیں کرتی تھیں۔ اکثر رات رات بھر بیٹھ کر وہ اور فرزام کام کرتے۔

انق ماضی میں اتنے سارے کام کر چکی تھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوا۔ فیکٹری میں جو اس نے تھوڑی بہت کٹنگ سیکھی تھی۔ وہ یہاں کام آگئی۔ وہ پانچ ماہ کی بچی کی شلوار قمیص آرام سے کاٹ لیتی۔ ماسٹر جی سلائی کرتے۔ وہ اگر فارغ ہو جاتی تو تیسری مشین پر بیٹھ کر سلائی کرنے لگتی۔ قمیصوں پہ چھوٹے چھوٹے شراروں پر تھوڑے بہت اسٹونز لگنے ہوتے تو وہ اٹھتے بیٹھتے آرام سے لگا لیتی۔ مسز گوہر کو شرمندگی ہوتی۔ ٹھیک ہے، وہ ان کی مدد کے لیے ہے۔ لیکن مدد سے ان کا مطلب اوپر کا کام تھا۔ کاریگروں والا کام نہیں۔ وہ گھر اس وقت نہیں جاتی تھی، جب وقت پورا ہو جاتا تھا۔ وہ اس وقت جاتی تھی، جب کام ختم ہو جاتا تھا۔ پہلے وہ صبح آٹھ بجے آتی تھی۔ پھر وہ سات بجے ہی آجاتی۔

"میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں بہت محنت کرنے والی خاتون ہوں۔ لیکن انق! تم بہت بہت محنت کرنے والی لڑکی ہو۔ تم تو جن ہو۔ تم تھکتی نہیں۔ کیا کھاتی ہو؟"

"انسان کو کام نہیں، صدمات تھکا دیتے ہیں اور اب کام میرے لیے صدمہ نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم، مجھے اس کام میں کتنا مزا آتا ہے۔ ہم روز نیا کام کرتے ہیں۔ نئے ڈیزائن پر، نئے رنگ پر، نئے کپڑے پر۔ رات بھر یہ رنگ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ میں صبح تک ان سے ملنے کے لیے بے چین رہتی ہوں۔"

"ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ میرے شوہر گاؤں سے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت سے تعلیم مکمل کی اور جاب کی اور پھر مجھ جیسی عام سی لڑکی سے شادی کی۔ میں صرف بارہ جماعتیں پاس تھی۔ جس آفس میں وہ کام کرتے تھے۔ میں وہاں آپریٹر تھی۔ لیکن مجھے ڈیزائنر بننے کا بہت شوق تھا۔ جب ہم اپنا گھر بنا چکے تو انہوں نے میرا شوق پورا کر دیا۔ مجھے بتایا کہ کیسے میں گھر پر رہ کر اپنا کام کر سکتی ہوں اور واقعی ایسا ہو گیا۔ میرے بنائے ملبوسات کو پسند کیا جانے لگا۔ میں ایک بڑے نام کی ڈیزائنر نہیں تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ میں خوش تھی۔ میں اپنی مرضی سے ڈیزائن کرتی اور اسے پسند کیا جاتا۔ اتنے سال برطانیہ میں میں نے اس شوق کو دبائے رکھا۔ رنگ مجھے بے چین کر دیتے۔ میرے ہاتھوں میں آنے کے لیے مچلتے۔ اب میں اس چھوٹے گھر میں رہ کر چھوٹے سے پیمانے پر بہت محنت سے کام کر رہی ہوں۔ لیکن میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ تم اپنے ذہن میں آنے والے کسی بھی ڈیزائن کا خاکہ مجھے دکھا سکتی ہو۔ اچھا ہوا تو ہم اس پر کام کریں گے۔ کتابیں پڑھ کر ہی سب کام نہیں آتے۔"

افق مسکرانے لگی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اسے یہ پہلی خوش خبری ملی تھی۔ اس نے زندگی بھر کام کیا تھا۔ خواب نہیں دیکھے تھے۔ خواہش نہیں کی تھی وہ اپنی چادر کو جانتی تھی۔ لیکن ایک آدھ خواب ضرور پالنا چاہیے۔ اس خواب کے پیچھے ضرور بھاگنا چاہیے۔ اس خواب کے لیے جان توڑ کوششیں ضرور کرنی چاہیے۔ اگر یہ خواب نہ دیکھے جاتے تو دنیا بھی اتنی ترقی نہ کرتی۔ اب افق نے پیسے 'ضرورت' سے ہٹ کر ایک خواب دیکھا۔ اپنے کامیاب ہونے کا۔

آدھے سے زیادہ کام وہ گھر لے جاتی تھی۔ کپڑوں کے تھان کے تھان وہ جمال کی سائیکل پر رکھ کر گھر بھجوا دیتی اور رات بھر بیٹھ کر چھوٹے سائز کے کپڑے کاٹ لیتی۔ پیپر پر خاکے بناتی کہ کس پر کس ڈیزائن کا کام ہونا چاہیے۔ کس رنگ کا۔ کس اسٹون کا۔ یہاں اسے فیکٹری میں کام کا تجربہ مدد دینے لگا۔ وہاں ایک ایک کام کو تفصیل میں اور ترتیب سے کیا جاتا تھا۔ کالر کس رنگ کا ہوگا۔ بٹن کس رنگ' سائز کے ہوں گے کہاں کہاں لگے گے۔ پاکٹ کہاں ہوں گی اور کہاں۔ کس رنگ کے ساتھ کس رنگ کی میچنگ ہوگی۔

وہ ایک چھوٹے لیول کی لوکل فیکٹری تھی۔ لیکن اس اتنی سی فیکٹری میں کام بہت ترتیب سے ہوتے تھے۔ کوالٹی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فیبرک کو چیک کیا جاتا تھا۔ ایک انچ کی کمی بیشی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسے پیسز جن میں کمی بیشی ہو جاتی تھی۔ انہیں ادھیڑ کر نئے سرے سے سلائی کروایا جاتا تھا۔ اس معاملے میں ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ کا ایک ہی اصول تھا۔ وقت اور توت کتنی ہی صرف ہو۔ کوالٹی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ رات بھر بیٹھ کر وہ کٹنگ کرتی۔ خاکے بناتی۔ خاکے پر بنیادی باتیں لکھ دیتی اور صبح پہلے خود جاتی۔ پھر جمال سائیکل پر سامان چھوڑ جاتا۔ مسز گوہر چیک کر لیتیں۔ کمی بیشی دور کر کے 'اوکے' کر کے کاریگروں کے سپرد کر دیتیں۔ آرڈرز کی تیاری میں تھوڑی سی تیزی آگئی۔ مسز گوہر وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ آرڈرز نہیں لیتی تھیں۔ اب ایک دو آرڈرز اور لینے لگیں۔ فارغ وقت میں وہ گلبرگ اور ڈیفنس کے اسٹورز میں جاکر ڈسکس کر لیتیں کہ ان کی ڈیمانڈ کیا ہے۔ اس طرح انہیں آسانی رہنے لگی۔ وہ وہی ڈیزائن کر دیتی جو ان کی ڈیمانڈ ہوتی' جو انہیں چاہیے ہوتا۔

ایک دن شام کے انہیں گلبرگ کے ایک اسٹور سے فون آیا کہ ایک میڈم ہیں۔ انہیں انار کلی فراک تین مختلف سائزز اور رنگوں میں چاہیے۔ میڈم کو ان کا نمبر دے دیا گیا۔ مسز گوہر نے ان سے بات کی۔ اگلے دن ان کے کزن کی بارات تھی اور انہیں وہ انار کلی فراکیں اپنی بھانجیوں کے لیے چاہیے تھیں۔ اسٹور پر موجود ایک وہ اپنی بیٹی کے لیے لے چکی تھیں۔ ان کی بھانجی کو بھی وہی پسند آگئی تھی۔ لیکن اس کے سائز کی اور موجود نہیں تھی۔ مسز گوہر کو یہ بتا دیا گیا تھا اور ان کا ماننا تھا کہ کبھی بھی کسٹمر کو ناں نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ کاریگر جانے والے تھے۔ میٹریل موجود تھا۔ فراکوں کے دامن اور گلے پر اسٹون ورک ہوا تھا۔ صرف اسٹون ورک کے لیے ہی انہیں آٹھ گھنٹے چاہیے تھے۔ معذرت کے ساتھ انہوں نے انکار کر دیا۔

"آپ کو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔" افق کو انکار پر اعتراض تھا۔

"کیا کرتی۔ دو گھنٹے تک سب ہی کاریگر چلے جائیں گے۔ انہیں کل دن میں بارہ بجے تک چاہیے۔"

"آپ ان سے بات کریں اور ان سے کہیں کہ اگر اسٹون ورک تھوڑا ہلکا ہو جائے تو۔ آپ جانتی ہیں کہ بچے ایک چیز پسند کر لیں تو انہیں وہی چاہیے ہوتا ہے۔"

"تو بھی ہم کیسے کام کریں گے افق۔ وقت نہیں ہے۔"

"آپ کاریگروں سے بات کریں میڈم۔ اگر وہ آج رات کام کر لیں گے تو آپ انہیں کل کی چھٹی دے دیں۔"

"اگر کل انہیں چھٹی دے دی افق! تو باقی آرڈر کون تیار کرے گا۔ ہم صرف تین بچوں کے لیے اتنا کچھ کیوں کریں گے؟"

"ہو سکتا ہے' وہی میڈم ہمیں اور آرڈرز بھی دے دیں۔ وہ ہماری باقاعدہ کسٹمر بن جائیں۔ ہمیں ان سے آرڈر ملتے رہیں۔"

"لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ نہ ہو۔"

"فائدہ ہو بھی سکتا ہے۔ ہماری فیکٹری میں ایسے آرڈرز کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔"

کافی دیر تک سوچنے کے بعد انہوں نے بیگم کو فون کیا۔ انہیں تفصیل میں بتایا کہ انہیں کتنے کام میں فراکیں مل سکتی ہیں۔ اس نے ہاں کہہ دی۔ اپنی مرضی کے تین مختلف رنگ بتا دیے۔ رنگ سازی مسز گوہر خود ہی کر لیتی تھیں۔ رنگ ساز افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک مقامی ادارے میں دو گھنٹے ہر روز جا کر انہوں نے رنگ سازی سیکھ لی تھی۔ سفید شیفون کو انہوں نے بیگم کے بتائے رنگوں میں رنگا۔ اس دوران افق نے چوڑی دار پاجامے کاٹ دیے۔ سلائی ماسٹر وہ پاجامے سینے لگے۔ سارے کاریگر رات بھر کام کے لیے مان گئے تھے۔ اگلے دن کی چھٹی بھی انہیں مل رہی تھی اور رات کے کام کے الگ پیسے بھی۔ گھر فون کر کے افق نے اپنے کام کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مسز گوہر ایک بار اس کے گھر جا کر اماں سے مل آئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔

رات بھر کام ہوتا رہا۔ دونوں کاریگروں نے مل کر پہلے ایک کو اڈے پر لگایا۔ اس پر کام کیا۔ پھر دوسری کو۔ اس دوران سلائی ماسٹر ان کی ڈبل سلائی کرتے رہے۔ مسز گوہر اور افق دوپٹوں پر دوسری مشینوں سے بناری فیتہ لگاتی رہیں۔ مسز گوہر نے ہی انہیں کھانا منگوا دیا تھا۔ درمیان میں آدھے گھنٹے کے وقفے سے وہ لوگ باری باری آرام کرتے رہے تھے۔ صبح فجر کے وقت دونوں کاریگر اپنے کام سے فارغ ہو کر چلے گئے۔ اگلے تین گھنٹوں میں ماسٹر صاحبان بھی چلے گئے۔ آخری مراحل میں دونوں نے سلائیاں چیک کیں۔ سائز کو ملایا۔ انہیں استری کیا اور پیک کر دیا۔

جمال افق کو لے کر گھر چلا گیا۔ بارہ بجے بیگم اپنے ڈرائیور کے ساتھ آکر سائز اور کام چیک کر کے لے گئیں۔ بیگم وہی قیمت دے گئی تھیں جو مسز گوہر نے مانگی تھی۔ انہوں نے ایمرجنسی کام کیا تھا۔ مسز گوہر نے ڈبل قیمت مانگی تھی۔ وہ ڈبل ہی دے گئی تھیں۔

"بس بچے ہیں نا۔ جو چیز دیکھ لیتے ہیں' وہی مانگتے ہیں۔ میں کل ہی انگلی سے آئی تھی۔ خریداری کرنے نکلی تو ایک ہی فراک بیٹی کو پسند آگئی اور وہی بھانجی کو۔ میری سسٹر نے کہا کہ اب باقی سب بھی ایسی ہی مانگیں گی۔ میرے لیے تو بہت مشکل ہو جاتا۔ پھر اتنا رولی ہیں نا یہ سب۔"

یہ ان کا پہلا آرڈر تھا' جسے انہوں نے راتوں رات مکمل کیا تھا۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ شاید' نہیں ایسا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا کاریگروں کو چھٹی دینی پڑی اور اب اگلے آرڈر لیٹ ہو جائیں گے۔

دو دن وہ اسی پچھتاوے میں رہیں۔ افق سے بھی ذکر کیا۔ وہ شرمندہ ہوئی کہ شاید اسی کے مشورے کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ لیکن ایسا ہوا کہ کچھ برا نہیں ہوا۔ بلکہ بہت اچھا ہو گیا۔ وہی بیگم ایک ہفتے بعد اپنی بہن کے ساتھ ان کے پاس موجود تھیں۔ دو ماہ بعد ان کی بہن کے دیور کی شادی تھی برطانیہ میں۔ بہن بھی وہیں کی رہنے والی تھیں۔ بہن نے اپنی دو بیٹیوں' نند کی تین' جیٹھ کی ایک بچی کا سائز لکھوا دیا۔ رنگ اور ڈیزائن نوٹ کروا دیے۔ لہنگے' چولی' انار کلی' چوڑی دار' گھیردار شلوار وغیرہ۔ انہوں نے الگ الگ سب کے لیے تفصیلات بتا دیں۔ چار فنکشنوں کے لیے چھ بچیوں کے کپڑوں کا آرڈر مل گیا۔ بجٹ وہ بتا گئیں اور اچھا خاصا ٹھیک ٹھاک بجٹ تھا وہ۔ صرف اپنی ہی بچی کے لیے بارات کی انار کلی فراک وہ چالیس ہزار کی بنوا رہی تھیں۔ آرڈر تیار کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ماہ تھا۔ وہ آرام سے بنا سکتے تھے۔ کاریگروں کے ساتھ مسز گوہر کا بونس کا وعدہ تھا۔ اس آرڈر پر انہوں نے ہر کاریگر کو بونس دیا۔

چند ڈیزائن جو وہ منتخب کر گئی تھیں۔ ان میں سے ایک شرارے کا ڈیزائن تھا' جو افق کا تیار کیا گیا تھا۔ شرارہ بہت ہلکا پھلکا سا تھا۔ فیروزی رنگ کا شرارہ تھا اور ہلکے گلابی رنگ کی کرتی تھی۔ کرتی پر سفید اسٹونز کا چھن تھا۔ دوپٹا فیروزی اور گلابی رنگ کا تھا اور اس پر بھی سفید اسٹونز کا چھن تھا۔

پندرہ دن میں انہوں نے اپنے کام کے دوران ان کا آرڈر بھی تیار کر دیا۔ اپنا پہلا فارن آرڈر۔ سارا سامان برطانیہ بھجوا دیا۔

پے منٹ وصول کرتے ہی انہوں نے تین اور بچیوں کے سائز نوٹ کروائے۔ ایک ہفتے بعد چھ اور بچیوں کے۔ مسز گوہر تین سال سے بارہ' تیرہ سال کی بچیوں کے کپڑے بناتی تھیں۔ لیکن پر زور درخواست کے ساتھ انہوں نے چھ ماہ' نو ماہ' ڈیڑھ سال' اٹھارہ سال کی بچیوں کے لیے بھی کپڑے بنوا لیے۔ انہوں نے شاید شادی میں شرکت کرنے والے ہر خاندان میں موجود ہر بچی کا سائز انہیں لکھوا دیا تھا۔ اسی آرڈر سے منسلک ان سے تین' چار مختلف لڑکیاں فون پر گاہے بگاہے بات کرتی اور بتاتی رہتیں کہ انہیں کس طرح کے کپڑے چاہئیں۔ ان کا پہلا فارن آرڈر جس سے انہیں ایک بڑا منافع ملا۔ برطانیہ جیسے ملک میں جہاں شادی بیاہ کے روایتی کپڑوں کی خریداری مشکل کام ہے اور چھوٹی بچیوں کی تو بہت ہی مشکل ہے۔ ان میں ان کے ہاتھ ایک لوکل ڈیزائنر آ گئی جو کہ ان کے نزدیک بہت مناسب قیمت پر اچھے کپڑے بنا کر دے دیتی تھیں۔

اس آرڈر کو تیار کرنے میں انہیں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب آئے دن انہیں وہاں سے فون کالز آنے لگیں اور وہاں سے گاہے بگاہے آرڈرز ملنے لگے۔ وہ ایک دوسرے کا ریفرنس دے دے کر کہتیں کہ انہیں فلاں نے ان کا نمبر دیا ہے' فلاں نے دیا ہے۔ ایک سے دو اور دو سے کئی دوسرے کسٹمرز انہیں آرڈر دینے لگے۔

☼ ☼ ☼

"ماما۔ یہ جو لڑکی آپ کے ساتھ کام کرتی ہے نا۔ اسے کسی یورپین ملک میں ہونا چاہیے تھا۔"

"وہ کیوں۔؟"

"ارے ماما۔ یقین جانیں۔ میں نے ابھی تک کسی لڑکی کو سائیکل کے پیچھے ایسے بیٹھتے نہیں دیکھا۔ سارے لاہور میں ایک ہی واحد لڑکی ہو گی سائیکل کے پیچھے بیٹھنے والی۔"

"تم نے سارا لاہور دیکھ لیا؟" وہ مسکرائیں۔

"سارا نہیں دیکھا۔ جتنا بھی دیکھا ہے۔ اس میں وہ واحد ہے۔ شاہراہ قائد اعظم جیسی پر رونق سڑک پر سائیکل پر بیٹھ کر سفر کرتی ہے۔ بہت اعتماد ہے اس میں۔ نہیں فرزام! وہ ان باتوں کو معمولی جانتی ہے۔ اگر پاکستانی معاشرے میں نہ ہوتی تو وہ خود سائیکل چلایا کرتی۔ بس کی کنڈیکٹر بھی بن جاتی۔ مکینک بن جاتی۔"

"اسی لیے تو کہا کہ اسے یورپ میں ہونا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی چادر لپیٹ کر وہ پیچھے بیٹھتی ہے' کسی دن سائیکل میں چادر پھنس گئی نا' تو جس سڑک پر وہ گرے گی' وہ سڑک ہی اٹھ گئی۔"

"ایسے نہ کہو پاگل۔"

"ارے ماما۔ محنت سے کام کرنے والوں کے لیے پاکستان بہت سخت ملک ہے۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر۔ عزت بھی سنبھالو' کپڑے بھی اور انا بھی۔ ان حالات میں پاکستانی عورت دنیا کی دوسری عورتوں سے زیادہ محنتی ہے اور اگر یہاں عورت کا معاشرہ ذرا سا ساتھ دے تو یہ عورت کہاں سے کہاں جا پہنچے۔"

"تمہیں وہ سائیکل پر بیٹھی اچھی نہیں لگتی؟"

"مجھے ہی نہیں ماما! بڑا بونا سمجھتا ہوں میں خود کو اس کے سامنے۔ اس کے سامنے ہی نہیں' اپنے بھائی اسلم کے سامنے۔ جمال اور اسد کے سامنے۔ اس دن افق نے دس بار اسے گھر بھیجا چیزوں کے لیے۔ ماما! وہ دس چکر لگا کر آیا۔ پانچویں چکر میں' میں نے اسے پیسے دیے کہ رکشہ کر لو اور اس میں سب چیزیں لے آؤ تو بولا' فرزام بھائی! آپ کو کتنی عادت ہے پیسے ضائع کرنے کی۔ ان پیسوں میں ایک کلو سیب آ جائیں گے۔ انہیں لیں اور کھائیں۔ میرے پاس وقت بھی ہے اور طاقت بھی۔ مجھے انہیں استعمال کرنے دیں۔ جیسے اس نے دس چکر لگائے ماما! میں اسے دیکھ دیکھ کر تھک گیا۔ لیکن وہ نہیں تھکا۔ پچھلے ہفتے میں ان کے ریلس چلا گیا۔ اتنی گندی جگہ پر تھا ماما! کہ بتا نہیں سکتا۔ وہ تنگ گلی ہوئی جس نالے سے گزر کر آگے ریلس خانہ تھا اور اتنی بدبو اور گرمی تھی۔ اسد اتنا پیارا لڑکا ہے۔ نیلی آنکھیں ہیں اس کی۔ اتنا خوبصورت ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ مجھے بہت ترس آیا اسے اتنے گندے حلیے میں وہاں دیکھ کر۔ میں نے جمال سے کہا کہ میں اس کے لیے کسی اور نوکری کا پتا کر دوں تو کہتا ہے کہ ہمارے مالک نے ہمیشہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔ آج کل وہ بیمار ہیں۔ ان کا کام ہم سنبھال رہے ہیں۔ ایسے انہیں چھوڑ کر کبھی بھی نہیں جائیں گے۔" وہ بے حد متاثر نظر آ رہا تھا

مسز گوہر مسکرا دیں۔

"ماما! میں نے آپ کو کبھی بتایا نہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی کے اس طرح بدل جانے پر بہت دکھی تھا۔ برطانیہ سے نکالے جانے پر۔ اس بنا بجلی کے ملک میں رہنے پر۔ اور اب میں بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔ کیونکہ لاکھوں سے کم تر ہو کر کروڑوں سے میں بہتر ہی رہا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اصول اور فلسفہ نہیں بنایا۔ جمال کے پاس اصول ہیں۔ اسد کے پاس بھی ہیں۔ ماسٹر جی اور اسلم کے پاس بھی ہیں اور پانی بیچنے والے بچے تک کے پاس اصول ہیں۔ لیکن میرے پاس نہیں۔ ماما! جب ہم ایک پر آسائش زندگی گزارتے ہیں نا تو ہم صرف چیزوں کے نام اور انہیں استعمال کرنا ہی سیکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم جدوجہد میں آتے ہیں۔ مصائب کا شکار ہوتے ہیں نا تو ہی ہمیں اپنے اصل اور نقل کا پتا چلتا ہے۔ تب ہی ہم تانبے سے سونا بنتے ہیں۔ یہ ماسٹر جی ہیں۔ مشین خراب ہو جاتی ہے۔ گھنٹوں ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ یہ ان کا کام نہیں۔ پنکھا خراب ہوا۔ وہ بھی ٹھیک کر دیا۔ خود ہی جا جا کر پیٹرول لاتے رہتے ہیں جنریٹر کا۔ کبھی نہیں جتایا کہ میں تمہارے اتنے کام کرتا ہوں۔ اسلم کو میں نے اپنی کچھ شرٹس دینی چاہیں تو کہتا ہے بھائی جی! کسی ضرورت مند کو دیں۔ میں تو اچھے خاصے رزق والا ہوں۔ اگر ایک بار لینے والوں میں سے ہو گیا تو دینے والا کبھی بھی نہیں بن سکوں گا۔" ماما! وہ دینے والا بننا چاہتا ہے بتائیے مجھے ماما! عظمت کی اور کیا نشانیاں ہوتی ہیں۔"

مسز گوہر گود میں رکھے اس کے سر کو پیار سے سہلاتی رہیں۔

"اس دن آپ اسٹور جانے لگیں۔ آپ اپنے کپڑے اور جوتے نکال کر رکھ گئیں۔ ماما میں نے دیکھا کہ افق نے آپ کی جوتی کو کپڑے سے صاف کر دیا اور ویسے ہی واپس رکھ دی کہ آپ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس نے صاف کی۔ میں کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی آپ کے جوتے تو کبھی میں نے بھی صاف نہیں کیے۔"

"مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ میرا بہت احترام کرتی ہے۔ میں جانتی ہوں' وہ ایسی ہی ہے۔"

"وہ جیسی بھی ہے۔ ایسے بنے بنائے تو پیدا نہیں ہوتے نا؟ ایسا تو خود کو بنانا پڑتا ہے۔ اب آپ مجھے بتائیے کہ کیا میں کچھ کچھ ان سب کے قریب کا ہو سکتا ہوں؟"

"میرا بیٹا بہت پیارا ہے۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

فرزام نے کالج میں بی ایس سی کرنے کے لیے ایڈمیشن لے لیا۔ اس کے پاس اب اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ کالج جا سکے۔ آمدنی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ کالج سے آکر وہ آرڈرز کے لیے چلا جاتا۔ دوسرا لڑکا ان آرڈرز کو سپلائی کر دیتا۔ باقی لوگوں سے مسز گوہر فون پر رابطہ کر لیتیں یا خود چلی جاتیں۔ اب ان کے پاس چار کاریگر اور تین ماسٹر جی ہو گئے تھے۔ بہت سی بڑی دکانوں والے انہیں گھر کے آفس میں آکر مل لیتے تھے۔ وہیں سب حساب کتاب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے کپڑے کے بنے پاؤچ کا کام بھابھی کے سپرد تھا۔ یہ ان کے کپڑوں میں مفت کا آئٹم تھا' جو انہوں نے شامل کیا تھا۔ اس آئٹم کے شامل کرنے سے ان کے کپڑوں کی مانگ میں اضافہ ہوا تھا۔ چھوٹی بچیوں کو ہینڈ بیگ اور پرس کا بہت شوق ہوتا ہے۔ تو اس سے کپڑے کی فروخت میں واضح فرق آیا۔ کپڑے کے یہ پاؤچ کسی وقت میں افق اور بھابھی نے درجنوں کے حساب سے بنائے تھے۔ یہ پاؤچ دلہنوں کے لیے بنوائے جاتے تھے۔ اس نے مسز گوہر کو بچیوں کے لیے چھوٹے سائز میں بنانے کا مشورہ دیا' جو انہیں اچھا لگا اور ان کا آئیڈیا مقبول ہو گیا۔ یہ آئیڈیا فارن آرڈرز کے ساتھ بھی مقبول ہوا۔ انہیں تھیم بتائی جاتی اور ایک سے بڑھ کر ایک بنوائے جاتے۔ ان کا یہ آئٹم ریڈی میڈ کپڑوں کے ساتھ مفت تھا۔ لیکن جب انہیں تھیم بتائی جانے لگی تو اس کا معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ ان کی پسند کے عین مطابق۔

"یہ کام بننے کا وقت ہے۔" مسز گوہر بہت خوش تھیں۔

"کیا مطلب؟"

"انسان پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ لاکھ کوشش پر بھی۔۔۔ اس وقت کے اثرات ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں۔۔۔ اور ایسے ہی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سب کچھ سنورتا چلا جاتا ہے۔ ہر بگڑی بات بننے لگتی ہے۔۔۔ تو یہ وقت کام بننے کا ہے ہمیں اور آئیڈیاز پر کام کرنا چاہیے۔"

"مثلاً۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"تم بھی سوچو افق! کیا ہونا چاہیے۔"

"میں تو ایک عرصے سے سیل کا سوچ رہی ہوں۔"

"سیل کا۔۔۔"

"جی۔۔۔ ہم ایک ہی قیمت پر کپڑے تیار کرتے ہیں۔ منافع رکھ کر سیل لگا لیتے ہیں۔"

وہ سوچنے لگیں۔۔۔ "اس کے لیے الگ سے تیاری کرنی ہو گی۔ جگہ بھی ڈھونڈنی ہو گی۔ فرزام سے کہتی ہوں معلومات کرے۔ اگر کسی بڑے ایونٹ میں اسٹال مل جائیں تو بہت زبردست رہے گا۔ اس سے ہمیں بہت فائدہ ہو گا۔"

"جی ہاں!"

"افق! پھر تم کچھ ڈیزائن ریڈی کرو۔ کچھ پرانے پرنٹ نکالو۔ ان میں تھوڑا بہت ایڈ کرو۔ دیکھتے ہیں ان کا کیا کیا بن سکتا ہے۔"

افق بڑی ڈیزائن بک اٹھا لائی۔ اس میں ان کے تیار کردہ ڈیزائن نمونے موجود تھے۔

فرزام کو سیل کے بارے میں بتا کر وہ سب اس کی تیاری کے لیے تیاری کرنے لگے۔ فرزام نے ایک اسٹال نمائش میں بک کروا لیا۔ نمائش دس روزہ تھی اور اب انہیں پہلے دن کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کس قدر اسٹاک ریڈی رکھنا چاہیے۔ لیکن اس وقت وہ اسٹاک ریڈی کر نہیں سکتے تھے۔ اب وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اتنا کم ہو کہ انہیں منافع ہی نہ ہو اور اتنا زیادہ بھی نہ ہو کہ فروخت نہ ہونے کی صورت میں الٹا انہیں نقصان ہی ہو جائے۔

لیکن شاید مسز گوہر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ وقت کام بننے کا ہے' تو ان کا کام بن گیا۔ دس روز رات دن ان کے اسٹال پر رش رہا۔ ابتدائی چار دنوں میں ہی انہیں میٹریل کی قیمت وصول ہو گئی۔ اگلے دو دنوں کے منافع سے اسٹال کی بکنگ کے لیے ادا کیے گئے پیسے پورے ہو گئے اور باقی کے چار دن کا منافع ان کی جیب میں گیا۔ دس دنوں میں اسٹال کے لیے سب نے کام کیا۔ فرزام' اسلم' جمال سب سامان لاتے۔ اسٹال کو ڈیکوریٹ کرتے۔ مسز گوہر بھی وہیں موجود رہتیں۔ اسلم اور فرزام نے سیلز مین کی۔ افق گھر میں ہوتی اور ترتیب سے ہر دن کا سامان الگ کر کے پیک کرتی۔

سیل کامیاب ترین رہی۔ ساتھ انہوں نے پمفلٹ بھی بانٹ دیے۔ جس میں ان کے فون نمبرز اور ایڈریس تھے۔ ایسے کپڑوں کی خریداری کے لیے ان سے کبھی بھی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ گاہے بگاہے عورتیں ان کے پاس خریداری کے لیے آجاتیں۔ کچھ آرڈر دے جاتیں۔ فون پر رابطے رہتے۔ انہیں مستقل کلائنٹس مل گئے۔

مسز گوہر نے کاریگروں کے بڑے کمرے میں اے سی لگوا دیا۔

یہ پہلا اے سی تھا' جو ان کے گھر لگا۔ فرزام کا خیال تھا۔ یہ کاریگروں کے کمرے میں ہی لگنا چاہیے۔ پہلے سب اپنا دوپہر کا کھانا گھر سے لاتے تھے۔ اب مسز گوہر نے ایک کام والی رکھ لی تھی۔ اوپر کی صفائی وہ کرتی تھیں اور کاریگروں کے جانے کے بعد فرزام نیچے کا حصہ صاف کر دیتا تھا۔ اب کام والی نیچے کی صفائی کر دیتی اور ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بھی پکاتی۔ سب کاریگر ماہر ہو چکے تھے۔ ایک بار بتانے سے ہی بات سمجھ جاتے۔ ان کے کام میں غلطیاں کم ہونے لگیں۔ اب ہر وقت ان کے سر پر بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میٹریل کے لیے بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اسلم سب سمجھ گیا تھا۔ وہ اور فرزام جاتے اور میٹریل لے آتے۔ کبھی کبھی افق اور مسز گوہر اسلم کو لے کر چلی جاتیں۔ آئے دن مارکیٹ میں نئی سے نئی چیز موجود ہوتی۔ وہ پھر وہیں طے کر لیتیں کہ کون سی نئی چیز شامل کرنی ہے اور کتنی۔ مسز گوہر کے تیار کیے گئے ملبوسات میں ایک ہی بات تھی جسے خاص پسند کیا جاتا تھا۔ وہ تھی نفاست۔ وہ بچیوں کے ملبوسات کو ان کی عمر کے مطابق ہی نفیس اور نازک سا تیار کرتی تھیں اور بقول ان کے ریگولر کسٹمرز' ان کے کپڑوں میں بچیاں بہت آرام محسوس کرتی ہیں۔ کپڑے سنبھالنے میں انہیں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوتا۔

☆ ☆ ☆

"ایک بات بتائیے۔"

"جی۔۔۔" وہ ذرا پریشان سی ہو گئی۔

"ماما کو آپ کے کام میں ڈھونڈنے سے بھی خامی نظر نہیں آتی۔ کہتی ہیں بہت مختلف ہے پرفیکشن کے لیے افق۔"

"جی۔۔۔" اس جی سے اس کا مطلب تھا۔ "تو اب کیا ہو گیا؟"

"لیکن یہاں کیا ہوا؟" اس نے رجسٹر اس کے سامنے رکھا۔

رجسٹر سرخ گول گول دائروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے "لیٹر ٹو ایڈیٹر" لکھ کر دکھایا تھا۔ مسلسل تین دن سے یہ لیٹر گول گول دائرے لے رہا تھا۔

"میں نے اتنی اچھی طرح سے یاد کیا تھا۔" سر جھکا ہوا تھا۔ نظریں رجسٹر پر تھیں۔

"بی اے میں آپ انگلش کو یاد کریں گی؟"

"یہ مجھے نہیں آتی۔۔۔ تو پھر یاد ہی کرتی ہوں۔"

اس کے انداز پر ایک جاندار قہقہہ اس کے اندر ہی دم

توڑ گیا۔
"یہ آپ کو کب آئے گی؟"
"بھابھی کہتی ہیں سب کچھ یاد کرلو۔ بس انگلش میں پاس ہونے تک نمبر لے لو۔ پھر ان لیٹرز اور مضمونوں کو کون پوچھے گا۔"
"بھابھی نے تو کمال کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن آپ کیا صرف پاس ہونا چاہتی ہیں؟" افق کے نادر خیالات اسے اب معلوم ہو رہے تھے۔
"جی۔" سر بھی ہلا دیا۔
"صرف پاس۔؟"
"جی صرف پاس۔" کہتے وہ تھوڑا الجھ بھی گئی۔
"تو آپ بی اے میں کامیاب ہونا نہیں چاہتیں؟"
"پاس ہونا تو چاہتی ہوں۔ اور کامیابی کسے کہتے ہیں؟ صرف سوچا' پوچھا نہیں۔
"پاس ہونے میں اور کامیاب ہونے میں بہت فرق ہے۔ پاس ہونا کسی بھی طرح چند نمبرز لینا اور بس نکل جانا ہے۔ کامیاب ہونا اس پر مکمل گرفت رکھنا ہے۔ یہ گرفت کبھی دوبارہ فیل ہونے نہیں دیتی۔ چند نمبرز لے کر پاس ہونا تو بہت شرمندگی والی بات ہے۔ اگر مجھے میری کتاب ٹھیک طرح سے نہ آتی ہو اور میں فرسٹ آجاؤں تو میں اپنی ڈگری کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ خود کو پاس کروانا اہم نہیں۔ خود کو سب کچھ سکھانا اہم ہے۔ ماسٹر جی کوئی کپڑا غلط سی دیتے ہیں تو آپ اور ماما اسے بار بار ان سے سلائی کرواتی ہیں۔ جب تک آپ کو اس میں مطلوبہ پرفیکشن نظر نہیں آجاتی۔ مطلوبہ پرفیکشن ہر انسان کو اپنے اندر رکھنی چاہیے۔ ہر کام میں آپ کی اتنی پرفیکشن اور علم میں اتنی لاپروائی۔"
"جی۔" وہ بات کو سمجھ گئی اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔
دراصل اب وہ صرف بی اے پاس کرنا چاہتی تھی۔ اسے ایک ڈگری چاہیے تھی۔ پہلے بھی وہ کتابوں کو چاٹ لیا کرتی تھی۔ اب اس کی ساری دلچسپی صرف اور صرف اپنے کام کے ساتھ تھی۔ وہ کام سے نہیں تھکتی تھی۔ پندرہ منٹ بیٹھ کر پڑھنے سے تھک جاتی تھی۔ اس کے ہاتھوں پیروں کو' دل و دماغ کو کام سے عشق ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہ ہی وہ واحد کام تھا جس میں وہ کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ ایک انچ کی غلطی بھی نہیں کرتی تھی۔ کرتی تو اسے ٹھیک کرنے میں جت جاتی تھی اور یہ قدرتی بات ہے کہ جو کام پھل دے' تعریف دے' اطمینان دے' اسے ہی کرتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اب اس کا کام صرف کام نہیں رہا تھا۔ لیکن پڑھنا اس کے لیے کام جیسا بن گیا تھا۔ ایک بوجھ' وہ ڈگری لینا چاہتی تھی۔ تاکہ برے وقت میں کام آسکے۔ اس نے اتنے برے وقت دیکھے تھے کہ وہ اب بہت سے کام اکٹھے کرلینا چاہتی تھی۔ جو اس کے برے وقت میں کام آجائیں۔ رات کو وہ تین گھنٹے آرام سے پڑھ سکتی تھی۔ لیکن وہ کپڑوں اور میٹریل کے بارے میں سوچتی رہتی۔ ذہن میں نت نئے خاکے بناتی رہتی۔ اماں کی طبیعت اور صحت کافی بہتر رہتی تھی۔ وہ گھر کو دیکھ لیتی تھیں۔ جو قرضہ تھا' وہ بھی انہوں نے ادا کر دیا تھا۔ گھر کے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ وہ شام کو گھر آکر کتابیں لے کر ضرور بیٹھ جاتی تھی۔ لیکن پڑھ نہیں پاتی تھی۔
مسز گوہر نے فرزام سے کہا کہ وہ افق کی مدد کر دیا کرے۔ اس نے اسے کچھ اچھی گرامر کی کتابیں لادیں۔ وہ ایک باب اسے پڑھا دیتا۔ بتا دیتا کہ اس میں اسے کیا کیا کیسے کیسے کرنا ہے۔ ٹاپک دے دیتا جس پر اسے مضمون لکھنا ہوتا اور وہ یاد کرکے مضمون اسے لکھ کر دکھا دیتی۔ وہ ریفرنس تک یاد کرتی تھی۔ ایک پیرا اپنے الفاظ میں نہیں لکھ سکتی تھی۔
"ہم کورس کی کتابوں کو چھوڑ کر صرف گرامر کرلیں ابھی۔؟ پاس ہونے کے لیے نہیں۔ انگلش پر گرفت کے لیے؟"
اس نے اثبات میں سرہلا دیا اور وہ کیا کرتی۔ نہیں کرنا بھی چاہتی تھی تو بھی ہاں کہنا پڑا۔ اس کی گرامر شروع ہو گئی۔ ہر لائن پر کراس لگنے لگے۔
"آپ نے پریکٹس نہیں کی نا؟"
"کی تھی۔ رٹنے کی تھی۔"
اس نے پریکٹس ضرور کی تھی۔ لیکن دو گھنٹے پہلے اس کے پوچھنے پر وہ ڈر گئی تھی۔ اس کے سامنے زیادہ بونا نہیں چاہتی تھی۔
"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ "یو" کے ساتھ "از" کا استعمال کریں۔ "آئی" کے ساتھ "آر" اور "وی" کے ساتھ "ایم" کا۔ لیکن پیپر چیک کرنے والے پر بہت برا اثر پڑے گا اور اگر یہ استعمال آپ نے پبلک میں کیے تو سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔"
شرمندگی سے وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں سکی۔ میٹرک اور ایف اے میں بھی اس نے انگلش کے ساتھ یہی کیا تھا۔ یاد کر کرکے لکھتی رہی تھی۔ تھوڑی بہت گرامر کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر بھابھی نے کہا۔ "تمہیں اتنا ٹائم کہاں ہوتا ہے۔ یاد کرتی جاؤ بس۔" جو یاد کیا تھا اس میں یہ نہیں معلوم تھا کہ "آئی" کے ساتھ کس کا استعمال کرتے ہیں۔ ماضی کیا ہے' ماضی بعید کسے کہتے ہیں۔ فعل حال کا استعمال کہاں کرنا ہے۔
فرزام نے اسے "یو" اور "آئی" کا سمجھا کر دو سو جملے لکھنے کے لیے دے دیے۔ گرامر کی کتاب اس کے ہاتھ میں دی اور اگلے دن کام کرکے لانے کے لیے کہا۔ افق چھٹی کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے آفس میں بیٹھ کر اسے پڑھ لیا کرتی تھی۔ باقاعدگی سے نہیں' کبھی کبھار۔ رات گئے تک وہ دو سو فقرے لکھتی رہی۔ اگلے دن ان میں سے صرف چالیس ہی ٹھیک نکلے۔ لیکن اس سے یہ ہوا کہ وہ "آئی ایم اور یو آر" کے استعمال کو اچھی طرح سیکھ گئی۔
سیکھنے اور محنت کرنے سے سب کچھ آجاتا ہے۔ اسے گرامر کرنے میں مزا آنے لگا۔ روز رات کو وہ دو دو سو فقرات لکھ کر ہی سوتی۔ غلطیاں ہوتی رہیں۔ غلطیوں کی درستی بھی ہوتی رہی۔ وہ ایک آدھ لائن اپنے الفاظ میں لکھنے لگی۔ نیند اسے ویسے ہی نہیں آتی تھی۔ دن بھر کے کام سے تھک جاتی تھی۔ لیکن آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی تعمیر کو مکمل اور مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ دوبارہ اسے سڑکوں پر بھاگنا اور کسی کونے میں بیٹھ کر رونا نہ پڑے۔

☆ ☆ ☆

"ماما! سچ بولیں گی؟"
مسز گوہر نے فریش جوس کا گھونٹ لے کر اسے دیکھا۔ "چاہو تو جھوٹ بھی بول سکتی ہوں۔"
دونوں آمنے سامنے ڈنر ٹیبل پر ایک اچھے ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ فرزام انہیں اپنی بائیک پر بٹھا کر لایا تھا۔ وہ کبھی بائیک نام کی چیز پر نہیں بیٹھی تھیں۔ آگے پیچھے سے وہ لوگ بھی انہیں پکڑ کر بیٹھے رہتے تو بھی انہیں یہی خوف رہتا کہ وہ گر جائیں گی۔ فرزام انہیں زبردستی بٹھا لایا۔ سائیکل چلانے والے بھی ان سے آگے نکل گئے اور مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ بہت تیز چلا رہا ہے۔ صرف فرزام کی خوشی کے لیے وہ بیٹھ گئی تھیں۔
"اگر میں کہیں جانا چاہوں تو آپ کیا کہیں گی؟"
مسز گوہر ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔
"تمہیں آزادی ہے جانے کی۔ جہاں چاہے جاؤ اور اپنا کیریر بناؤ۔"
"میں نے آپ سے پہلے ہی سچ کا پوچھا تھا۔ آپ کو اس سوال کا جواب ہر حال میں سچ ہی دینا ہوگا۔ آپ میرے جذبات کو ایک طرف رکھ دیں۔ میں اور آپ وہ لوگ بن جاتے ہیں۔ ماں' بیٹا نہیں' اب یہ وہ لوگ صرف سچ بولیں گے۔ صرف سچ۔"
انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ "میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی فرزام! پہلے تمہارے بابا گئے۔ پھر اطہر چلا گیا۔ پھر اطہر کو ہمیں چھوڑنا پڑا۔ میں اپنی زندگی کو کتنا بھی فعال کرلوں۔ لیکن ان دو لوگوں کے نہ ہونے سے اندر بہت سے حصے جامد ہیں۔ اگر تم اسٹڈی کے لیے کہیں جانا چاہتے ہو تو ہم پلاننگ کر سکتے ہیں۔"
"کیسی پلاننگ؟"
"کوئی بھی۔" یہ کہتے ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔
"میرے ساتھ چلی جائیں گی' پھر سب کچھ چھوڑ

چھوڑ کر؟"
"تم سے زیادہ کچھ بھی قیمتی نہیں۔ میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی۔"
"میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔"
"تم کہاں جانا چاہ رہے تھے؟"
"امریکا اپلائی کر دیا ہے۔ آن لائن کچھ ٹیسٹ بھی دیے ہیں۔ امید ہے اسکالر شپ مل جائے گی۔"
"بہت برائٹ چانس ہے۔ تمہیں مس نہیں کرنا چاہیے۔"
"آپ استھما کی مریض ہیں۔"
"میں خود کو سنبھال سکتی ہوں۔"
"ہر بار میں آپ کو ان ہیلر ڈھونڈ کر دیتا ہوں۔"
"اب میں یاد رکھنا شروع کروں گی۔"
اس بات کے بعد دونوں کافی دیر تک خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔
"میں افق سے شادی کر لوں؟"
مسز گوہر نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ کو ٹھیک نہیں لگی میری بات؟" ان کے ایسے دیکھنے پر وہ گھبرا گیا۔ "ارے نہیں ماما! میرا کوئی چکر وکر نہیں ہے اس کے ساتھ۔"
"محبت کرتے ہو اس سے یا تمہیں بھی بہت خوب صورت لگتی ہے؟"
"محبت کیسے کروں؟ محبت سے تو بہت نفرت ہے مجھے۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گی۔ آپ کا خیال رکھے گی۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہے وہ۔ اچھی لڑکی ہے۔ کم از کم بھابھی کی طرح کسی تکلیف کا باعث نہیں بنے گی۔"
"مستقبل کر رہے ہو اسے؟" مسز گوہر کو بیٹے کی یہ بات بری لگی۔
"آپ تو مجھے غلط ہی سمجھے جا رہی ہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ چیزوں کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی خوبیاں دیکھو۔ پھر انہیں اپنے قریب آنے دو اور یہ کہ خود کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ جڑے لوگوں کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔ ماما! میں ایک ہی لڑکی کو جانتا ہوں۔ افق کو۔ وہ ڈھائی سال سے ہمارے یہاں کام کر رہی ہے۔ سارا دن یہیں رہتی ہے۔ جن لڑکیوں کا میں اکیڈمی میں استاد ہوں۔ وہ تک مجھے چھیڑنے سے باز نہیں آتیں۔ آتے جاتے کئی بار دیکھا ہے کالج کی جو لڑکیاں میری دوست ہیں۔ وہ صرف دوست رہنا نہیں چاہتیں۔ رات رات بھر مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان سب حالات کو دیکھ کر مجھے تو لگتا ہے کہ میں تو کل ٹائم ہٹ ہوا ہوں۔ بہت خاص بہت عام ہوں۔ لیکن افق کے لیے میں میڈم کا بیٹا ہوں اور جب اسے پڑھاتا ہوں تو صرف استاد ہوں۔ تو یہ بھی شرافت بہت بڑی چیز ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"
سر ہلا کر صرف اسے دیکھا۔ یعنی اس کی بات سے اتفاق ہے۔
"میرا خیال ہے زیادہ خوبیوں اور کم نقائص والے لوگ اچھے سے دوست بن کر اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ میرے کمرے کے ایک کونے میں ردی کی وہی چیزیں ترتیب سے رکھی ہیں تو آپ نے دیکھی ہی ہوں گی۔ یہ چیزیں مجھے ہر روز بتاتی ہیں کہ کوئی محبت کرنے والا نہ ملے۔ لیکن قدر کرنے والا ضرور ڈھونڈ لینا چاہیے۔ محبت کرے نہ کرے ساتھ ضرور دے۔ ماما! میں زندگی میں بڑی تباہی سے بہت ڈرتا ہوں۔ اب میں فٹ پاتھ پر آ جانے سے نہیں ڈرتا۔ اپنی زندگی میں موجود کسی شخص کے غلط نکل آنے سے ڈرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بھی میرے لیے بڑی تباہی ہوگی۔ ردی کو میں جا کر اپنے ضرور سنا آیا تھا۔ لیکن بہت عرصے تک اسی کے لیے چھپ چھپ کر روتا رہا ہوں۔ اس نے محبت نہیں کی۔ لیکن میں نے کی تھی۔ اگر وہ ایک بار مجھے فون کر کے کہے تو میں بھاگا جاؤں اس کے پاس۔ میں اسے معاف کر دوں گا۔ اگر محبت میں بھی معاف نہ کیا جائے تو کس جذبے میں کیا جائے؟ لیکن میں جانتا ہوں اگر میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کی منت بھی کی تو بھی وہ نہیں مانے گی۔ اسے اس نقشے سے بہت محبت ہے جو اس نے خود اپنی زندگی کے لیے بنایا ہے۔ وہ اس میں تبدیلی نہیں کرے گی۔ ایک بار میں اس تباہی کا شکار ہو گیا۔ دوبارہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے اپنی زندگی میں غلط لوگ نہیں چاہئیں۔ اگر یہ لالچ ہے تو ہاں! مجھے اچھے لوگ چاہیے ہیں، صرف اچھے۔"
مسز گوہر اپنے بیٹے کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھیں اور یہ جان کر انہیں بہت دکھ ہوا کہ ان کے بیٹے کے اندر ایک اور ہی سفر جاری ہے۔ وہ بہت گہرا ہو گیا ہے۔
"افق۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ پھر توقف سے بولیں۔ "بہت مختلف لڑکی ہے فرزام! میں اس میں نقص نہیں نکال رہی۔ لیکن وہ مجھے بہت زیادہ مشین اور تھوڑی سی انسان لگتی ہے۔ کبھی تم نے اسے ہنستے دیکھا؟ میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اس کی مدر جو اس کے کپڑے لاتی ہیں وہ انہیں استعمال ہی نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ اسے نئی چیزیں اچھی ہی نہیں لگتیں۔ اس کی مدر نے مجھ سے شکایت کی کہ وہ صرف ایک وقت کا کھانا کھاتی ہے۔ رات میں بمشکل دو گھنٹے سوتی ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ نہ اسے بھوک لگتی ہے نہ ہی نیند آتی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی، لیکن وہ خاموش رہی۔ کبھی کبھی منہ چھپا کر اپنی آنکھیں صاف کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی اداسی تو اسے پہلی بار ملنے والا ہی جانچ لیتا ہے۔ وہ ہنستی نہیں، بولتی نہیں۔ کسی خواہش، کسی خواب کا ذکر نہیں کرتی۔ بس تم اس کے آگے کام کا ڈھیر لگا دو۔ وہ سر جھکائے کرتی رہے گی۔ جیسے کاموں میں خود کو چھپا رہی ہو، دفنا رہی ہو۔ مجھے وہ بہت پیاری ہے۔ لیکن فرزام! تم ایسی روبوٹ سی لڑکی سے شادی کر لو گے؟ ٹھیک ہے۔ تم محبت کا ذکر نہیں کر رہے۔ تباہی کا کر رہے ہو۔ ایسی خاموشیاں بھی تباہی بن جایا کرتی ہیں۔ جب میں اس کی عمر میں تھی تو میرے پاس اس سے زیادہ مسائل تھے۔ میرا گھر اس کے گھر سے زیادہ چھوٹا تھا۔ میں اس سے زیادہ غریب تھی۔ لیکن زندگی سے میرا ناتا ٹوٹا نہیں تھا۔ زندگی سے ناتے اسی وقت ٹوٹتے ہیں، جب اندر کوئی تباہی برپا ہو۔ کوئی بھرم، کوئی خواب ٹوٹ چکا ہو۔ یہ سب اس کی مدر کی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ حالات کے بدترین ہو جانے کی وجہ سے بھی۔ شاید ہی وہ اپنے آپ سے باہر نکل سکے۔ اگر وہ تمہاری اچھی دوست بن کر زندگی گزار سکتی ہے تو مجھے اس کی ساس بننے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
یہ سب باتیں جو فرزام کی ماں اسے کہہ رہی تھیں۔ ان باتوں پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور یہ کوئی ایسی بری باتیں بھی نہیں تھیں۔ حساسیت تھی ان میں اور یہ حساسیت افق میں پائی جاتی تھی۔ ان سب پر سوچا جا سکتا تھا۔ بات کی جا سکتی تھی۔ لیکن اس بنا پر اسے مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔
وہ ایک بار تو افق سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بات کیسے کرتا؟ جہاں وہ کام کرتی تھی وہاں اتنے لوگ تھے۔ باہر اس کے ساتھ وہ جائے گی نہیں۔ بلکہ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوگی کہ اس سے باہر جانے کا کہہ سکے۔ بہانے سے وہ اسے لے کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں اسے کبھی اچھی نہیں لگتی تھیں کہ "افق! جاؤ، ذرا فرزام کے ساتھ چائے پی آؤ" یا "وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"
اسی عالم میں چند دن گزر گئے۔ اتفاق سے اتوار کو شام کے وقت ایک فٹ پاتھ پر اسے وہ کھڑی نظر آ گئی۔ وہ جھک کر کچھ میگزینز دیکھ رہی تھی۔ اتوار کو اکثر فرزام پرانی انار کلی جا کر پرانی کتابوں کی چھانٹی بہت دل لگا کر کرتا تھا اور بہت اعلا درجے کی کتابیں چھانٹ کر لے آتا تھا۔ وہ کافی دیر سے ایک ایک اسٹال پر کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ ذرا دور اسے وہ بھی نظر آ گئی۔ وہ جلدی جلدی سب ہی میگزینز دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے خاص چیز کی تلاش ہو۔ وہ اس کے قریب گیا اور سلام کیا۔
"کچھ خاص ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس کے ہاتھ میں فیشن میگزینز تھے۔ افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"میں مدد کروں؟"
"مجھے مل گیا ہے میگزین۔" وہ جو میگزین دیکھ رہی

تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کیا اور کتب فروش کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شاپر میں ڈال دیا۔

فرزام نے پیسے دے دیے۔

"آپ نے کیوں دیے؟" وہ اس سے زیادہ الفاظ میں احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی' لیکن اتنا ہی کہا۔

"آپ ماما کے ہی کام کے لیے لے رہی ہیں نا۔ تو ماما کے بیٹے نے ادائی کر دی۔"

وہ خاموش رہی۔ احتجاج ابھی تک آنکھوں میں رقم تھا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

"ذرا میری بات سنیے پلیز۔" جتنی تیزی سے وہ آگے نکلی۔ اتنی ہی تیزی سے وہ پیچھے آیا۔ وہ رک کر دیکھنے لگی' پوچھا نہیں کہ کیا بات ہے۔

"یہ اس طرف۔" اس نے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا۔ "ریگل کے پاس ایک بہت اچھا کارنر ہے۔ آپ چلیں گی میرے ساتھ وہاں؟" اتنا کہہ کر وہ ڈر بھی رہا تھا کہ وہ میڈم کے بیٹے کے یہ پوچھنے پر اسے لفنگا سمجھ کر تھپڑ ہی نہ مار دے۔

وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ غصہ بھی جھلکنے لگا آنکھوں سے۔

"نہیں؟ خود ہی کہہ دیا۔ "چلیے! وہاں نہیں تو یہ چند قدم پر سڑک پار کر کے بہت سے لوگوں کی پسندیدہ جگہ عجائب گھر ہے۔ میں ابھی آتے آتے دیکھ رہا تھا کہ اس کا باغ بہت اچھا ہے۔ صاف ستھرا' ہرا بھرا۔"

اس کے رد عمل کا سوچ کر وہ گھبرا رہا تھا۔ چادر کا کونا دائیں کان سے دانتوں میں لیے' میگزین کو اسٹڈی فائل کی طرح ہاتھ میں ___ پکڑے وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکل رہے تھے۔ ان شراروں میں اسے دکھ بھی نظر آیا۔ جیسے اسے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ بھی دوسروں کی طرح اس کے ساتھ یہی کرے گا۔ لمحوں میں ہی ماحول بدل گیا تھا۔ وہ اسے بہت نفرت سے گھور رہی تھی اور ایسے کھڑی تھی۔ جیسے اور انتظار میں ہو کہ دکھاؤ اپنی اوقات۔ کہاں تک جاتے ہو تم؟ نکلے نا تم بھی وہی؟

"میرا یہ مطلب نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" اس کے تاثرات پڑھ کر اس نے بے چارگی سے کہا۔ "میں آپ کا استاد بھی ہوں۔ آپ کو پڑھایا ہے میں نے۔" اس کا یہ کہنے سے مقصد احسان جتانا نہیں تھا۔ اس سے اس کا مطلب اپنی شرافت بتانا تھا۔

"تو اب آپ معاوضہ لینے آئے ہیں؟" اس کے انداز نے بتا دیا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ لمحوں میں سالوں کا تاثر بدل چکا تھا۔ اس کی شرافت پر شک کیا جا رہا تھا۔ بات بگڑ چکی تھی۔ ہو سکتا ہے غصے میں اول آئے ہی نا۔ اور یہ بھی کہ وہ اس کی کوئی وضاحت سننے سے انکار ہی سہی' وہ کر دے۔ لیکن وہ اسے بدمعاش' لفنگا نہ سمجھے۔ فرزام کے مسام بھیگ گئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ کیا سے کیا بن گیا اس کے لیے۔

اسے گھور کر وہ پلٹی اور دو قدم اپنے راستے کی سمت اور اس سے مخالف سمت میں بڑھ گئی۔ اس نے صرف تھپڑ ہی نہیں مارا تھا میڈم کے بیٹے کو باقی نظروں سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دو سے چار اور چار سے آٹھ قدم چلتے اس کا وجود گواہی دے رہا تھا کہ بیچ راہ میں اس کی بے عزتی کی گئی ہے۔ پھر سے اسے صرف لڑکی سمجھا گیا ہے۔ پھر سے اس کی خوب صورتی پر نظریں رکی ہیں اور مردوں کا کام ہی کیا ہے۔ موقع ملتے ہی موقعے کا فائدہ اٹھانا۔

فرزام کی نظریں جو دور جاتی افق پر تھیں __ صاف صاف دیکھ رہی تھیں کہ وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھے گی۔ اس نے اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کیا۔ جو افق کو سمجھنا تھا وہ سمجھ لیا۔ لیکن اس نے اسے پورا سنا نہیں۔ بھیڑ میں تیزی سے جگہ بناتی وہ جا رہی تھی۔ فرزام کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایسے ہو جائے گا۔ لیکن اگر اب یہ ایسے ہی تھا تو وہ ایسے ہی نہیں چھوڑے گا۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔ آواز دے کر اسے روک نہیں سکتا تھا۔ جگہ بناتا تیزی سے اس کے پیچھے جانے لگا اور تقریباً" بھاگتے ہوئے ایک سائیکل والے کی ٹکر سے بچتے ہوئے وہ اس کے پیچھے

اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں افق!" اس نے فوراً" کہہ دیا۔ بے حد سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ "مطلب تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ میں فلرٹ نہیں کر رہا۔ تمہارا استعمال نہیں کر رہا۔ وقت گزاری نہیں چاہیے۔ ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ اس نظر والا بھی نہیں ہوں۔ مجھے ویسا تو نہ سمجھو۔"

قریب سے ایک موٹر سائیکل پوں پوں کرتی گزری۔ پرانی انارکلی کی اتوار بازار کی بھیڑ بھاڑ میں __ اسٹالوں پر "باجی' آپا' خالہ" کی آوازوں میں __ ٹریفک کے شور میں __ ہجوم کی بھنبھناہٹ میں افق کو یہ آواز بہت بڑی لگی۔ "شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

افق نے اس کی طرف ایسے دیکھا۔ جیسے دراصل وہ اسے بتا رہا ہو کہ "تمہارے پیروں کے نیچے کی زمین پھٹ رہی ہے۔ دیکھو' دیکھو! تم نیچے دھنستی جا رہی ہو۔ یہ زمین تمہیں نگل لے گی۔"

"ماما نے کہا کہ میں پہلے تم سے بات کر لوں۔"

اس نے لفظ "ماما" کو سہارا لیا۔ تاکہ وہ یقین کرے کہ اس سب کا ماں کو بھی معلوم ہے اور وہ اسے الو نہیں بنا رہا۔

"میں تو صرف بات کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد غلط نہیں تھا۔"

وہ جلدی جلدی بتانے لگا کہ مبادا وہ پھر بھاگ ہی نہ جائے۔ ایک آدمی فرزام سے ٹکرایا اور فرزام ذرا سا لڑھک کر سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ لیکن افق نامی بت بنے ہی کھڑا رہا۔ جیسے کچھ سن نہیں رہی اور اس کے سامنے کوئی اپنے بولنے کا شوق پورا کر رہا ہے۔ جیسے وہ دکان کے باہر زنانہ ریڈی میڈ کپڑے پہنے پلاسٹک کی عورت کھڑی ہے۔ جس کا تعلق بازار سے تو ہے' لیکن زندگی سے نہیں۔

"افق۔!" فرزام کو اسے آواز دینی پڑی۔ وہ دونوں کتنے سامنے رش میں اور کتنی دیر کھڑے رہ سکتے تھے۔ وہ چونکی۔ اور فرزام کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے ذیلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ نیلے گنبد کی طرف جانے والی سڑک پر واقعی اس کے پیروں تلے کی زمین پھٹ رہی تھی اور وہ دھنستی ہی جا رہی تھی۔ آخر وہ دھنس کیوں رہی ہے؟ پاتال میں کیوں جا رہی ہے؟ اسے کون نیچے ہی نیچے کھینچ رہا ہے؟ امان سے تو وہ نفرت کرتی تھی __ ہے نا؟ پھر فرزام جیسے لڑکے کے منہ سے شادی کا سن کر وہ پاتال کی طرف کیوں جا رہی ہے؟

چال میں تیزی آ گئی۔ نیلے گنبد کی طرف تھوڑا اور فاصلہ طے ہوا۔ ذرا اور آگے۔ ایک اور سڑک تک۔

امان نامی دلدل نے ایک بار نگل تو لیا تھا اسے __ اس کے ہاتھوں اپنی عزت تار تار کروا تو چکی تھی۔ اب وہ کیوں اسی شخص کے نام پر اندر دھنستی جا رہی ہے؟ شادی کے نام پر اسے کیا یاد آ گیا ہے؟ اب وہ کیا کچھ اور برباد کرے گا۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی اسے لگا۔ امان کا باپ اس کے پیچھے آ رہا ہے __ آگے بھی وہی ہے دائیں بائیں بھی وہی ہے۔ اس نے اپنے اندر کی چیخ کو بمشکل روکا۔

اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے امان نام کی دھڑکن کو اپنے دل کے اندر نئے سرے سے دھڑکتے سنا اور وہ ڈر گئی۔ اگر پھر اس دل نے اسی کے نام پر دھڑکنا شروع کر دیا تو __ تو امان پھر سے جیت جائے گا __ وہ اسے دھوکا دینے اس کے اندر پھر سے آ گیا تھا۔ اس بار وہ یہ دھوکا نہیں کھائے گی۔ اپنے گھر کی گلی کے سرے پر وہ رک گئی۔

واپس پلٹی تو دس قدم کے فاصلے پر فرزام کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جس حالت میں وہ تیزی سے اس کے پاس سے نکلی تھی اس کا سوچ کر فرزام اس کے پیچھے گھر تک آ رہا تھا۔ وہ چلتی اس کے قریب آئی اور آگے ہو کر چلنے لگی۔ وہ پیچھے آنے لگا۔ سڑک پار کر کے وہ عجائب گھر کے ہرے بھرے باغ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دوبارہ اس نے فرزام کی طرف نہیں دیکھا۔ دراصل وہ کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ جو سر تال اس کے اندر سالوں پہلے شادی کے نام پر بجے تھے __ اب وہی سر تال ماتم

کررہے تھے۔ افق اس ماتم کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ اس شخص کے لیے یہ ماتم اور کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اگر وہ یہ ماتم کرے گی تو وہ نئے سرے سے اس پر جان دینے لگے گی۔

✡ ✡ ✡

امان عدن نامی لڑکے کے بارے میں افق' فرزام کو بتانے لگی۔ اس کے باپ کا اس کی عزت پر حملے کو چھوڑ کر اس نے ان سے ملاقات کے متعلق بھی بتا دیا۔

جب اس نے بات ختم کرلی تو اس نے خاموشی سادھ لی کہ کیا اب بھی یہ فرزام نامی لڑکا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بہت دیر تک فرزام بھی خاموش رہا۔

"مما نے ٹھیک کہا تھا کہ افق کے اندر بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے۔"

اس نے اتنا کہا اور خاموش ہوگیا۔ افق کو جیسے جواب مل گیا کہ وہ اسے انکار کررہا ہے۔ جس طرح اسے اس کے پروپوز کرنے پر خوشی نہیں تھی۔ ایسے ہی انکار پر بھی دکھ نہیں تھا۔ اسے عدن کا خوف تھا کہ وہ پھر نہ اس کے اندر تن لے۔ اس کا خیال پھر نہ اسے آلے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بڑی بات سن کر وہ اس سے شادی کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دے گا۔

"تم جیسی لڑکی کو کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنا سکتا ہے۔"

اس کی اگلی بات سن کر وہ زمین میں گڑ گئی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے اسے یہ سب بتا کر۔ اس کے بعد وہ دوسرا شخص ہے جسے اس نے اس بارے میں معلوم ہونے دیا۔ یہ بات اس نے اپنے اندر راز کی طرح نہیں' ایک گناہ کی طرح چھپا کر رکھی تھی۔ اس نے اپنے گناہ کا خود ہی پردہ چاک کردیا۔ اب یہ اس کا مذاق اڑائے گا۔ وہ جو لے سمجھ رہا تھا۔ اس کے الٹ سمجھے گا۔ وہ اٹھنے لگی۔

"جو چھوڑ جاتے ہیں' وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔"

اٹھنے کے لیے پر تولتی افق نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس نقصان پر انہیں افسردہ ہونا چاہیے' ہمیں نہیں افق۔" وہ مسکرایا۔ افق بیٹھ گئی۔

فرزام نے اسے روحی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ لوگوں نے وہاں بیٹھے بیٹھے خود کو بیان کردیا۔ افق کو اب زندگی میں کسی مرد کی ضرورت نہیں تھی لیکن اسے تو خود کو امان سے بچانا تھا' وہ اس جیسے شخص کے لیے جوگ لینا نہیں چاہتی تھی۔

فرزام اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل کرنے سے ڈرتا تھا جو آئیں اور پھر سے چھوڑ جائیں اور وہ ٹوٹ جائے۔ وہ دونوں فی الحال اپنے اپنے اندر کی اداسی کے خاتمے کے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ان دونوں میں "محبت" نامی احساس کہیں بھی نہیں تھا۔

✡ ✡ ✡

مسز گوہر افق کے گھر جاکر اس کا ہاتھ مانگ آئیں جسے فوراً" قبول کرلیا گیا۔ جمل اور اسد کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انہیں اتنا پیارا "بھائی جان" مل رہا تھا۔ طے پایا کہ فرزام کے جانے سے پہلے نکاح کردیا جائے گا۔

فرزام کے کاغذات میں تھوڑی سی ہی کمی بیشی رہ گئی تھی۔ جن کے لیے وہ بھاگ دوڑ کررہا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے جو اس کا ویزا منسوخ کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر اب تو وہ ہر طرح کی اور ہر مقام پر اچانک سے مل جانے والی مشکلات کا عادی ہوچکا تھا۔

کبھی کبھار ہی مسز گوہر کی احمر سے بات ہوجاتی تھی۔ انہوں نے اسے فرزام کے نکاح میں شرکت کی دعوت دی۔ اتنے پیسے لگا کر وہ صرف نکاح میں شرکت نہیں کرسکتا تھا اور پھر اسے ڈر تھا کہ پیسوں کا تقاضا اس سے نہ کرلیا جائے۔ اس نے بہانے سے انکار کردیا۔

مسز گوہر نے کبھی اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کا کاروبار کتنا اچھا چلنے لگا ہے اور اس کاروبار کے لیے دونوں ماں بیٹے اور ان کی ہونے والی بہو نے کتنی محنت کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کا بیٹا ان کے برے وقت میں حصے دار نہیں بنا تھا تو اچھے میں بننا بھی پسند نہیں کرے گا۔

احمر اپنی ماما سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ وہاں کیسے اور کہاں رہ رہی ہیں۔ پوچھنے کا مطلب تھا پھر امداد بھی کرے اور ابھی ابھی انہوں نے بلڈنگ کا گھر چھوڑ کر ایک ڈبل اسٹوری گھر لیا تھا۔ اب وہ لیڈز میں کسی کو جواب دہ بھی نہیں تھا کہ تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے اتنا بڑا گھر لینے کے لیے اور نئے ماڈل کی کار تم نے کیسے لے لی؟ نئے سال کی چھٹیوں میں تم یورپ کیسے گھوم آئے؟ اب وہ وہاں کھل کر پر آسائش زندگی گزار رہا تھا۔

اس کا انگریز نما بھائی سیکنڈ ہینڈ بائیک چلاتا رہا تھا۔ ماں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کھڑی ہوکر کٹنگ کرتی رہی تھی۔ لیکن جو بھی تھا۔ وہ مسز گوہر اور فرزام کے لیے بہت اچھا تھا۔ وہ ایک پر آسائش زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ لیکن وہ کمینے اور غاصب نہیں بنے تھے... تو ایسی آسائشوں سے محنت اور خواری بھلی... چیزوں کی تعداد میں کمی ہوجانی چاہیے... خوبیوں کی نہیں... نیکی کی توفیق ملے نہ ملے۔ گناہ سے دوری کی ضرور ملنی چاہیے۔

مسز گوہر کو اتنا شوق ضرور تھا کہ احمر اپنے بھائی کی شادی میں آجائے۔ کم سے کم کوئی ایک تو دوسرے کی شادی میں شرکت کرے۔ لیکن تانیہ کے ہوتے' وہ نہیں آئے گا۔

جمعے کے دن دوپہر کے وقت بند گلی کے ہرے رنگ کے دروازے کے گھر میں فرزام اپنی چھوٹی سی بارات لے کر اترا۔ اس نے ڈیزائنر سفید شلوار سوٹ پہنا تھا۔ ہلکے سرخ دوپٹے کو جو دولہا کے لیے ہوتے ہیں گلے میں ایک بل دے کر ایک سرا پیچھے اور ایک آگے رکھا تھا۔ اتنی سی ہی تیاری میں وہ شہزادہ لگ رہا تھا' جو کشمیر کی کلی کو لینے کے لیے گیا تھا۔ باراتیوں میں سب ہی کاریگر اور استقبال کرنے والوں میں افق کے چچا'

ماموں بھابھی اور چند اور لوگ شامل تھے۔ جہیز کے نام پر دعائیں تھیں اور بری کے نام پر فرزام سامرد۔

افق رخصت ہو کر فرزام کے گھر آگئی۔ فرزام نے ماں کو افق کے بارے میں اس کی جانی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اب بس ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے کہ وہ کیسے ایک دوسرے کو ماضی کی تکلیفوں سے نکالتے ہیں۔

افق نے مسز گوہر کا لایا سرخ رنگ کا شرارہ پہنا تھا اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی ایک طرف اور اس کا دھواں دھواں ہوتا روپ ایک طرف۔ خود کو نارمل رکھنے کے باوجود وہ وحشت زدہ سی نظر آرہی تھی۔ جیسے ابھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگ جائے گی۔

مسز گوہر دونوں کی تصویریں بنارہی تھیں۔ فرزام کی دلہن کے لیے انہوں نے تھوڑے سے زیورات بنالیے تھے۔ وہ انہوں نے پہلے ہی افق کو دے دیے تھے۔ افق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں۔

نکاح دوپہر کے وقت ہوا تھا اور شام تک افق گھر آگئی۔ رات کو ان تین لوگوں نے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کیا۔ ماں کو گھر ڈراپ کرکے وہ ایسے ہی تھوڑی سی ڈرائیو کے لیے کار ادھر ادھر گھماتا رہا۔ اب ایسا تھا کہ انسان بہت سے فیصلے بہت مضبوطی سے کرلیتا ہے۔ لیکن جب ان فیصلوں کے راستوں پر سے گزرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔

فرزام ایک اچھا اور انصاف پسند لڑکا تھا' لیکن اس کے کانوں میں ماضی میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر قطار در قطار درختوں کے سایوں میں چہل قدمی کرتے اور کسی جھیل کے کنارے بیٹھے بنے گئے خواب آبشار کے جھرنے کی طرح رواں تھے۔

وہ ذہن کو جھٹک رہا تھا۔ پھر بھی کانوں میں سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک خفیف سی کپکپاہٹ اس کے اندر تھی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ کسی کو دھکا دے کر گھر سے باہر نکال کر دروزہ مقفل کردینے سے کوئی زندگی سے نہیں چلا جاتا۔ دل کو دھکے لگاتا ہے۔ دل والوں کو نکالنے کے لیے وقت آنے پر ان دھکوں کا بھانڈا پھوٹ ہی جاتا ہے۔

اس نے افق کو دیکھا دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھے وہ تازہ تازہ پینٹ سے بنائی گئی دیوی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرا اسی دیوی جیسا لگ رہا تھا' جسے حنوط کرکے تابوت میں بند کردیا گیا ہو' تازہ تازہ وجود پر صدیوں پرانا چہرہ۔ چند گھنٹوں کی دلہن کا صدیوں سے ناتا۔

"آئس کریم کھاؤ گی؟"

"جی! کھالوں گی۔" آواز اتنی دھیمی تھی کہ بمشکل فرزام نے سنا۔

"میرا خیال تھا کہ تم کہو گی۔ میرا کھانے سے ہی پیٹ بھر گیا۔" وہ ہنسا تاکہ وہ بھی ہنسے۔

"پھر میں نہیں کھاتی۔" وہ ہنسی نہیں۔ سنجیدہ ہی رہی سو وہ اس کے مذاق کو سمجھی ہی نہیں۔

"جب تک تم میں حس مزاح آئے گی۔ میری حس مزاح مرچکی ہوگی۔ میں تو تمہیں ایک دو لطیفے سنانے جارہا تھا۔ لیکن مجھے تو تمہیں لطیفے سمجھانے بھی پڑیں گے۔"

وہ چپ رہی۔ ہولے سے کبھی کبھی گود میں رکھے ہاتھوں کو جنبش دے دیتی۔ ایسے سمٹ کر بیٹھی تھی جیسے بہت خوف زدہ ہو۔ بہت برے وقت پر اسے یاد آرہا تھا وہ دوسری بار کسی کے ساتھ کار کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پہلی بار کا بیٹھنا یاد آرہا تھا۔

دونوں میں خاموشی رہی۔ بتا کے دونوں ہی گئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رشتے کو کیسے اس رشتے کو نبھانے' دوست بن کر ہی سہی ساتھ' خوشی خوشی زندگی گزارنے میں انہیں وقت لگے گا۔

☼ ☼ ☼

فرزام کے پاس چند ہفتے ہی تھے۔ اس کا ویزا آچکا تھا۔ وہ جانے کی تیاری کررہا تھا۔ افق نے اچھے نمبروں سے بی اے پاس کرلیا تھا۔ اسے ساتھ لے جا کر اس نے اس کا پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایڈمیشن کروایا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ زیولوجی کرے۔ افق کا کہنا تھا کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی جا کر اس کا بہت وقت صرف ہوگا۔ لیکن فرزام کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کام سے نکل کر اپنے لیے بھی کچھ کرے۔

کلاسز شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ فرزام کے جانے سے پہلے ایک اور پیش رفت ہوئی۔ جس نے ان کی زندگی میں تھوڑی اور تبدیلی کردی۔ افق کی اماں کا گھر ایک بند گلی میں تھا۔ اس گلی کے دونوں گھر ایک پارٹی مارکیٹ بنانے کے لیے خریدنا چاہتی تھی۔ اس گلی کے سرے پر سڑک تھی اور اس سڑک پر بہت سی دکانیں تھیں۔ جو پارٹی وہ جگہ لینی چاہتی تھی' اسے راتوں رات ہی جگہ چاہیے تھی۔ اسی لیے انہیں اچھی خاصی قیمت کی پیش کش کی جارہی تھی۔ رقم اتنی اچھی تھی کہ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ افق کا خاندان فی الحال مسز گوہر کے گھر میں رہے گا۔ آئندہ کے لیے کچھ بھی پلان کیا جاسکتا تھا۔

دونوں گھر بک گئے۔ بھابھی مرکزی شہر سے دور چار مرلے کے گھر میں چلی گئیں۔ افق کا گھرانہ مسز گوہر کے گھر میں آگیا۔ جس ہال نما کمرے میں سامان پیک کرکے رکھا جاتا تھا۔ وہاں لکڑی سے پارٹیشن کروالیا گیا۔ ان کے پچھلے گھر سے بڑا اور کھلا کمرا بن گیا۔ فرزام نے ایک بیڈ لا کر وہاں سیٹ کردیا۔ آرڈر لینے اور سپلائی کرنے کی ذمہ داری جمل نے سنبھال لی۔ فرزام کی موٹر بائیک اسے دے دی گئی۔

گھر بکنے سے جو رقم وصول ہوئی تھی' اسے افق نے مسز گوہر کے حوالے کیا۔ وہ اسے بزنس میں لگانا چاہتی تھی۔ دونوں پارٹنرز کی طرز پر برابر آگئے۔ اب وہ ایک خاندان بن گئے تھے۔ انہیں مل کر محنت کرنی تھی۔ مسائل کا حل مل کر نکالنا تھا۔ وسائل اور کامیابی کے لیے مل کر جدوجہد کرنی تھی۔ وہ سب جدا جدا تھے۔ لیکن ان میں ایک قدر مشترک تھی۔ سو وہ لفظ "محنت" کو سیکھ چکے تھے۔ کامیابی کے راستے خدا کے ہاتھ میں۔ لیکن ان سب نے اپنی اپنی سیڑھیاں بنالی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات گئے وہ اس کی پیکنگ کررہی تھی۔ اس گھر کی ایک ہی رونق تھی' فرزام۔ اور وہ جارہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ سب کو کرائے کی کار میں خوب گھماتا رہا۔ جمل اور اسد نے زندگی میں تفریح نام کی چیز نہیں دیکھی تھی۔ اب وہ ہر وقت فرزام کے ساتھ چپکے رہتے۔

جمل تو اب گھر ہی میں ہوتا تھا۔ رات کو ہی پریس جاتا تھا' لیکن اسد اسکول سے آنے کے بعد فرزام کے ساتھ ساتھ رہتا۔ جتنی بار بھی وہ خریداری کرنے کے لیے گیا' اسد اس کے ساتھ ہی رہا۔ اکثر تینوں مال پر چہل قدمی کرتے۔ بھنے ہوئے چنے کھاتے۔ آئس کریم کھوکے کھول گئے۔ اور نہیں تو فرزام ان کے ساتھ شرط باندھ کر دوڑ لگانے لگتا۔

اس کا معمول تھا' مسز گوہر کے ساتھ چھٹی والے

دن باغ جناح جانا، چہل قدمی کرنا، کبھی کبھی بیڈ منٹن کھیل لیتے اب وہ سب ساتھ جانے لگے تھے۔ اسد اور جمال اس کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ اماں سب کو ایسے ہنستے کھیلتے دیکھ دیکھ گلابی ہوتی جارہی تھیں۔ صحت اچھی ہو ہی گئی تھی۔ لیکن اس اطمینان و سکون نے اور اچھی کردی تھی۔

بیڈمنٹن کھیلتے وہ ریکٹ افق کے ہاتھ میں بھی دیتا تو وہ سر نفی میں ہلادیتی۔ وہ پکڑا کر دور سامنے جاکر کھڑا ہو جاتا۔ جب وہ ہر شٹل کو مس کردیتی تو ایسے شرمندہ ہوتی جیسے بہت بڑا گناہ کرلیا ہے اور باغ جناح کے سب ہی لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو کر "شیم، شیم" کہہ رہے ہیں۔

"افق! آخر ریکٹ کو ایسے۔ ایسے پکڑنے میں تمہارا کیا جاتا ہے۔" وہ قریب آکر پھر سے بتاتا کہ ریکٹ کو کیسے پکڑنا ہے۔ اس کے دور جاتے ہی وہ پھر سے بھول جاتی۔

"اس شٹل سے تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟ یہ دیکھو! اس میں کوئی بم فٹ نہیں ہے۔"

وہ ریکٹ اسد یا جمال کو پکڑا دیتی۔ فرزام دور سے چلاتا۔ "واپس کرو اسد اسے۔" وہ واپس اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔

"کھیلتی کیوں نہیں ہو افق باجی۔ ایسے کھیلو۔ ایسے۔" اسد بھی اس کے پاس آکر بتاتا۔

فرزام نے اس کی طرف ہٹ کی اور وہی پہلی ہٹ اس نے ریورس کی تو وہ ریکٹ چھوڑ چھاڑ دل پر ہاتھ رکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ اسد اور جمال نے تالیاں بجائیں۔ وہ چلتا ہوا قریب آیا۔

"اسد! میں جارہا ہوں۔ لیکن تم یاد سے یہاں آکر یادگاری پودا لگا جانا۔ ٹھیک یہاں۔" جہاں افق کھڑی تھی وہاں کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے فرزام بھائی! اور کچھ۔۔۔؟"

"میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے۔" ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ریکٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی کہ جاؤں یا یہیں رہوں۔

پھر وہ اس کے ساتھ لمبی لمبی سڑکوں پر چہل قدمی کرتا۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتا۔ ایک بار اسے خریداری کے لیے لے گیا۔ اسے اپنی پسند کے لیے کھڈی اور سوتی کے کرتے اور جینز کے کپڑے، تنگ پاجامے لے کر دیے۔ پمپ شوز لے کر دیے۔ بڑے بڑے کلاسیک ہلکے رنگوں کے ہینڈ بیگز لے کر دیے۔

"تمہاری یونیورسٹی وارڈ روب تیار ہے۔" اس کا کہنا تھا کہ کپڑے کم ہی ہوں۔ لیکن صاف ستھرے ہوں۔ وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ نفیس ہو جیسے رنگ کے اچھے کپڑے میں ہو۔

اسے اپنے یونیورسٹی بیگ میں کیا کیا رکھنا ہے۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا۔

"کسی سے ڈرنا نہیں اور سب سے ہائے ہیلو رکھنی ہے۔" اس نے سمجھایا کہ "لوگوں کے ڈر کو اپنے اندر سے نکال دو۔ ان سے فاصلے پر رہو۔ لیکن انہیں جانچتی رہو۔ جب ہم زیادہ لوگوں کو جانچ لیتے ہیں تو ہم بے وقوف بنتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے لگتے ہیں سمجھدار بننے لگتے ہیں۔"

اس کی پیکنگ مکمل ہو گئی۔ اسے صبح کی فلائٹ سے جانا تھا۔ سب لوگ کھلی چھت پر موجود باتیں کر رہے تھے۔ اسد نے ابھی سے رونا شروع کردیا تھا اور فرزام اسے بہلا رہا تھا۔ جب وہ کمرے میں آیا تو افق اس کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ وہ بیگ کی زپ کھول کر سرسری نظر سامان پر ڈالنے لگا۔

"افق۔۔۔!" آواز دی۔ اس نے سوئچ بند کردیا کہ شاید کوئی کام ہو گا۔

"ارے نہیں۔ تم کام کرتی رہو۔ میں یہاں کرسی پر بیٹھا بات کر رہا ہوں۔"

اس نے سوئچ آن کردیا اور پھر سے استری کرنے لگی۔

"مجھے چند سال تو لگ ہی جائیں گے امریکا میں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خاموش ہی رہا۔ افق نے اس انتظار میں افق نے ہی مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسے دیکھتے پاکر وہ جھٹ سیدھی ہو گئی۔

"تم مجھے یاد کرو گی۔۔۔؟ ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔۔۔ بس ایسے ہی۔ روز فون کیا کروں گا۔ ایسے میں یاد کیا کرو؟" وہ سوال پوچھ کر خود ہی ڈر گیا کہ اگر اس نے "نہ" کہہ دیا یا کوئی بھی جواب نہ دیا تو۔ تو اس نے جواب کی گنجائش ہی ختم کردی۔

افق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ایک اور بات پوچھ لوں۔۔۔؟" انداز بچکانہ تھا۔ لیکن دراصل اسے بچکانہ بنایا گیا تھا۔

"جی! میں سن رہی ہوں۔" یہ نہیں کہا۔ ضرور ضرور۔ اس سوال پر وہ خود بھک سے اڑ گئی کہ نجانے کیا پوچھ لے۔

اس نے دیکھا کہ وہ استری شدہ شرٹ کے کالر کو پھر سے استری کر رہی ہے، بار بار اسے استری کر رہی ہے۔ سوال پوچھنے کی نوبت ہی ختم ہو گئی۔ جب اس نے افق کو وقت دے ہی دیا تھا اور بتا کے اس سے مانگ بھی لیا تھا۔ پھر اسے ایسے اس سے دل لگی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

افق نے اسے جاتے دیکھا اور چاہا کہ اسے روک کر پوچھے کہ کیا پوچھنا تھا۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکی۔ ابھی اس میں اتنی ہمت نہیں آئی تھی اور ابھی وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی وہ ہر سوال پوچھے جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی تو وہ صرف فرزام کا احترام کرتی تھی۔ صرف احترام۔ باقی سب جذبوں کے لیے نجانے کتنا وقت درکار تھا۔

جمعہ کی رات ان سب نے اسے خدا حافظ کہا۔ گاڑی کو گھماتے اس نے ایک اور بار مڑ کر خاص طور پر افق کو دیکھا۔ وہ جلد ہی اسے بھی بوسٹن بلالے گا۔

☆ ☆ ☆

افق کے پیسوں اور کچھ اپنی بچت کو مسز گوہر نے استعمال کیا اور قذافی اسٹیڈیم میں ایک دکان کرائے پر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ برطانیہ جانے سے پہلے ان کا خواب رہا تھا یہاں ایک دکان حاصل کرنا۔ لیکن اس وقت کے بعد دیگرے ان کے حالات بدلتے ہی چلے گئے اور وہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔ اب دکان انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ کچھ تزئین و آرائش کروا کر انہوں نے اس کا افتتاح کروایا۔ افتتاح کچھ ایسے تھا کہ پانچ سو اور ہزار میں سیل لگادی گئی تھی اور تین کی خریداری پر ایک جوڑا مفت تھا۔ یہ پیش کش اگلے پندرہ دنوں تک کے لیے تھی۔ اس افتتاح کے لیے انہوں نے نئے کپڑے بنائے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسٹاک میں رکھے اچھی حالت کے پرانے کپڑے بھی ڈسپلے کردیے تھے۔ اسد اور جمال دکان کے سیلز مین بن گئے۔ بیس دن کے اندر اندر سارا اسٹاک ختم ہو گیا۔

مسز گوہر کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اب انہیں من چاہا منافع ہو رہا تھا۔ چند بڑے اسٹورز کے آرڈرز کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے برانڈ "چہر" کے لیے کام شروع کردیا۔

یہ اس علاقے میں کھلنے والی پہلی مکمل بچوں کے ملبوسات کی دکان تھی۔ جس میں ہر رنگ، کپڑے، ڈیزائن، کام اور ہر طرح کے ایونٹ کے لیے لباس ملتے۔ انہیں آرڈر بھی دیا جاسکتا تھا تھیم بھی۔ آرڈر اور تھیم ورک کے لیے وہ تھوڑے سے زیادہ پیسے چارج کرتے تھے۔ مسز گوہر کا خیال تھا کہ وہ جلد ہی میچنگ پاؤچ اور زیورات کا کام بھی شروع کردیں گے۔ کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھنے پڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے چھوٹا سا کارخانہ بھی بنادیا۔

(باقی آئندہ ماہ)

تیسری قسط

سمیرا حمید

محبت من محرم

کام بڑھ جانے کی صورت میں انہیں کاریگر زیادہ رکھنے پڑے اور اوپر نیچے اس گھر کو انہوں نے ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی بنا دیا۔

خود ایک اچھی کالونی میں پندرہ مرلے کی کوٹھی میں کرائے دار بن کر آ گئے۔ کارخانے میں میٹریل کی سپلائی کے لیے بینک سے ایک سوزوکی قسطوں پر نکلوائی۔ اس سوزوکی کا ڈرائیور جمال تھا۔ وہی کارخانے کے سب ہی اندر باہر کے کام دیکھتا تھا۔ کاریگروں کے مسئلے حل کرتا تھا۔ حساب کتاب دیکھتا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ پرائیویٹ میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا تھا۔

اسد نے ایف ایس سی میں کالج میں داخلہ لے لیا

تھا۔ قذافی اسٹیڈیم میں دکانیں دوپہر کے بعد ہی کھلتی ہیں۔ اس لیے اب ان دونوں کے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔

ہنی اور مسز گوہر کی ساری توجہ اب ڈیزائننگ پر آ گئی تھی۔ اب انہیں کسی کا پابند نہیں ہونا پڑتا تھا کہ فلاں آرڈر نے فلاں طرز کا سیمپل ہی بنانے کے لیے کہا ہے یا فلاں کپڑا اور ڈیزائن ہی مانگا ہے۔ اب انہیں مکمل آزادی تھی۔ وہ اپنی مرضی کا ڈیزائن کریں گی اور "چترز" میں ڈسپلے کریں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے ہر ڈیزائن کو پسند کیا جائے گا۔ اور فخر سے پہنا جائے گا۔ اب انہیں ریگولر کسٹمر مل گئے تھے جو سیدھا "چترز" آتے۔ ویسے بھی انسانی خبط ہے کہ وہ ایک بڑی پر

مکمل ناول



مارکیٹ سے گھٹیا چیز بھی بہت اطمینان کے ساتھ لے لے گا اور فخر سے سب کو بتائے گا۔ اونچی جگہ اور اونچے نام بہت سے نقائص پر پردوں کا کام کرتے ہیں۔

لاہور کے اتنے شان دار علاقے میں ایک شاندار دکان نے انہیں دنوں میں خاطر خواہ سے زیادہ منافع دینا شروع کر دیا۔ منافع سے زیادہ وہ ملبوسات کی پسندیدگی سے خوش تھیں۔ ان کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ وقت دو طرح سے بدل جاتا ہے۔ ایک قسمت سے۔ ایک ہاتھ سے۔ قسمت سے نہ بدلے تو ہاتھ سے بدلنے کی کوشش ضرور کرنا چاہیے۔ قسمت ہار جاتی ہے۔ ہاتھ نہیں ہارتے۔ دنیا میں جتنی بھی انسانی ترقی ہوئی ہے اسے ہاتھ سے ہی ممکن کیا گیا ہے۔ ورنہ ہاتھ باندھ کر بیٹھے رہنے والے لوگوں کے ذہن میں دبے ڈھانچے بھی نہیں ملتے اور مل جائیں تو کارآمد نہیں ہوتے۔

افق کا۔ مسز گوہر کا۔ اسد اور جمال کا۔ ان کا وقت بدل چکا تھا اور یہ وقت ہاتھ باندھے بیٹھے رہنے سے نہیں بدلا تھا۔

اپنی سوزوکی میں جمال افق کو ڈراپ کر دیتا۔ وقت ہوتا تو لے بھی آتا۔ ورنہ وہ خود ہی آ جاتی۔ اماں نے گھر کے معاملات سنبھال رکھے تھے۔ وہ کام والی کی نگرانی کر لیتیں۔ کچن کو دیکھ لیتیں۔ ان سب کے لیے دوپہر کا کھانا بنوا کر کارخانے بھجوا دیتیں۔

رات کو فرزام آن لائن آ جاتا۔ باری باری سب سے بات کرتا۔ افق کو اپنی یونیورسٹی کے بارے میں بتاتا۔ کیا کھایا' کیا پیا' کب سویا' کب جاگا۔ وہ اس سے دیر تک بتاتا اور اس سے بھی ڈھیروں سوال کرتا۔ آہستہ آہستہ دونوں میں اچھی گپ شپ ہونے لگی۔ وہ لیپ ٹاپ کے سامنے لا لا کر دکھاتا۔ یہ شرٹ لی' یہ پینٹ لی۔ یہ کیک لیا۔ چین لیا۔ یہ نکی ماؤس وال کلاک۔ یہ ایک منٹ تک ہر صورت بجنے والا الارم۔ یہ نیا سینٹ' نیا لوشن' نئے جوتے' نئی گھڑی اور جرابیں بھی۔

اگر وہ یہیں اس کے پاس ہوتا تو شاید ایسے کبھی نہ کرتا۔ لیکن سات سمندروں کے درمیان میں آ جانے سے' اتنا دور ہو جانے سے اسے احساس ہوا کہ وہ کیا اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ڈپارٹمنٹ' اپنی یونیورسٹی کی خوب صورت ترین لڑکی قرار دی جانے لگی۔ اسے رک رک کر' مڑ مڑ کر دیکھا جاتا۔ پہلے وہ بے چاری تھی۔ بسوں اور رکشوں میں دھکے کھانے والی' کاؤنٹر کے پیچھے فاسٹ فوڈ کی ٹرے دینے والی۔ دیکھنے والے اس پر ترس کھا کر' بے چاری سمجھ کر دیکھتے تھے۔ اب وہ لمبے کرتوں اور تنگ پاجاموں میں' بیگ کو کندھے پر لٹکائے' فائل کو ہاتھ میں پکڑے دیکھنے والوں کو پہنچ سے دور نظر آتی۔ اس کے ڈپارٹمنٹ کے لڑکے اس سے بہانے بہانے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ چند ایک لڑکیوں سے اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان سے بات چیت ہوتے ہی وہ انہیں بتا چکی تھی کہ وہ مس نہیں مسز ہے۔ اس سے مسز کا سنتے ہی لڑکیاں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں۔ انہیں بہت بے چینی ہوئی تھی' یہ جاننے کے لیے کہ اگر یہ ایسی ہے تو وہ کیسا ہوگا۔

لڑکوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہیں جھوٹ لگا۔ ایک نے اسے سفید جھوٹ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکیاں لڑکوں سے دور رہنے کے لیے مشہور کر دیتی ہیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے یا منگنی۔ اگر یہ سفید جھوٹ بھی تھا تو افق کا انداز ایسا تھا کہ لڑکا اس کے قریب جانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

فرزام سے شادی ہونے کے باوجود وہ لڑکوں سے نفرت کرتی تھی۔ جہاں لڑکے اسے موبائل ہاتھ میں پکڑے یا باتیں کرتے نظر آ جاتے' اس کا خون جاتا۔ لڑکوں کے گروپ میں ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے ہوتے تو اس کے پسینے نکلنے لگتے۔ اسے لگتا ہو جاتا کہ کسی لڑکی کا مذاق اڑایا جا رہا ہوگا۔ وہ لڑکوں سے نفرت کرتی تھی یا ان سے خوف زدہ تھی۔ اس کا بچپن یا لڑکپن بے شک ان کی وجہ سے گزرا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر کبھی نہیں آنے دیا تھا۔ ہاں اس کی ذات میں ایک واضح نشان ضرور بن کر ابھر آیا تھا۔

"دور ہو۔"

جب وہ اور مسز گوہر کسی ہوٹل میں منعقد کسی نمائش میں جاتیں تو لوگ انہیں کوئی بڑی ڈیزائنر سمجھتے۔ وہ دونوں دوسروں کے کام کا بغور مشاہدہ کرتی رہتیں۔ اس سے انہیں اپنے کام میں جدت لانے کے نئے آئیڈیاز ملتے تھے۔ فیشن سے متعلق ہونے والے ایونٹ میں وہ دونوں اکثر جایا کرتی تھیں۔ ان کا اپنا ارادہ بھی ایک ایونٹ کروانے کا تھا۔ لیکن ابھی نہیں۔

آج کل وہ کرائے پر ایک کارنر یا دکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب وہ ایک اور دکان کا کرایہ افورڈ کر سکتے تھے۔ ایڈوانس بھی ان کے پاس تھا۔ دوسری طرف مسز گوہر کا خیال تھا کہ اگر کوئی مناسب دکان نہیں ملتی تو کسی اچھی سوسائٹی یا ٹاؤن میں وہ لوگ آسان ماہوار قسط پر ایک اچھا گھر لے لیں۔

افق اس کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال بزنس کو ہی ترقی دی جائے۔ فرزام کا ووٹ مسز گوہر کے حق میں گیا اور اس نے گھر لینے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ جو ادائی گھر کے کرائے کے سلسلے میں کی جاتی ہے وہی گھر کی قسط کی مد میں ادا کر دی جائے گی اور دکان کے ایڈوانس کے لیے وہ کچھ اور انتظار کر سکتے ہیں۔

لاہور کے مرکز سے ذرا سا دور ایک اچھے ٹاؤن میں انہوں نے ایک بنگلے کی ایڈوانس پے منٹ کر دی۔ باقی رقم انہیں چند سال کے اندر اندر ادا کرنی تھی۔ مسز گوہر کی خوشی دیکھنے لائق تھی۔ جیسے انہیں ان کا بیچا ہوا گھر واپس مل گیا ہو۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ جمال اور اسد کو الگ الگ کمرے مل گئے۔ افق کو اپنے شوہر کا اپنا گھر مل گیا۔

☼ ☼ ☼

سیاہ لانگ کوٹ پہنے وہ ٹرالی گھسیٹتی شیشے کے دروازے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اس کی فلائٹ وقت پر آئی تھی۔ لیکن اس کا سامان گم ہو گیا تھا۔ اسے اپنے سامان کو ڈھونڈنے میں کافی وقت لگا۔ وہ لندن انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ فرزام اس کا انتظار کر کر کے چلا گیا ہو۔ اس نے کل ہی کہا تھا کہ اگر فلائٹ کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ ایئرپورٹ پر سو جائے گا۔ وہاں سے جائے گا نہیں اور وہ ہنسنے لگی تھی۔

"اتنے شور میں نیند آ جائے گی؟"

وہ علامہ اقبال ایئرپورٹ نہیں ہے' جہاں آدھے سے زیادہ لوگ پکنک منانے آجاتے ہیں۔ امریکیوں کا ہوائی اڈہ ہے۔ ہزار کیا لاکھ بھی ہوں تو شور نہیں ہوتا۔"

"کتنے اچھے ہیں امریکی۔۔۔ پاکستانیوں کو تو کچھ آتا ہی نہیں۔"

"طنز مت کرو۔ سامان باندھ لو۔"

"وہ تو ماں نے کب سے باندھ دیا۔"

"میرے لیے کیا لا رہی ہو؟"

"شلوار سوٹ۔"

"ہیں۔۔۔ اور۔۔۔؟"

"اور بس۔۔۔"

"جہاز میں بس لانے دیں گے کیا؟" دیر تک قہقہہ گونجتا رہا۔

امریکا میں پاکستانی کمیونٹی نے ایک نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ فرزام نے ان کے لیے بھی ایک اسٹال بک کروا دیا تھا۔ ان دنوں افق کے ایم اے پارٹ ون کے امتحان چل رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں ہی آجائیں' لیکن صرف مسز گوہر کو ہی جانا پڑا۔ دو ماہ امریکا فرزام کے پاس رہ کر اور کامیاب نمائش نپٹا کر وہ واپس آگئیں۔ کارخانے میں ان میں سے کسی ایک کا ہونا بھی ضروری تھا۔

امتحانات کے باوجود افق نے کارخانہ سنبھالے رکھا۔ اس بار ویسی ہی ایک اور نمائش کے لیے افق جا رہی تھی۔ اس کا ایم اے ہو چکا تھا۔ رزلٹ آنے والا تھا۔ فرزام بھی ایم ایس سی کر چکا تھا۔ جاب وہ پہلے ہی کر رہا تھا۔ آج کل ایک' دو کورسز کر رہا تھا۔ امریکا میں اس نے چند جگہ اپلائی کیا ہوا تھا اور اسے امید تھی کہ اسے ایک آدھ کال تو ضرور آئے گی۔

افق کا ذہن وہ پہلے سے ہی بنا چکا تھا کہ ایم اے کے بعد وہ ڈریس ڈیزائننگ کا کورس امریکا سے کرے گی۔ مسز گوہر اس کی ایسی باتیں سن لیتیں تو بہت ہنستیں۔

"ہاں ہاں! بھاگ جاؤ' بھاگ جاؤ' سب بھاگ جاؤ' پہلے تم بھاگے' اب افق کو تیار کر رہے ہو۔"

"یہ میری ماں نے کہا یا افق کی ساس نے؟"

"دونوں نے۔" وہ کھکھلا گئیں۔

افق کافی دیر سے کھڑی تھی۔ فرزام نظر آکر نہیں دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نکلتے ہی اسے سامنے کھڑا ملے گا۔ لیکن اب۔۔۔ ہاں! ذرا دور سے آتا ہوا اسے نظر آگیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ ڈھائی سال دونوں نے ایک دوسرے کو آن لائن دیکھا تھا۔ ڈھائی سال لیپ ٹاپ سے آمنے سامنے رہے تھے۔ اس نے اس کی ہر بات سنی تھی۔ بھونڈے لطیفوں پر ہنسی تھی۔ اس کی خریدی گئی بہت سی چیزوں کو ناپسند کیا تھا۔ بخار' نزلہ زکام میں اس کی سرخ ناک کا مذاق اڑایا تھا۔۔۔ اور اب۔۔۔ وہاں کھڑے' بھاگتے ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھتے افق کو عجیب لگ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس پر اس کی پہلی نظر پڑی اور اس کے دل نے چاہا کہ چھلانگ لگا کر باہر آجائے۔ اس پر اس کی نظر پڑی تو جی نہیں چاہا کہ وہ نظر واپس لوٹ آئے۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ فرزام خوش دلی سے مسکرایا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھول تھے۔ اس کے قریب آکر وہ بریک لگانے کے سے انداز میں رکا۔

"او میری افق!" پھول اس کے ہاتھ میں دیے۔ "ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے سڑک جام تھی۔"

اس نے پھول پکڑ لیے۔ فرزام نے ٹرالی سنبھالی۔ "کسی نے تمہیں جہاز سے اتر جانے کے لیے نہیں کہا؟"

"ایک نے مشورہ دیا تھا کہ اتر جاؤ۔ کیوں پاگلوں کے ملک میں جا رہی ہو۔"

فرزام کا قہقہہ ایئرپورٹ کی عمارت میں بکھر گیا۔ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ بہت دل لگا کر تیار ہوا ہے۔ اس کے بالوں کا اسٹائل' اس کا نیا نیا لیا کوٹ' نیا مفلر' نئی گھڑی' خاص پرفیوم۔

اس نے ان میں سے ایک بھی چیز اسے آن لائن نہیں دکھائی تھی۔ وہ سب کا حال چال پوچھتا اس

سامان گاڑی میں رکھنے لگا۔

"سفر میں بور ہی ہوئی ہو گی۔۔۔ ہے نا؟"

"نہیں۔۔۔ میں یہ کتاب پڑھتی رہی۔۔۔" اس نے پھولے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ فرزام کا خیال تھا کہ وہ کہے گی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ان گزرے سالوں میں وہ دونوں میں بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ فرزام جیسے لڑکے پر افق کو بہت ناز تھا' افق جیسی بیوی فرزام کو بہت پیاری ہو گئی تھی۔

فرزام کا چھوٹا سا فلیٹ بہت پیارا تھا۔ شروع میں وہ ہاسٹل میں رہتا تھا۔ پھر چار لڑکوں کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کیا۔ جب سے اچھی جاب مل گئی تو اس نے اپنا الگ فلیٹ لے لیا۔ اس فلیٹ میں سامان کم ہی تھا۔ افق کے لیے اس نے ذرا اچھی طرح سے اسے ڈیکوریٹ کر لیا تھا۔ وقت نکال نکال کر مارکیٹوں میں دیکھے کھاتا رہا تھا۔ پردے' صوفے' ٹیبل' برتن آہستہ آہستہ اس نے بہت کچھ لے لیا تھا۔ فلیٹ دو بیڈ روم' لاؤنج' کچن اور ڈائننگ ایریا پر مشتمل تھا۔

"ہماری ماں کے گھر جتنا بڑا نہیں ہے۔ لان بھی نہیں ہے۔ الگ ڈرائنگ روم بھی نہیں ہے۔۔۔ یہ بڑے بڑے باتھ روم بھی نہیں ہیں' لیکن یہ جتنا بھی ہے' سارے کا سارا تمہارا ہے۔"

افق فریش ہو گئی تو وہ اسے ڈنر کے لیے لے گیا۔

"کیسا لگ رہا ہے یہاں آکر؟"

"اچھا ہے۔" افق نے فرزام سے نظر بچا کر بال پر ایک نظر ڈالی۔

"اور مجھے۔۔۔؟"

اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ مسکراہٹ چھپا گئی۔

"کیسا لگ رہا ہوں۔۔۔؟" اس بار چلا کر پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہیں۔" دانتوں میں ہونٹ کا دائیں طرف کا کونا دبا کر کہا۔ ہنسی کا فوارہ نکلنے کو تھا۔

"میرے سو ڈالر دینے کے بعد میں ٹھیک ہی ہوں بس؟"

افق نے سو ڈالر پر سوالیہ دیکھا۔

"کٹنگ ہاں۔۔۔ Men's Spa سے آرہا ہوں۔۔۔ سو ڈالر میں تیار ہو کر۔"

انداز میں خفگی تھی۔ سو ڈالر ضائع جانے پر یا تعریف نہ کیے جانے پر۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تو دیر تک ہنستی ہی رہی۔ وہ کوئی لیڈی ڈیانا تھی کہ جس کے آنے پر وہ اس طرح سے بن ٹھن رہا تھا۔ افق نے آتے ہوئے لپ گلوز لگایا تھا' جو اتنی لمبی فلائٹ میں کب کا ختم ہو چکا تھا۔ یہاں آتے ہوئے بھی اس نے صرف کپڑے ہی تبدیل کیے تھے۔ بلیک شیفون کا سوٹ' جس کے تنگ بازوؤں پر سفید موتیوں کی تین لائن بنی تھیں اور ویسی ہی تین لائنیں دوپٹے کے چاروں طرف تھیں۔ سامنے سے بال اٹھا کر انہیں چند بل دے کر پیچھے پن لگائی تھی اور بالوں کی ڈھیلی چوٹی بنا کر انہیں پیچھے سے لا کر بائیں کندھے پر رکھا تھا۔ دائیں کندھے پر دوپٹا سلیقے سے جمایا ہوا تھا۔

"اب تمہیں بہت ہنسی آیا کرے گی۔"

"کیوں؟"

"میں اب بہت الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہوں۔"

اس انداز پر وہ اور ہنسی۔

"دیکھا۔۔۔ مجھے معلوم تھا۔ تمہیں بھی بتا دیا ہے۔"

ساتھ ساتھ وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

"تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے گھومنے پھرنے کے لیے۔"

"پھر؟" وہ سمجھی کہ شاید ایک ہفتے بعد وہ کہیں چلا جائے گا۔

"پھر تمہیں نہیں معلوم؟ ایونٹ پر نہیں جانا تمہیں نمائندگی کرنے؟"

"جی ہاں!" اسے یاد آیا کہ یہاں وہ چیزیں آؤٹ لیٹ (Out let) لے کر آئی ہے اور کچھ پاکستانی بوتیک مالکان تھے جن سے ان کی بات چیت چل رہی تھی۔ اسے فرزام کے ساتھ مل کر یہاں مستقل ایک کارنر ڈھونڈنا تھا۔ ان کے جو مستقل کسٹمرز بوسٹن میں رہتے تھے انہوں نے وعدہ کیا تھا ہر طرح کی مدد کرنے کا۔ ایونٹ دس روزہ تھا اور اس کے بعد ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ ابھی تو فی الحال فرزام کو شپ منٹ لانا تھی۔

پاکستانی اور انڈین کمیونٹی نے مل کر اس ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے ایک کلائنٹ نے ہی انھیں اس کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی معلومات فرزام نے حاصل کرلی تھی۔ بکنگ انھیں آسانی سے مل گئی تھی۔

ون ڈے ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ جاب کے ساتھ ساتھ فرزام نے اس کی مدد بھی کی۔ اسی ایونٹ کے دوران ان سے ایک بڑی اور فعال این جی او کا نمائندہ ملا وہ انھیں این جی او کی طرف سے کروائے جانے والے دوسرے ایونٹ میں شامل ہونے کے لیے راضی کررہے تھے۔ جس کا مقصد فنڈز اکٹھا کرنا تھا۔

این جی او تھرڈ ورلڈ میں بچوں کی عام وبائی بیماریوں کی ویکسین مفت سپلائی کرنے کا کام کرتی تھی اور اس کی لیے وہ کیمونیٹیز کو اکٹھا کررہی تھی۔ این جی او کے ساتھ کام کرنے والے مجموعی منافع کا پچیس فیصد رکھ سکتے تھے۔ باقی کا منافع انھیں این جی او کو فنڈ دینا تھا۔

افق نے پاکستان میں مسز کوہر سے بات کی۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ مطلوبہ آرڈر تیار کروا کے امریکا بھجوا سکتی تھیں۔ افق نے معاہدے پر دستخط کردیے۔ معاہدے کی رو سے اگر وہ ایک خاص شرح سے زیادہ فنڈز اکٹھا کرکے دیں گی تو اسے این جی او کا رکن جانا جائے گا اور وہ این جی او کو اپنی آراء اور مشوروں سے نواز سکتی ہے۔ ایونٹ کے باقاعدہ شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ ہفتہ اور اتوار دو دن انھیں شہر کے مختلف کمیونٹی سینٹرز میں نمائش منعقد کرنی تھی۔ ہر ہفتے نئی جگہ ہوگی۔

این جی او نے اسے دو رضاکار بھی دے دیے۔ کام کرنے اور کسی بھی مسئلے سے نپٹنے کے لیے۔ مقامی اور غیر ملکی پچاس سے زیادہ گروپس شرکت کررہے تھے۔ پمفلٹ پر "چنر" کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ ٹی وی میں فنڈز ریزنگ کے لیے تشہیر کی گئی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ امریکا آکر وہ پاکستان سے بھی زیادہ مصروف ہوجائے گی۔ کارخانے میں ان کی ایک اسسٹنٹ تھی' مس سندس۔ افق سارا وقت اس سے آن لائن رابطے میں رہتی۔ دونوں آپس میں ڈسکس کرتی رہتیں کہ کس ڈیزائن اور کس پیٹرن کو لے کر کام کرنا ہے' رنگ کون سے اچھے رہیں گے اور کس کپڑے کو ہوسٹن کے لوگ پسند کریں گے۔ پاکستانی مخصوص روایتی لباس ہی بنا رہے تھے۔ لیکن کیونکہ اس ایونٹ میں ہر ملک کے لوگ آنے والے تھے تو انھوں نے جینز پر پہننے کے لیے مختلف ڈیزائن کے کرتوں پر بھی کام کیا تھا اور چھوٹے کراس بیگ پر ٹین ایج لڑکیوں کے اسٹائلز پر بھی۔

یہ ایونٹ تین مہینے تک جاری رہنا تھا۔ ان کے پاس کام کے لیے وقت تھا پہلا اسٹاک جلد ہی مل جانا تھا۔ این جی او کی طرف سے انھیں بریفنگ دی جارہی تھی اور ٹرینڈ کیا جارہا تھا۔ انھیں بتایا جاتا کہ انھیں کیسے اپنی مصنوعات کو ڈسپلے کرنا ہے۔ کم سے کم پرائز ٹیگ کیا ہونے چاہئیں اور زیادہ سے زیادہ کیا۔ انھیں پہلے جمع کیے گئے فنڈز کے بارے میں بتایا گیا۔ انھیں اچھی طرح بریف کیا گیا کہ کس طرح وہ پہلے سے زیادہ فنڈز اکٹھا کرسکتے ہیں۔ این جی او کے ریکارڈ کو توڑ سکتے ہیں۔ ان سے سوالات کیے جاتے۔ مشورے مانگے جاتے۔ انھیں تھرڈ ورلڈ کے بیمار بچوں کی مختصر ڈاکومنٹریز دکھائی جاتیں۔ یوں انھیں فنڈز ریزنگ کے لیے اچھی طرح تیار کردیا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ایک بار ماما نے کہا تھا کہ افق "خیر" ہے۔ تم تو زیادہ ہی "باعث خیر" بن گئی ہو۔" بات اچھی تھی لیکن انداز ذرا افسردہ سا تھا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنا کام کررہی تھی۔ قریب ہی پاکستان سے بھیجا گیا پہلا اسٹاک بکھرا پڑا تھا۔ وہ انھیں جانچ رہی تھی اور الگ الگ کررہی تھی' ساتھ ساتھ پیڈ پر نوٹس لکھتی جارہی تھی۔ ایونٹ کے پہلے ہفتے کے لیے وہ خاص الخاص کلیکشن کا انتخاب کررہی تھی۔

"کیا مطلب۔؟" پین کو تیزی سے چلاتے اس

نے پوچھا۔ فرزام نے آگے بڑھ کر اس کا پین اچک لیا۔

"تھوڑا کمی میں نہ جاؤں۔" قریب ہی کی کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "کہاں؟"

"کینیڈا۔" دونوں ہاتھوں کو اداسی سے تھوڑی کے نیچے رکھا۔

"آپ کے آفس والے بھیج رہے ہیں؟"

"نہیں۔ آٹھ ماہ پہلے میں نے وہاں کی ایک کمپنی کو درخواست دی تھی۔ ساتھ ہی اپنے کام کی تفصیل اور سی ڈی بھی بھیجی تھی۔ کمپیوٹر سے متعلق کچھ نئی اصلاحات پر کام کیا ہے میں نے۔ چند سوفٹ ویئرز بھی میں سمجھتا ہوں کہ میں کامیابی سے بنا سکتا ہوں۔ وہ مجھے انٹرویو کے لیے بلا رہے ہیں۔" باتیں وہ اچھی کررہا تھا لیکن منہ بگڑا ہی جارہا تھا۔

"تو جائیں نا۔" دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی تو اداس کیوں ہورہا ہے۔

"ہاں تو جا ہی رہا ہوں۔" وہی لالی پاپ نہ ملنے کا انداز۔ افق کو حیرانی تھی کہ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔

"تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟" اس نے اچانک پوچھا "مجھے دراصل یہی پوچھنا چاہ رہا ہو۔" افق نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا اور یہ کیوں سمجھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔

"یہ کیسا سوال ہے۔؟" وہ واقعی حیران تھی۔

"تم مجھے روک ہی نہیں رہیں۔ تمہیں کہنا چاہیے "مت جائیں نا۔" تم نے کہہ دیا کہ جائیں نا۔"

"اوہ!" افق کی سمجھ میں اب بات آئی تھی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور اس نے سامنے رکھے پیڈ پر انھیں گاڑ دیا۔

ان دونوں کے تعلق کے درمیان ایک فاصلہ شروع سے ہی چلا آرہا تھا' وہ اب بھی وہیں تھا' وہ کم ضرور ہورہا تھا لیکن ابھی تک موجود تھا۔ فرزام اس کے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا۔ لیکن اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کا بازو تھامتا تھا۔ جب افق کچن میں کام کررہی ہوتی اور وہ اس کے پاس آکر کھڑا ہوجاتا تو کچھ نہ کچھ ضرور افق کے ہاتھ سے گرجاتا اور وہ مسکراہٹ دباتا کچن سے چلا جاتا۔ اگر انھیں ایک ہی صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو وہ ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے۔ ورنہ الگ الگ صوفوں پر ہی بیٹھتے۔ وہ رومانس کے دور میں داخل ہورہے تھے۔ لیکن رومانس کرتے نہیں تھے۔

افق جب اکیلی ہوتی' بس میں بیٹھے۔ ٹیوب میں۔ این جی او کی بریفنگ لیتے۔ سبزی اور گوشت کی خریداری کرتے۔ ڈھیر سارے بیگز کو ہاتھ میں پکڑے۔ فٹ پاتھ پر چلتے۔ سڑک کو پار کرتے۔ ٹکٹ لیتے۔ گھر کا لاک کھولتے۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوتی۔ وہ دن رات اسے سوچتی۔ کام کے دوران بھی اسے کھوجتی۔ پاکستان میں وہ اس کے آن لائن آنے کا انتظار کرتی تھی۔ یہاں وہ اسے بار بار دیکھنے کا انتظار کرتی تھی۔ پاکستان میں وہ انتظار کم تھا۔ یہاں بہت بڑھ گیا تھا۔ فرزام اس کا شوہر تھا۔ جس کے کھو جانے کا اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جس کے چلے جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ اسے بہت بہت پسند کرتی تھی۔ بہت یاد کرتی رہی تھی۔

"نہ جائیں۔" اس نے اعتماد سے کہہ دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سمجھے کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ جس کام کے لیے اس نے اتنی محنت کی ہے' وہ صرف اس کی وجہ سے اس محنت کا ثمر نہ کھائے۔ اگر وہ امریکا نہ آئی ہوتی تو وہ چلا ہی جاتا۔ اس طرح اس کے کہنے پر وہ بہت خوش نظر آنے لگا۔ جیسے جانا تو اسے بھی ہے۔ لیکن روکے جانے کی اسے بہت خواہش ہے۔

"میں تمہیں یہاں بلا کر خود یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں۔ انٹرویو تو بہانہ ہے۔ میرا کام انھیں پسند آگیا ہے۔ وہ میرے آگے کانٹریکٹ رکھ دیں گے۔" ٹیبل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا۔

افق کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھالے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ہاتھ پر ہی رہے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ جانا بھی چاہ رہا ہے

اور رکنا بھی۔

"ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں ملتے۔"

اس بات پر وہ خاموشی میں سمٹ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصلہ وہ خود کرے۔ اگر وہ اسے جانے کے لیے کہے تو شاید وہ برا مان جائے اور اگر روک لے تو اس کا خواب توڑ دے۔

دو دن وہ ایسے ہی الجھا رہا۔

"اس پروجیکٹ پر کام کرنے سے مجھے اچھے خاصے پیسے ملیں گے۔ میں کافی امیر ہو جاؤں گا۔ بہت زیادہ اپنے پیسوں والا۔ پھر تم میرے ساتھ پیرس چلو گی؟"

یہ صرف ایک سوال تھا۔ لیکن سر ہلانے سے پہلے جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو جانا کہ یہ صرف ایک عام سا سوال نہیں ہے یہ ان دونوں میں چھپی ہوئی "محبت" ہے۔ مدھم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں چمکی۔ فرزام کی نظریں اسی چمک دمک پر ٹکی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ طے ہوا۔ ابھی تو ایسا ہے کہ زندگی افرا تفری کا شکار ہے۔ تم فنڈ ریزنگ کے لیے کام کر رہی ہو۔ بوسٹن میں تمہیں ایک کارنر بھی چاہیے۔ ماں مجھے بار بار فون کر کر کے کہہ رہی ہیں کہ ان کے کارنر کا کیا بنا۔ ایک دو لوگوں سے بات چل رہی ہے۔ ساتھ چلنا۔ تم بھی مل لینا اور میرے آنے سے پہلے ہر کام سے فارغ ہو جانا۔ ٹھیک ہے۔" ساتھ سر بھی ہلایا۔

"پروجیکٹ پر ہی کام کروں گا۔ کمپنی مجھے جاب بھی دے گی۔ لیکن مجھے کینیڈا میں نہیں رہنا۔ وہاں کا موسم نہیں پسند مجھے۔ اگر وہ مجھے برطانیہ میں اپنی کمپنی کی برانچ میں سیٹ کر دیں تو ٹھیک ہے۔ میرے بھی کچھ خواب ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میں برطانوی حکومت کو یہ بتا سکوں کہ انہوں نے کس قدر لائق فائق لڑکے کو نکال باہر کیا۔ ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس بار انہیں مجھے اعزاز سے ویزا دینا ہو گا۔"

ماما کہتی تھیں کہ وہ پریشانی اور خوشی میں بولتا بہت ہے۔ اب افق کی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی میں بول رہا ہے یا پریشانی میں۔ افق نے سوچا کہ اسے ایک بار پھر فرزام کو روکنا چاہیے۔ شاید وہ کسی الجھن میں ہے۔

"اگر دل نہیں چاہ رہا تو نہ جائیں۔"

بولتے بولتے رک کر وہ اسے دیکھنے لگا۔ "مذاق کر رہی ہو؟"

سر نفی میں ہلایا۔ "روک رہی ہوں۔"

"اب میں تمہیں پیرس گھما کر ہی رہوں گا۔ چند دنوں کی بات ہے میں سیٹ ہو جاؤں گا۔" آخری بات کہتے کہتے منہ کو زیادہ لٹکایا۔

ہفتے کے اندر اندر وہ چلا گیا۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف تھی۔ لیکن اس بار یہ مصروفیت اسے اچھی نہیں لگی۔ بوسٹن آنے کے بعد وہ ہفتہ وہ گھومتے رہے تھے۔ وہی ٹھیک تھا۔ وہ کام سے نہیں تھکتی تھی لیکن اب اسے اپنے آس پاس فرزام چاہیے تھا۔ جیسے وہ ٹیبل پر بیٹھی کام کر رہی ہوتی تو وہ اچانک سے اس کا پین آ کر اچک لیتا۔ سندس کو "بائے بائے" کہتا۔ چاکلیٹ دودھ کا گلاس اس کے سامنے لا کر رکھتا اور ایم پی تھری کے ایئر فون اس کے دونوں کانوں میں لگاتا۔

"پہلے گلاس ختم کرو۔ پھر کم سے کم تین گانے سنو۔ پھر کام شروع کرنا۔" وہ گلاس پی جاتی۔ تین گانے سن لیتی اور پھر سے پین پکڑ لیتی۔ رات گئے سندس کے ساتھ وڈیو چیٹ پر جب وہ ڈسکشن کر رہی ہوتی تو قریب ہی صوفے پر آڑا ترچھا لیٹے وہ اپنی جمائیاں روک رہا ہوتا۔ بظاہر وہ ٹی وی دیکھ رہا ہوتا۔ لیکن در اصل اسے الارم دے رہا ہوتا کہ اب بس کرو کام۔ اور دوسری تیسری بار جب وہ اس پر نظر ڈالتی تو وہ صوفے سے لڑھک کر نیچے کارپٹ پر سو رہا ہوتا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ الٹا پلٹا سا بچہ بن گیا ہے۔

اور افق جیسے اقوام متحدہ کی سفیر بن گئی تھی۔ کام اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ گھر کے کام اور کھانا پہلی فرصت میں ہی بنا لیتی تھی۔ سباق کے اپنے کام سارا وقت کرتی۔

"کیا تم روز کھانا بنا لیتی ہو یار!" ایک دن وہ آفس سے آ کر بولنے لگا۔

"تو پھر کیا کروں؟"

"کبھی کہہ دیا کرو کہ "فرزام جی! مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔ یہ کھانا وانا میں نہیں بنا سکتی اب چلیں کہیں باہر چل کر کھاتے ہیں۔" وہ اس کی آواز اور انداز کی بھرپور نقل اتار رہا تھا۔

"فرزام جی!" اسی کی طرح "فرزام جی" کو تان میں کھینچا۔ "ہم یہ کھانا باہر چل کر کھا لیں؟"

"یہ کھانا... باہر کہاں؟"

"اس بلڈنگ کے گارڈن میں۔" ہاتھ سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا خیال ہے کہ باہر کھانا کھانے سے میرا یہ مطلب ہے۔ گھر میں پکاؤ اور باہر جا کر کھا لو۔ ہو گیا باہر جا کر کھانا۔ ایسا کرتے ہیں کسی ہوٹل کی پارکنگ میں لے چلتے ہیں اور گلاس لے کر چلتے ہیں اور وہاں کھاتے ہیں کھانا۔ ایسے ہو جائے گا ہوٹل میں کھانا کھانا۔"

وہ خوب ہنسی اور منٹوں میں تیار ہو کر آ گئی۔

"چلیں۔"

"کہاں؟" فرزام کو معلوم تو تھا۔ لیکن اسے چڑا رہا تھا۔

"ہوٹل کی پارکنگ میں کھانا کھانے۔"

دونوں کی جان لگا کر ہنسے۔

☼ ☼ ☼

فنڈ ریزنگ کا پہلا ایونٹ ٹھیک ٹھاک رہا۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ افق کا اسکور بھی اچھا رہا تھا۔ جس کے لیے وہ اور پر امید ہو گئی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی مصنوعات میں وہاں کے لوگوں کی توجہ کا خاص مرکز کیا تھا اور کتنا زیادہ پسند کیا گیا اور کیا سمجھ کر یہ کھدر کے موٹے کرتے تھے۔ جن پر کام تو مشینی کیا ہوا تھا۔ لیکن ان کے ڈیزائن ایسے تھے کہ لگتا تھا کہ ہاتھ سے بنائے گئے ہیں۔ مشینی کڑھائی میں یورپین ممالک ہر ملک سے آگے ہیں۔ اس لیے وہاں کے لوگ ان چیزوں میں خاص دلچسپی لیتے ہیں جو کسی دوسری ثقافت کی نمائندہ ہو۔ ان کرتوں پر روایتی ٹانکوں کو مشین سے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ ہر شخص وہ چیز لینا چاہتا ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو تو ایسے میں دوسرے ملکوں کی روایتی چیزیں دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ ہندوستانی اسٹالوں پر بھی کم و بیش ایسی ہی چیزیں تھیں۔ لیکن رنگوں اور ڈیزائن میں فرق ایک چیز کو دوسری سے الگ کر رہا تھا۔ وہاں ان کا مقصد منافع نہیں فنڈز تھے اور سب ہی چاہتے تھے کہ وہ اچھے فنڈز اکٹھے کر لیں۔ افق کو اچھا لگ رہا تھا این جی او کے لیے کام کرنا۔ مختلف طبقہ ہائے زندگی اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے بے شمار امریکی مشہور و معروف قانون دان، کھلاڑی، صحافی، اساتذہ، ڈاکٹرز، وکیل، اسٹیفنرز اور بے شمار دوسرے لوگ رضا کار بنے ہوئے اپنے اپنے طور پر کام کر رہے تھے۔ سامان کو اٹھانے اور صفائی کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو دو رضا کار اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک ساٹھ سالہ سرجن ڈاکٹر تھے۔ دوسرا رضا کار ایک نوجوان لڑکا تھا۔ جو ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ ایسی صورت حال میں افق کا جذبہ اور بلند ہو گیا۔

واپسی پر وہ فرزام کو ایک ایک بات بتاتی۔ ہیر تک وہ مصروف رہی۔ اگلے دو دن اس کے پاس بہت وقت تھا۔ اس نے گھر کے لیے ضروری خریداری کی۔ فرزام کے دوست کی بیوی نمل اس کے ساتھ ہی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی لڑکی کو لپ اسٹک کے لیے اتنا جنونی نہیں دیکھا تھا، جتنی وہ تھی۔ وہ شاپنگ مال میں، ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے، ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھاتے ہوئے آس پاس موجود خواتین پر نظریں گاڑے رکھتی۔ ان کے ہونٹوں پر۔ اگر خاتون دور ہوتی تو آنکھیں سکیڑ لیتی۔ ورنہ ذرا سا قریب چلی جاتی۔ وہ اس حساب کتاب میں رہتی کہ چمکتی آنکھوں والی سنہرے بالوں والی گلابی رنگت والی لڑکی نے جو پیلی سی ذرا سی ہلکی اور بے بی پنک سے ذرا سی گہری لپ اسٹک یا لپ

گلوز لگایا ہے۔ وہ اس کے پاس ہے نا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے دہراتی جاتی۔

"یہ جو نیلے اسکرٹ میں لڑکی گزری ہے نا۔ ہاں۔ وہ۔ وہ۔ اس نے جو لپ اسٹک لگائی ہے وہ میرے پاس ہے۔ اور وہ جو موٹی عورت نے لگائی تھی وہ نہیں ہے۔" اکثر وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ پین سے ہاتھ پر برانڈ اور لپ اسٹک کا نمبر لکھتی اور "تھینک یو" کہہ کر پلٹ آتی۔

اس کے وارڈروب میں اتنے کپڑے اور جوتے نہیں تھے جتنے لپ اسٹک اور لپ گلوز کے بکس تھے۔ افق میک اپ نام کی چیز سے واقف نہیں تھی۔ نہ ہی اسے شوق تھا۔ لیکن کمل کے کہنے پر اس نے میک اپ کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اس نے سوچا کہ وہ میک اپ کر کے فرزام کو حیران کر دے گی۔ اسے بھی معلوم ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

اسی دن شام کو وہ کاؤچ پر دراز ایک پرانی فلم دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی چائے کا بڑا مگ رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ کمل کے ساتھ خریدا ہوا میک اپ کا سامان لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اسے سب اچھا ہی لگا۔ ابھی اسے میک اپ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ روز ہلکا سا کر لیا کرے تو فرزام کے آنے تک سلیقے سے کرنا آ ہی جائے گا۔

چائے پیتے، فلم دیکھتے اس نے آج خرید کر لائے میگزینز میں سے ایک کو میز پر سے اٹھا لیا۔ یہ مقامی سطح پر شائع ہونے والا اردو میگزین تھا۔ نہ اسے فلم میں دلچسپی تھی نہ ہی فی الحال میگزین میں۔ اسے فرزام کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے فون کیا تو اس نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ "ابھی کرتا ہوں۔" اور پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس کا ابھی چل رہا تھا۔

میگزین کی ورق گردانی کرتے اس کا ہاتھ ایک صفحے پر آ کر ساکت ہو گیا۔ ٹی وی اسکرین پر ہیروئن رو رہی تھی، چلا رہی تھی۔ لیکن اسے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اندھیرے کا ایک گہرا سیلاب اس کی آنکھوں میں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک پل کے لیے تڑپ کر مر گئی۔ حلق اور سانس اکھڑنے کا شدید احساس ہوا۔ وہ واش روم کی طرف بھاگی اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ منہ صاف کر کے دوبارہ لاؤنج کی طرف آئی تو اس میگزین کو گھورنے لگی جو اس کے اس طرح اٹھ کر جانے پر کاؤچ سے نیچے گر گیا تھا۔

اس میگزین میں عدن تھا۔ اس شخص پر نظر پڑتے ہی نفرت سے ہی سہی اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ وہ پلٹ کر وہی افق بن گئی جو ڈی ایچ اے سے غلام علی غلام کے ہاتھوں سے اپنی عزت بچا کر نکلی تھی۔ جس کے گلے میں چادر جھول گئی تھی اور جو سڑک پر جائے پناہ کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اس شخص سے آئندہ اگر کبھی ملی تو وہ اس پر تھوک دے گی۔ لیکن اب وہ کانپ رہی تھی۔ یہ اس کا وہی تھا۔ جس پر وہ بہت پشیمان تھی۔ تھوڑی دیر وہ ایسے ہی کھڑی کارپٹ پر گرے عدن کو دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر میگزین کو اٹھا لیا۔

"ایم بی بی ایس ڈاکٹر عدن غلام علی (پاکستان)" اس تعارفی سطر کے نیچے مختصراً اس کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ درج تھا۔ یہ ایک آرٹیکل تھا جسے ایک مقامی مسلمان صحافی نے شائع کیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے بارے میں تھا۔ جنہیں بے گناہ یا بے حد معمولی الزامات لگا کر سالوں سے جیلوں میں قید کر رکھا تھا۔ ان پر دہشت گردی کا شبہ کیا گیا تھا اور سالوں سے وہ شبہ نہ تو تصدیق میں بدل رہا تھا اور نہ ہی مخالفت میں۔ آرٹیکل میں کل بیس ایسے لوگوں کا ذکر مکمل تعارف اور تفصیل کے ساتھ کیا گیا تھا۔ باقی اعداد و شمار الگ سے تھے۔ افق نے آرٹیکل کو ایک بار پڑھا اور عدن کے ساتھ ہوئے واقعے کو تین بار۔

جب وہ بار بار اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو پڑھ رہی تھی تو شاید انجانے میں وہ اس کے باپ کے ہاتھوں ہوئی اپنی بے عزتی کا بدلہ لے رہی تھی۔

مر گیا بھی نہیں تھا۔ حیرت اور افسوس کی ایک تیز لہر اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک دم ایک ایسی کوری تختی بن گئی۔ جس پر "عدن" ہی ڈوب ابھر رہا تھا۔

ڈور بیل بہت زور و شور سے بجنے لگی۔ اس بار وہ چونکی۔

"تم ٹھیک تو ہو افق؟" کمل نے چھوٹتے ہی پوچھا تو وہ گھبرا گئی کہ اس نے یہی کیوں پوچھا۔

"فرزام کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی فون نہیں اٹھا رہیں۔ وہ کب سے فون کر رہا ہے۔"

"میں واش روم میں تھی۔" اس نے جھوٹ بولا۔ لاؤنج کی طرف واپس آتے وہ اور پریشان ہو گئی۔ اسے قریب ہی رکھے موبائل کے چھ بار بجنے پر بھی پتا ہی نہ چلا۔ آخر کیوں؟ کس لیے؟

فرزام کو فون کیا۔ واش روم کا بتایا۔ وہ بات اس سے کر رہی تھی۔ دیکھ میگزین کو رہی تھی۔

"تھک گئی ہو افق؟"

"نہیں تو۔" جواب کے درمیان ذرا سا وقفہ آیا۔

"تم آرام کرو۔ پھر بات ہو گی۔" وہ ناراض نہیں ہوا تھا۔ اس کی غائب دماغی پر خود ہی یقین کر لیا کہ وہ تھک گئی ہو گی۔

وہ اٹھی اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ عدن کی تفصیل میں اس کے وکیل کا ذکر بھی تھا اور بیان بھی۔ سرچ انجن سے اس نے بوسٹن کے وکیل عبدالعزیز کو ڈھونڈ لیا۔

افق کو معلوم نہیں تھا کہ اس نے عدن سے متعلق یہ آرٹیکل کو کیوں پڑھا۔ فرزام کی کالز کو کیسے مس کر دیا اور اب اس کے وکیل کو کیوں ڈھونڈا۔ افسوس کی لہر جو اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ سب اسی کے زیر اثر کیے گیا۔ ایسا تو تھا ہی نہیں کہ وہ عدن کی شکل بھی دیکھنا چاہتی تھی۔ اسلام آباد سی۔ ایم۔ ایچ کے باغ میں بیٹھ کر اس نے دعا کی تھی کہ زندگی میں یہ شخص ایک بار تو ضرور اسے ملے۔ بے شک افق کے ہاتھ میں کشکول ہو اور عدن کے ہاتھ میں خیرات۔

وہ اس شخص سے ضرور پوچھے گی کہ عزت سے چھوڑ دینے کے لیے تو اس نے خود کہہ دیا تھا۔ اسے دھوکا دے کر بھاگنے کی ضرورت کیا تھی؟

وکیل عبدالعزیز کا نمبر ملایا۔

"محبت ماریہ سے کرتا تھا۔ شادی بھی اسی سے کی۔ دھوکے کے لیے افق ہی کیوں؟" جل جا رہی تھی۔

"اگر وہ کبھی افق کی زندگی میں نہ آتا تو وہ اس کے گھٹیا باپ کے سامنے نہ جاتی۔"

"لائیر عبدالعزیز اسپیکنگ... واٹ کین آئی ہیلپ یو؟"

"ڈاکٹر عدن غلام علی کے وکیل آپ ہیں؟"

"یس!"

"کیا وہ واقعی بے گناہ ہے؟"

"پہلے اپنا تعارف کروائیں لیڈی!"

"کیا وہ دہشت گرد ہے؟"

"آپ کا نام لیڈی...؟"

"کتنی سزا ہو گی...؟ رہا ہو گا بھی کہ نہیں...؟ کیا وہ سچ دہشت گرد ہے؟"

"آر یو مس افق...؟"

"مس افق... مس افق... مس افق..."

فرزام کے فلیٹ میں اس فقرے کی بازگشت گونجنے لگی۔ فون افق کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ وہ اسے کیسے جانتا تھا... سات سمندر پار۔ ایک انجانا شخص۔ جس سے آج اس کی پہلی بار بات ہو رہی تھی۔ وہ اس کا نام لے رہا تھا۔

"آر یو ڈیئر مس افق...؟" وہ یقین ہی کر بیٹھا تھا کہ وہ افق ہی ہے۔

خاموشی کا وقفہ جاری رہا۔

"آر یو او کے...؟"

آخر کار اس نے مری مری آواز میں "یس" کہا۔

"آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"تو آپ مس افق ہی ہیں... میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ پچھلے چار سالوں سے میں نے ایک ہی نام لاکھوں

بارسنا ہے... افق... افق... افق... اسے کہو میرے لیے دعا کرے... مجھے آزاد کروا لے... افق ملی؟ کہاں ہے وہ...؟"

فون اس کے ہاتھ سے گر گیا اور اس کی بیٹری الگ ہو گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر اس نے اپنی چیخ کو روکنا چاہا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ عدن تو دھوکے باز ہے۔ اسے تو اس پر تھوکنا ہے۔ اس کا گریبان پکڑنا ہے۔ پھر یہ سب... اتنے سال وہ اسے یاد کرتا رہا ہے۔ اس کا نام لیتا رہا ہے۔

منہ پر ہاتھ رکھے وہ بیٹھی رہی... ذرا دیر بعد آس پاس ایسے دیکھنے لگی جیسے سپنا ٹوٹ گیا ہو... یا سپنے میں ہو اور بلک بلک کر التجا کر رہی ہو کہ یہ خواب ہی ہو اور بس۔

"او خدایا!" اس نے سر کو تھام لیا۔ آنسو آنکھوں سے رواں ہو گئے... اب یہ آنسو کس احساس کے تحت تھے۔ افق اس کا فیصلہ ابھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ فون کی بیٹری اس میں واپس ڈال کر فون آن کیا۔ عبدالعزیز کا ایک میسج موجود تھا۔

"میرے آفس میں آکر ملیں۔" ساتھ ہی آفس کا پتا بھی لکھا تھا۔ اس نے افق کو آفس میں آنے کے لیے کیوں کہا اور وہ کیوں جائے؟ کس لیے؟ وہ نہیں جائے گی۔ اسے نہیں جانا چاہیے... وہ کیوں نہ جائے؟ اسے کیوں نہیں جانا چاہیے؟

سوالات آگے پیچھے اس کے اندر باہر بن رہے تھے۔

نیلا کرتا' جینز اور جوگرز پہن کر بیگ کو کندھے پر لٹکا کر وہ دروازے کو لاک لگا کر نیچے آگئی۔

افق نے عدن کا اعتبار کیا تھا۔ اس کی مدد لینے ڈی ایچ اے اس کے باپ کے پاس پہنچی تھی۔ یہ دو بڑی غلطیاں تھیں۔ لیکن اس بار وہ ایک خاص غلطی کرنے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے صرف تجسس تھا۔ میں اس لیے یہاں آئی ہوں۔" وہ آتو گئی تھی۔ مگر اب پچھتا رہی تھی۔ بھلا... اچھی بھلی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی بلا سے... دہشت گرد ہی سہی۔

"آپ صرف تجسس مٹانے کے لیے آئی ہیں؟" ایک کہنہ مشق وکیل نے اس کی بودی دلیل کو چٹکی سے ایک طرف کر دیا۔

"یہ سچ ہے۔" وہ اس کا طنز سمجھ گئی۔

"سچ کے بارے میں آپ بھی جانتی ہیں۔ لیکن کیا آپ عدن کی مدد نہیں کریں گی...؟"

"میں...؟" اس لفظ مدد کا تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اسے کہا جائے گا اور اس سے یہ سوال پوچھا جائے گا۔

"آپ پہلی خاتون ہیں۔ دراصل کوئی پہلا انسان ہے جو اس کیس کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہے۔"

"عدن کی وائف...؟"

"ان دونوں کی علیحدگی ہو چکی ہے۔"

"عدن کا خاندان؟" وہ لفظ فادر استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"وہ یہاں نہیں آسکتے۔ اس کے فادر نے کوشش کی تھی۔ انہیں ویزا ہی نہیں دیا گیا۔"

فادر کے نام پر ایک آسمانی بجلی اس میں سے ہو کر گزری۔

"میری جب بھی اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔ "کیا افق ملی...؟ کہاں چلی گئی وہ؟" مس افق! اسے آپ پر بہت یقین ہے کہ آپ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آپ دوست ہیں اس کی۔"

افق نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ خاموش سا ہو گیا۔

"میں نے بہت سی این جی اوز اور قانونی اداروں کو خطوط لکھے ہیں۔ لیکن کسی کی طرف سے کوئی تعاون نہیں ملا۔ اس کا کیس اتنی سست روی کا شکار ہے کہ اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو بھی گیا تو سالوں لگ جائیں گے۔ آپ عدن کی مدد کریں گی مس افق؟"

پھر وہی سوال۔ افق بری طرح سے چڑ گئی۔ "کیا

"کیوں...؟" "آپ اس کی مدد کرنا نہیں چاہتیں...؟" اس نے انٹرنیٹ پر ڈھونڈ کر ہی وکیل کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس کے آفس کے نمبر پر فون کیا تھا۔ اس کے آفس آگئی تھی اور اب عدن کے نام پر اتنا چڑ رہی تھی۔ "ہاں" "نہ" "نہیں" کر رہی تھی۔

"جس نفسیاتی کیفیت سے وہ گزر رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ صرف آپ ہی اسے آزاد کروا سکتی ہیں۔ آپ اس کی امید ہیں۔ اس کا یقین ہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں۔"

"غلط مانتا ہے۔" افق کی آواز تیز ہو گئی۔

"اس نے کہا۔ آپ اس کے لیے دعا کریں گی۔"

"اللہ ہر بے گناہ پر رحم کرے۔"

"اس سے چھوٹی سی غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن وہ دہشت گرد نہیں ہے۔"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

"اللہ جانتا ہے۔ سب کو بتانے کے لیے وہ خود زمین پر نہیں آئے گا۔ بندوں کو ہی سچ اور جھوٹ ثابت کرنے کی کوششیں کرنی ہوتی ہیں۔"

"تو پھر یہ آپ کا کام ہے۔" مطلب افق نے انکار کر دیا۔

"آپ کس کام سے میرے پاس آئی ہیں؟" بہت تحمل سے پوچھا گیا۔

وہ دونوں اس کے آفس میں ایک طرف رکھے صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"کیسا ہے وہ۔" وہ آخر وہاں بیٹھ کر یہ سوال سن کر پھر پشیمان ہوئی۔

"کیسے ہوں گے...؟" ہموار لہجے سے پوچھا گیا کہ ثبوت دو کہ وہ ایسے ہی ہیں۔

اس سوال اور انداز پر افق نے کوئی اور رد عمل نہیں دکھایا۔ وہ اٹھ کر جانے ہی والی تھی۔

"آپ دونوں پاکستانی ہیں۔ مسلم ہیں۔ وہ آپ کو جانتا ہے تو آپ بھی اسے جانتی ہوں گی۔ پاکستانی کمیونٹی میں سے کوئی اس کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا۔ آپ لوگوں میں مدد کرنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس ایسے تین اور کیسز تھے۔ وقفے وقفے سے تینوں ختم ہو گئے۔ کمیونٹی نے' این جی اوز نے اس کی بہت مدد کی۔ کچھ اور بڑے نام سامنے آئے۔ دو کا تعلق تھائی لینڈ سے تھا' ایک کا سربیا سے۔ کیا سب پاکستانی سو رہے ہیں؟ کیا سب مسلم سو رہے ہیں؟ کیا آپ دونوں میں اتنا سا تعلق بھی نہیں ہے کہ آپ...؟"

"میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ درمیان میں ہی بولی۔

"انسان تو ہیں آپ دونوں۔ تعلق نہیں ہے۔ انسانیت کا رشتہ تو ہے... پانچ سال سے وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ دو بار خودکشی کی کوشش کی ہے۔ نفسیاتی دورے پڑتے ہیں اسے۔ خود کو زخمی کر لیتا ہے۔ دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔ چلاتا ہے۔ روتا ہے۔ چند ہفتوں بعد زخمی ہو کر وہ اسپتال ضرور جاتا ہے اور اس پر بھی وہ جب مجھے ملتا ہے تو کیس کا نہیں "آپ" کا پوچھتا ہے۔ وہ اس انسان کے بارے میں بات کرتا ہے' جسے افق جانتی ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں تو کریں۔ شاید تھوڑا ہی بہت ہو۔ اگر پاکستانی کمیونٹی کو اس بارے میں بتا سکتی ہیں تو بتائیے۔ انہیں جگائیں۔ اس سانحے کو سب کی نظروں میں لائیں۔ انسانیت کے ناتے۔ رحم کے ناتے۔ چیریٹی ہی سمجھ کر۔ خدا کے لیے۔"

افق یہ سب ایسے سن رہی تھی۔ جیسے اپنی کسی بیماری کے بارے میں ہدایات سن رہی ہو۔ ایسی بیماری جس کا اسے علاج کروانا ہی نہیں۔ رات بھر وہ خواب میں ڈرتی رہی تھی۔ سالوں پہلے اس کی یہ حالت تب ہوئی تھی۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ اسی رات سوتے میں اس نے دل خراش چیخیں ماریں اور دورے کی سی کیفیت میں آگئی تھی۔ اماں' جمال' اسد سہم کر اٹھ بیٹھے۔ اماں اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔ جمال پانی کے لیے بھاگا۔ اسد ڈر کے مارے رونے لگا۔

وہ دو بار دھوکے اور بے عزتی کے نام پر پڑا تھا۔ اس

کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں باتھ روم میں جا کر اس نے اپنی چیخیں دبائی تھیں۔ رات گئے اس کی آنکھ کھلی تو خواب میں وہ دھاڑیں مارتی رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اماں پسینے میں نہا گئیں۔ اٹکی اٹکی سانسیں لینے لگیں۔ افق نے باقی ماندہ چیخوں کا دم گھونٹ دیا۔ اس نے اپنی ماں کی حالت کو دیکھا اور لب سی لیے ورنہ جس طرح اس کے باپ کے مرنے پر اس کی پھوپھی نے بین ڈالے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی بین ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کی اگلی سسکی اس کی اماں کی جان لے لیتی۔ اس دن کے بعد سے افق اپنے وجود میں قید ہو گئی۔ کیا اسے قید کی سزا نہیں ہوئی تھی تب؟

اس کا جرم محبت تھا اور سزا کے نام پر اسے بہت کچھ بھگتنا پڑا تھا۔ محبت کے نام پر اس نے بھیانک سزا کاٹی۔

"کیا آپ ہماری مدد کریں گی؟" اس سے پھر پوچھا جا رہا تھا۔

وہ خود سے پوچھنے لگی کہ اسے اس کی مدد کیوں کرنی چاہیے۔ وہ اسے چھوڑ گیا۔ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس پر فرض نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی لاکھوں انسان اسی کی طرح ہیں۔ ہر شخص اپنے نصیب کے مطابق ہی دکھ اٹھاتا ہے۔ جیسے وہ اپنے نصیب کے میٹھے پھل اکیلے اکیلے کھاتا ہے۔ عدن نام کا باب اس نے اپنی زندگی سے پھاڑ پھینکا ہے۔ اب وہ اس شخص کا نام بھی کہیں شامل کرنا نہیں چاہتی۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ مجھے کوئی جواب نہیں دے رہیں۔ جس شخص نے سالوں آپ کا انتظار کیا۔ اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوگی۔"

"آپ اسے میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔"

"ظاہر ہے... میں ایک مایوس شخص کو اور مایوس کیوں کروں گا؟"

افق وہاں سے اٹھ آئی اور بے مقصد سڑکوں پر چہل قدمی کرتی رہی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے گئی اور آرڈر دے کر اٹھ گئی۔ وہ بیٹھنا چاہ رہی تھی، گھر [illegible] چلنا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ [illegible] وقت کر رہی تھی۔ بے مقصد گھومتے پھرتے [illegible] آ گئی۔ صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ دن میں صرف [illegible] لے کر پیا تھا اور اب بھی کھانے کے بجائے وہ [illegible] ڈھیر ہو گئی۔

دماغ میں آٹھ سالوں کے خاکے پرزے پرزے ہو کر اڑ رہے تھے۔ جھپک جھپک سب آ جا رہا تھا [illegible] لینڈ لائن فون بجنے لگا۔ وہ گھنٹے سے وہ کاؤچ پر [illegible] تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر اندھیرا [illegible] تھا۔ کوئی لائٹ بھی اس نے روشن نہیں کی تھی۔

"تمہارا فون کیوں بند ہے؟"

"وہ! چارج نہیں کیا تھا۔"

"تم ٹھیک ہو؟"

"بالکل۔"

"کہاں تھیں تم؟"

"میں سو رہی تھی۔"

"سارا دن سوتی رہی ہو؟ اس سے پہلے کہاں تھیں؟"

"میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔"

"کیوں گئیں؟" فرزام کو غصہ آ گیا۔

"کیوں نہ جاتی؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہیں میسج بھی کیا تھا افق! تم کیوں گئیں؟" اس کی جھنجلائی آواز بلند ہوئی اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ اب تو تم گھر میں ہی ہو۔ [illegible] بھابھی کے پاس چلی جانا۔ فارغ ہو کر ان ہی کے [illegible] چلی جایا کرو۔ بور نہیں ہوگی۔"

"میں تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔" اس نے پوچھا نہیں کہ وہ اسے باہر جانے سے کیوں روک رہا تھا۔

افق نے موبائل آن کیا۔ وکیل کے آفس [illegible] جانے سے پہلے اس نے خود ہی اسے بند کر دیا تھا [illegible] پاکستان سے یا فرزام کی کال نہ آ جائے اور اس کے [illegible] سے نکل جائے کہ وہ کہاں آئی ہے اور کس کے پاس اور کیوں ہے۔

"[illegible] میں ڈر گیا۔ خواب تھا شاید۔ [illegible] نیند میں [illegible] کہیں۔ لیکن اس خواب اور ڈر کا تعلق [illegible] خواب مجھے یاد نہیں۔ [illegible] میں نے خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے والا ہو۔ میری تسلی کے لیے احتیاط سے رہنا۔ گھر سے تو باہر جانا ہی نہ۔ تحمل بھابھی کے ہاں چلی جانا بس۔"

فرزام کا میسج پڑھ کر کل سے اب تک اسے پہلی اطمینان کی سانس آئی۔ اپنے شوہر کے اتنے فکرمند ہونے پر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس میسج پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ دنیا میں سب سے پیارا دل فرزام کا تھا اور اس دل کی مالک وہ تھی۔ اس نے عدن کے خوف سے بچنے کے لیے اس کے لیے جوگ لے لینے کے ڈر سے فرزام سے شادی کی تھی۔ اور کون تھا جو فرزام کو پسند نہیں کرتا تھا اور وہ اسے سب سے زیادہ پسند کرتی تھی۔ اسی نے اس کا نفسیاتی علاج کیا تھا۔ اسے پر اعتماد بنایا تھا۔ اسی نے اسے سکھایا تھا کہ لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دے اور یونیورسٹی میں اس نے کسی بھی لڑکے سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے باتیں کرنے آتے تھے اور وہ بڑے طریقے سے انہیں [illegible] دکھا دیتی تھی۔

فرزام اس کی ذہنی تعمیر میں حصہ دار تھا۔ وہ اس کے [illegible] ہونے، چھوٹے گھر کی ہونے پر اسے کچھ جتاتا نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھول کر بھی عدن کا نام اس کے سامنے نہیں لیا تھا۔ دونوں کا بہت ہی خاص قریبی رشتہ تھا اور دونوں ہی اس خاص رشتے کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بہت خاص تھے۔

تیار ہو کر وہ تحمل کے پاس آ گئی۔ ذرا سی کے ساتھ [illegible] رات میں تین عدد نیند کی گولیاں کھا کر سو گئی۔

اگلی صبح عبدالعزیز کا میسج موجود تھا۔ وہ اسے ملنے کے لیے بلا رہا تھا۔ افق نے میسج ڈیلیٹ کر دیا۔ آج اسے بہت سے کام تھے۔ اسے این جی او جانا تھا۔ انہیں اگلے ایونٹ کے لیے بریفنگ دی جانا تھی۔

دوسرے ہفتے کا ایونٹ بھی شاندار رہا۔ اور مجموعی طور پر کافی منافع ہوا۔ اس کا اسکور اس بار بھی اچھا ہی تھا۔ سب کے لیے مشترکہ تالیاں بجوائی گئیں۔ "فردا" "فردا" ان کی تعریف کی گئی۔ مسٹر جین اس کے پاس بھی آئے۔ وہ پچاس پچپن سالہ چھ فٹ کے سفید فام امریکن تھے۔ سب سے ایسے باتیں کرتے۔ جیسے وہ ان کے شاگرد اور سامنے والا ان کا استاد محترم ہے۔ اتنی عاجزی تھی کہ سارا وجود ہی جھکا ہوا تھا۔ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں بھی۔

"کیا آپ کو امریکی جیلوں کے بارے میں معلوم ہے کہ وہاں کتنے بے گناہ لوگ قید ہیں؟"

وہ اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ اچانک سے ہی ان سے یہ سوال کر بیٹھی۔ مسٹر جین کی آنکھوں کا رنگ بدلا جیسے وہ جانتے تھے کہ یہ صرف ایک سوال نہیں ہوگا۔ مختلف ملکوں کے دوروں کے دوران ان سے ایسے سوال پوچھ ہی لیے جاتے تھے۔ خاص طور پر نوجوان تو ان کی جان کو آ جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ خود ایک امریکی ہیں اور کسی بھی گورے کو دیکھ کر انہیں لگتا ہے کہ یہ بھی گوانتاناموبے کے ظالموں میں سے ایک ہے۔ اگر نہیں ہے تو اس ڈھانچے کا حصہ تو ضرور ہی ہے اور اگر یہ بھی نہیں تو چلو "وہ امریکی تو ہے نا" جو اپنے علاوہ ہر مذہب اور قوم سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی این جی او کے فعال کارکن تھے جو تھرڈ ورلڈ کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ صرف انسانیت کے لیے کام کرتے تھے اور اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ شامل نہیں تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ گڑبڑا گئے اور مزید بحث سے بچنا چاہا۔

"آپ کی این جی او کو اس کے لیے بھی کام کرنا چاہیے۔"

"بہت سے امریکن بھی ان حالات کا شکار ہیں اور ایسے ہی جیلوں میں قید ہیں۔" وہ دراصل یہ ایک نکتہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ صرف مسلمان ہی اس سب کا عتاب نہیں سہتے۔

"پھر آپ کو ان سب کے لیے کام کرنا چاہیے۔"

"بہت سے دوسرے ادارے اس پر کام کررہے ہیں۔ ہم ان مسائل پر کام نہیں کرتے۔ ہماری این جی او کا یہ منشور نہیں ہے۔"

"میں آپ کے لیے اتنی محنت کررہی ہوں مسٹر جین۔ آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہیے۔" افق نے سنا ہی نہیں کہ مسٹر جین نے کیا وضاحت دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ امریکی سب کچھ کرسکتے ہیں۔ تباہی بھی اور آبادکاری بھی۔

"آپ کے لیے کیا؟" اس بات پر وہ اور الجھ گئے۔

افق کا مسٹر جین کو روک کر یہ سب کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس آئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھوڑا سا غصہ آگیا۔ اسے آرٹیکل میں موجود باقی لوگوں اور دوسرے اعداد و شمار کا خیال بھی آیا اسے ایک دم سے یہ لگا کہ اپنے کام کے لیے تو یہ امریکی اس سے کام لے رہے ہیں تو اس کے کام کے لیے کیا یہ آگے آئیں گے؟ یہ سب سوچتے وہ یہ بھول رہی تھی کہ تھرڈ ورلڈ میں پاکستان بھی شامل ہے اور پاکستان کے دیہی علاقوں میں اسی این جی او کے کارکن ویکسین کی سپلائی کے لیے پہنچتے ہیں۔ مختلف انجکشن اور ڈراپس ان ہی کی طرف سے جاتے ہیں۔

اس نے انہیں ڈاکٹر عدن کے بارے میں بتادیا۔ وہ خاموشی سے سب سنتے رہے۔ دو دن بعد انہوں نے افق کو این جی او کے لیے اپنے رضاکار صحافی سے ملوایا۔ صحافی کا تعلق ایک بڑے میڈیا گروپ سے تھا اور وہ اس گروپ کے اخبار، میگزین اور ٹی وی کے لیے کام کرتا تھا۔ صحافی کی ملاقات اس نے عبدالعزیز سے کروادی۔ وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اگر وہ اس معاملے میں تھوڑا بہت شامل ہوئی تھی تو آگے نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس نے عبدالعزیز سے وعدہ لیا تھا کہ اس کا نام اور شناخت سامنے نہیں آئے گی۔ خاص طور پر عدن کو اس بارے میں بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔ عبدالعزیز کا خیال تھا کہ صحافی ان کی بہت مدد کرسکتا ہے اور وہ اس صحافی سے مل کر حقیقتاً "بہت خوش ہوا تھا چند ہی ہفتوں بعد مسٹر جین نے افق کو چند دوسری این جی اوز کی طرف بھیج [illegible] انہیں افق کا کیا گیا طنز بہت برا لگا تھا۔ وہ بار بار [illegible] کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ کرسکتے ہیں [illegible] کریں گے۔ افق نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان [illegible] اوز کے نمائندوں سے پھر بات چیت کی۔

مسٹر جین کے ساتھ کی گئی جذباتی بات چیت [illegible] کارگر ثابت ہورہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے نہ نہ کر [illegible] بھی افق اس سب میں اتنی شامل ہوگئی۔ این جی [illegible] کے نمائندوں نے وکیل سے ملاقات کی۔ اس [illegible] کیس ہسٹری لی۔

"آپ نے مجھے حیران کردیا ہے۔" عبدالعزیز [illegible] اسے میسج آیا۔ اس کا منہ بن گیا پڑھ کر۔ اسے تعریف اچھی نہیں لگی۔ کاش وہ بھی آفس گئی ہی نہ ہوتی اور نہیں تو اس نے وہ رسالہ ہی نہ خریدا ہوتا۔

عبدالعزیز کی براہ راست بات چیت این جی اوز [illegible] ہونے لگی۔ اس نے عبدالعزیز سے صاف صاف [illegible] دیا کہ اس نے جتنے ریفرنس دینے تھے وہ دے چکی اب اسے پریشان نہ کیا جائے۔

آئندہ آنے والے چند اور ہفتوں میں ایک اور [illegible] ہوا۔ صحافی اسکاٹ جو اس سارے معاملے کے لیے مواد اکٹھا کررہا تھا۔ اس نے دو سینیٹرز اور ایک [illegible] وان کے سامنے ایک لائیو ٹاک شو کے دوران اس مسئلے کو اٹھایا۔ عبدالعزیز کی طرح ایسے ہی کیسز ہینڈل کرنے والے دوسرے وکلا اور متاثرین کے خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ چند ڈاکومنٹریز چلائی گئیں۔ صرف شبے پر قید مجرموں کی بابت طرح طرح کے سوالات کیے گئے۔ ایسے شوز وہاں آئے دن ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی نظروں سے ایسے واقعات چھپے ہوئے ہیں کم از کم کسی طرح ان کے کانوں تک یہ خبر ضرور پہنچ جاتی ہے۔ اسکاٹ نے اسی مسئلے پر ایک فیچر لکھا اور اس نے [illegible] راست حکومتی اداروں پر تنقید کی۔ چند اخبارات نے نئے سرے سے عدن اور اس جیسے کیسز کے بارے میں خبروں کو نمایاں جگہ دی۔ سالوں سے قید [illegible] لوگوں کو بہت ترس آیا۔ یہ ان جیلوں میں بند [illegible] لوگوں کے لیے وسیلہ بن رہا تھا یا صرف عدن کے لیے یہ قدرت ہی بہتر جانتی تھی۔ لیکن اس تھوڑی سی حرکت سے شاید کسی کو بہت فائدہ ہونے والا تھا۔

این جی او کا ایک نمائندہ جاکر عدن سے جیل میں ملا۔ اسی این جی او نے مختلف کمیونیٹیز کے لوگوں کو اکٹھا کرکے واک کا اہتمام کیا۔ افق کو بھی بلایا گیا لیکن وہ نہیں گئی۔ اب تو اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر ایسے کیسز حل ہوجائیں تو منظر عام پر لایا جائے کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے اور نہیں تو کوئی صحافی اسی کے پاس نہ آجائے انٹرویو لینے۔ سڑک پر چلتے اگر کوئی اسے ایسے ہی دیکھ لیتا تو اسے یقین ہوتا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ "اچھا! وہ تم ہو جو عدن کے لیے اتنا سب کررہی ہو؟ کون ہے عدن تمہارا؟"

"نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر کیا تو ترس کھاکر انسانیت کے ناتے۔"

پھر اسے جانے کیوں کھوکھلے قہقہے بلند ہوتے سنائی دیے۔ [illegible] دن گزرے اسے عبدالعزیز کا فون آیا۔

"عدن ٹھیک ہی کہتا تھا کہ افق ہی اسے آزاد کرواسکتی ہے۔" وہ شاید اس کے تعاون کا اپنے الفاظ میں شکریہ ادا کررہا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"آئی ایم سوری۔ آپ ناراض مت ہوں۔" عبدالعزیز گھبرا گیا۔ افق شرمندہ ہوئی۔

"میں ناراض نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کے کہنے پر چند این جی اوز کو اس مسئلے کے بارے میں بتایا تھا۔ جو کچھ کیا ہے وہ آپ نے اور ان لوگوں نے کیا ہے۔ آپ پلیز! مجھے کریڈٹ نہ دیں نہ ہی آپ میرا نام سامنے لائیں گے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرا نام ظاہر نہیں کریں گے۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں مس افق! آپ مجھے وعدہ خلاف نہیں پائیں گی۔ چند اخبارات میرا انٹرویو لے چکے ہیں۔ عدن کے فادر سے میں نے فنڈز منگوائے ہیں۔ یہی صحیح موقع ہے کہ ان این جی اوز کو فنڈز دیے جائیں۔ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ چند پاکستانیوں نے رابطے کیے ہیں مجھ سے۔ وہ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔"

"آپ مجھے دوبارہ فون نہیں کریں گے۔" اس نے ساری تمیز تہذیب ایک طرف رکھ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فون بند کردیا۔

عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور دوبارہ فون نہیں کیا۔ ویک اپ کال دی جاچکی تھی۔ عدن جیسے پندرہ اور لوگوں کے کیسز نکل آئے تھے۔ سوشل میڈیا ان کیسز کے لیے زیادہ فعال تھا۔ باقاعدہ احتجاج کیے جارہے تھے۔ آئے دن نئی نئی خبریں سامنے آتی تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کے بیانات سامنے آتے تھے۔ سست رفتاری سے عدالت میں چلنے والے ان کیسز نے کچھ رفتار پکڑ ہی لی۔

☼ ☼ ☼

این جی او سے کیا گیا فنڈ ریزنگ کا معاہدہ مکمل ہوا اور اسے بہترین کارکردگی اور این جی او کارکن بننے پر سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ جسے اس نے فریم کرواکر ریک پر سجالیا۔

فرزام نے ہفتہ بھر پہلے کالج میں اس کا آن لائن ایڈمیشن کروادیا تھا۔ اس نے چھ ماہ کے ڈیزائننگ کورس کے لیے کالج جوائن کرلیا تھا۔ فرزام کے آنے تک اسے فارغ نہیں رہنا تھا۔ صبح سے دوپہر تک وہ کالج ہی میں ہوتی۔ وہاں سے اکثر اسٹور چلی جاتی۔ ایک پاکستانی اسٹور پر انہیں ایک سائیڈ کارنر مل گیا تھا۔ "وجیز" کا لیبل اس کارنر پر لگا دیا گیا۔ اس نے کارنر کی سیٹنگ کرلی۔ دو دن بعد وہ وہاں کا چکر لگالیتی تھی۔ رات کو وہ اپنے کالج کے اسائنمنٹ پر کام کرتی۔ ہلکی پھلکی مصروف زندگی جاری تھی۔ سب ٹھیک ہی تھا۔

اس کے پاس عبدالعزیز کا میسج آیا کہ وہ اسے ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہے۔ افق کو یقین تھا کہ وہ

اسے یہی بتائے گا کہ عدن کا کیس ختم ہو گیا ہے۔ اسے اس خبر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کیس ختم ہوتا ہے یا وہ چند سال اور جیل میں رہتا ہے۔

عدن کے بارے میں پڑھتے اور جانتے ہی وہ تھوڑی جذباتی ہو گئی تھی۔ لیکن اب وہ مضبوط تھی۔ اس کے اعصاب قابو میں تھے۔ عدن کتنا بھی بے گناہ تھا۔ لیکن اس کے لیے وہ دھوکے باز ہی تھا اتنے سال اگر وہ اسے یاد کرتا رہا ہے تو "شاید ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کے مصداق وہ افق کا سہارا لیتا رہا ہے۔ ماضی میں وہ اسے دعاؤں کے لیے کہتا رہا تھا اور اس کا عقیدہ بن چکا تھا کہ صرف افق کی ہی ہر دعا قبول ہوتی ہے اور ضرور ہی قبول ہوتی ہے۔ اس طرح کی قید میں رہ کر کوئی بھی ایسے سہارے ڈھونڈ سکتا ہے۔ ایسے وقتوں میں ایسے افراد کو پھر ماضی ہی یاد آتا ہے۔ پھر وہ ان ہی لوگوں کو یاد کرتے ہیں جو اچھے تھے، مخلص تھے۔ ایسے افراد کو دھوکا دیا جاسکتا ہے بھلایا نہیں جاسکتا۔ وقت کا دھارا بدلتے ہی ایسے مخلص لوگ نتھر کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔

افق نے اس سب پر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ عدن کے ساتھ جو ہوا وہ افق کے ساتھ برا کرنے کی سزا ہے۔ افق اتنے پیارے دل کی تھی کہ اس نے یہ سوچا ہی نہیں۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے اندر سے اس شخص کی سب باقیات نکال پھینک رہی تھی۔

"عدن آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" عزیز کی آواز گونجی۔ فون پھسل کر اس کی گود میں آگرا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے خود ہی فون کر لیا۔

"کیسے؟ آپ نے اپنا وعدہ توڑا؟"

"این جی او کا جو نمائندہ اس سے جیل ملنے گیا تھا۔ اسی نے ذکر کیا آپ کا۔ اس بار میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ آپ کا بہت شدت سے پوچھ رہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا اور لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔

"او کے! میں نے آپ کو مطلع کر دیا ہے اس بارے میں۔" جواب دیے بنا اس نے فون بند کر دیا۔ بے چینی گھبراہٹ میں بدل گئی۔ اس شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں ہے۔ اس کے سپچھے یہ سب اس نے کیا۔ افق جو یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ اسے اب کبھی بھی نہیں چاہتی۔ اب وہ شخص اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت کوشش کی اس نے کہ اسائنمنٹ پر کام کرے۔ لیکن نہیں کر سکی۔ فرزام رات دن کر کے تھک جاتا تھا۔ وہ سو رہا ہو گا۔ ورنہ وہ اسے فون کر لیتی۔ اگر وہ سو نہ رہا ہوتا تو اس وقت آن لائن ہی ہوتا۔ اٹھ کر وہ نمل کے پاس آگئی۔ وہ ایک انگلش فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ نمل نے قریب رکھی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"کچھ اور لاؤں؟"

"نہیں۔" کہہ کر اس نے بڑا کا ایک پیس اٹھا لیا۔

"پریشان ہو؟" فلم کی ہیروئن کی لپ اسٹک پر نظر رکھ کر نمل نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"فرزام کو یاد کر رہی ہو؟" اس سوال پر وہ صرف مسکرا دی۔

"فرزام سے کہو ایک چکر لگا جائے۔ اتنا مصروف ہے کیا وہ؟" نمل کی نظریں اب بھی اسکرین پر ہی جمی تھیں۔

"بہت مصروف ہیں۔ ویک اینڈز میں بھی کام کر رہے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ جلد ہی فارغ ہو کر آجائے گا۔"

یہ تو فرزام بھی اس سے کہتا تھا کہ رات دن دس لوگوں کی ٹیم کام کر رہی ہے۔ چھ مہینے کے اندر اندر کام کو مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ سوفٹ ویئر کی تیکنیکی خرابیاں جانچیں گے۔ پھر اسے اپلائی کیا جائے گا۔ مارکیٹ میں لایا جائے گا۔ اب جب وہ اس سے آن لائن باتیں کرتا تو چھوٹے چھوٹے جملے بنا جھجکے کہہ دیتا۔ وہ اسے بہت یاد آتی ہے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور کبھی کبھی اتنا کہ وہ کمانڈز لکھنے کے بجائے اس کا نام لکھ دیتا ہے۔ اب وہ اسے یاد کرتے ہوئے سوتا ہے اور یاد کرتے ہوئے اٹھتا ہے۔ مزید اسے وہ عدد پر چاہئیں کہ کینیڈا سے پرواز کر کے وہ اس کے پاس آجایا کرے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ کمپنی کے ساتھ معاہدہ چرا کر پھاڑ کر پھینک دے۔ ایک دن وہ لیپ ٹاپ پر ذرا آگے کو جھکا اور وہ انگلیاں اسکرین پر رکھیں۔

"میں تمہاری ناک کو پکڑ کر ایسے ایسے کرنا چاہتا ہوں۔" انگلیاں دائیں بائیں ہوئیں "اور پھر تمہاری ٹھوڑی کو ایسے پکڑ کر چہرے کو اوپر اٹھانا چاہتا ہوں۔"

ریشما ہی ٹشو سے لیپ ٹاپ کی اسکرین صاف کی۔

"سب گلابی گلابی کیوں ہو رہا ہے۔"

وہ ہنسی اور گلابی ہو گئی۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔" ٹھہر کر سرگوشی کی۔

اس نے اداسے ٹھوڑی کے نیچے بایاں ہاتھ نکالیا۔

"اور تمہاری آنکھیں جب ذرا سا جھک کر اٹھتی ہیں اور میری آنکھوں سے ملنا نہیں چاہتیں۔ آس پاس سے بچ کر نکل جاتی ہیں تو کمال لگتی ہیں۔ ہاں۔ ہاں۔ بالکل ایسے ہی۔"

ٹشو سے پھر اسکرین صاف ہونے لگی۔

باقی کا وقت وہ ان باتوں کو بار بار سوچ سوچ کر گلابی ہوتی رہتی اور پھر اس کا جی چاہتا کہ فرزام ایسی ہی باتیں کرتا جائے بس۔ بلکہ وہ دونوں ہی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہیں۔ خوش ہونے کے سامان پیدا کرتے رہیں اور محبت کی طرف بڑھتے ہی جائیں۔ نمل کے ساتھ فلم دیکھتے دیکھتے وہ اونگھنے لگی تو اپنے کمرے میں آکر سو گئی۔ فرزام کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ ایسے ہی میٹھی نیند میں چلی جاتی۔ نعمت ہوتے ہیں وہ تعلق، وہ رشتے جو تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ سکون کی نیند کا باعث بنتے ہیں۔ والدین کی آغوش میں بچے ایسے ہی بے فکری سے نہیں سو جاتے۔ اور ایسے تعلق جو نیندیں چھین لیتے؟

☼ ☼ ☼

کالج میں اس کی دو تین اچھی دوستیں بن گئی تھیں۔ وہ انہیں چیزی کی کلیکشن دکھانے اسٹور بھی لے گئی۔ وہ سب اس بات پر کافی حیران ہوئیں کہ وہ پہلے سے ہی زندگی میں اتنی کامیاب ہے۔ اس کامیابی کے لیے افق نے کافی پاپڑ بیلے تھے اور کامیاب ہونے کے لیے پاپڑ بیل لینے چاہئیں۔ محنت اور کام سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

ان ہی دوستوں کے ساتھ وہ کبھی کبھار سیر کے لیے بھی چلی جاتی تھی۔ وہ لوگ اکٹھے خریداری بھی کر لیتے تھے، کافی پیتے تھے، آئس کریم کھاتے تھے، اسائنمنٹ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور فون پر گپ شپ لگا لیتے تھے۔

کالج سے نکل کر وہ سڑک پر آگئی۔ اسے بس اسٹاپ تک پیدل جانا تھا۔ اسے ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی وہ آرام آرام سے چل رہی تھی۔ اکثر وہ راستے میں آنے والے ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ سے لنچ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ اس کے مزاج اور بھوک پر تھا کہ وہ ریسٹورنٹ سے لنچ کر لے یا گھر جا کر نمل کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ چلتی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دم سے کسی نے پیچھے سے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ تیز تیز پیدل چلتے راہ گیر بھی رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"یہ میں ہوں۔" فرزام اس کے سامنے آیا۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولے ایک امریکی کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ "سب ٹھیک ہے نا؟"

"سارے سرپرائز کا مزا خراب کر دیا تم نے۔" فرزام بری طرح سے شرمندہ ہوا۔ "کالج سے آرہی ہو یا کوئی ہارر موویز دیکھ کر۔"

اس کے اوسان اور سانس بحال ہوئی جیسے "او تو یہ تم ہو۔"

وہ اپنی جگہ پر بہت شرمندہ ہوئی۔ رات سے ہی ڈری ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے باہر۔ کھڑکی سے باہر۔ کوئی کھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ کالج آتے ہوئے کوئی پیچھے آتے محسوس ہو رہا تھا کئی دنوں سے ایسے ہی چل رہا تھا۔ فرزام کو دیکھ کر خوش بھی نہیں ہو سکی۔ چہرے

سے کشمکش ہی نمایاں تھی۔

"مجھے لگا کہ خوشی سے تم مجھ سے لپٹ جاؤ گی۔ تم نے تو سب کو ہی چونکا دیا۔" اس کا اشارہ راہ گیروں کی طرف تھا۔

"میں ڈر گئی تھی۔ میں حیران بھی ہوئی ہوں۔" اس نے بات کو سنبھالا۔

"بہر حال میں بہت ناراض ہوں اب۔" ہاتھ سینے پر باندھ کر فوجی مارچ کے سے انداز میں وہ آگے تیز تیز چلنے لگا۔

"میں منالوں گی۔" وہ پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ آنے لگی۔

وہ منہ پھلائے چلتا ہی رہا۔ تیز سے تیز ہو گیا۔

"پلیز رکو۔" ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے وہ ہانپنے لگی۔

وہ اور تیز ہو گیا۔ اب وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی اس کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"آئی ایم سوری۔" دونوں کان پکڑ کر بے چاری سی صورت بنا کر کہا۔

فرزام نے اس کی ناک پکڑی اور دائیں بائیں زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

"آف۔ مجھے درد ہو رہا ہے مسٹر۔"

"اس ہولناک چیخ سے میں بھی ڈر گیا تھا میڈم!" ناک بدستور دائیں بائیں ہلائی جا رہی تھی۔ کان بدستور پکڑے ہوئے تھے۔ دونوں ایک فریم میں اچھی تصویر بنا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

فرزام جمعہ کو آیا تھا اور دو دن رہ کر چلا گیا اس بار افق کا جی چاہا کہ اسے واقعی میں نہ جانے دے۔ اسے پکڑ کر گھر میں لاک کر دے اور خود بھی لاک ہو جائے۔ لیکن وہ صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اب بھی ملنے کے لیے نہ آتا تو یقیناً" اس کا دم نکل جاتا۔

"چند ہفتوں کا ہی کام رہ گیا ہے۔ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں۔ خیر! ایسا سرپرائز تو تمہیں اب نہیں دوں گا۔ بس تم تیار رہنا۔ ساری خریداری کر لینا ابھی یا ہم مل کر کر لیں گے۔ بہت اچھے پیسے مل رہے ہیں مجھے بہت کچھ لے کر دے سکتا ہوں تمہیں۔ چاہو تو فہرست بنا لینا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چیزیں لکھنا۔ انکار نہیں کروں گا۔ دونوں ماؤں کو پہلے سے ہی پیسے بھجوا دیے ہیں اور تمہارے بزنس میں بھی پیسے انویسٹ کروں گا۔ جاب کا کانٹریکٹ سائن کرتے ہی تمہیں امریکا میں یا جہاں تم کہو گی ایک اسٹور لے دوں گا۔ دبئی کیسا رہے گا؟ برطانیہ جانے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا ہے اب میں برطانیہ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ اسے مجھ جیسا قابل لڑکا نہیں ملنا چاہیے۔ عارضی شہری کے طور پر بھی نہیں۔ کیا معلوم وہ مجھے ہتھیا ہی لے۔ مجھ سے کہے کہ شہرت لے لو یہیں کی۔ لیکن میں انکار کر دوں گا۔ میرا خیال ہے' کمپنی مجھے ساؤتھ ایشیا ہی بھیجے گی۔ میں اوکے ہوں۔ وہ مجھے جہاں بھی بھیج دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں بھی اوکے ہوں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں۔"

"یہاں سے سن کر یہاں سے نکال دی۔" اس نے دائیں سے بائیں کان کی طرف اشارہ کیا۔

"تم پریشان ہو افق؟" وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن اسے لگا کہ وہ خود پر پردے ڈال رہی ہے۔

"ایسا کیوں ہو گا بھلا؟" جواب نہیں دیا۔ سوال کر لیا۔ الٹا کہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ خوف نام کی ایک بیل اس کے اندر پھولتی پھیلتی ہر شے سے لپٹتی جا رہی تھی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ وہ پردے ڈال رہی ہے ہنسی اور مسکراہٹ کے۔ اگر وہ یہ پردے ہٹاتی تو فرزام اس سے کئی سوال کرتا۔ ہر سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس اور اگر ہر سوال کا جواب دے بھی دیتی تو شاید فرزام کی تسلی نہ ہوتی اور ان دونوں میں کچھ نہ کچھ ضرور بگڑ جاتا۔ اس نے خود کو روکے رکھا اور اس سے کہا نہیں کہ کانٹریکٹ کو چاک کر پھاڑ آؤ اور آؤ! بھاگ چلتے ہیں امریکا سے راتوں رات اور پاکستان چل کر اپنی دنیا گھر بساتے ہیں۔ آؤ! ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہیں سکی اور فرزام اکیلا ہی واپس چلا گیا لیکن واقعی صرف چند مزید ہفتوں کے لیے۔ وہ اسے لینے ایئرپورٹ گئی۔ رات کو فرزام نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے بازو میں دیا اور دونوں نیو بری (New Bury) آ گئے۔

فرزام بہت خوش تھا۔ جیسے ہر کام سے فارغ ہو چکا ہو۔ جیسے طویل محنت کے بعد اسکول کے بچے امتحان سے فارغ ہوتے ہیں اور جیسے ایک لمبے انتظار کے بعد کوئی خاص دن آتا ہے۔ آخر آ ہی جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ افق نے فہرست نہیں بنائی تھی۔ اچھا ہی کیا تھا کہ نہیں بنائی کیونکہ بنا فہرست کے ہی وہ اتنا سب کچھ لے رہا تھا۔ اس نے اس سے جس فراک کا وعدہ کیا تھا ایک بڑے اسٹور سے وہ فراک لے رہا تھا۔

"پیرس فراک کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔" ساتھ ساتھ بتایا۔

وہ بار بار اس کی پسند کے کوٹ پہن پہن کر دیکھتی رہی۔ جو اسے اس پر اچھا لگا' وہ اس نے لے لیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں ہاتھوں میں طرح طرح کے ہولڈنگ بیگز پکڑا پکڑا کر بیگز پسند کیے۔ بڑے بڑے شولڈر بیگز الگ سے لیے۔ اس وقت اس کا خریداری کا تجربہ اچھوں کو مات دے سکتا تھا۔

"گر پیرس میں مجھے کسی نے یہ کہہ دیا کہ میری بیوی کتنی اولڈ فیشن ہے تو میں اس کا جبڑا توڑ دوں گا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میری وہاں کسی سے ایسے لڑائی ہو؟" وہ انتہائی سنجیدگی سے سوال کر رہا تھا۔

"تم نے ایک رولیکس کا وعدہ بھی کیا تھا میں نے ..."

"تمہارے وعدے اس نے خود ہی کیے تھے اور اپنے وعدے وہ یاد سے خود ہی پورے کر رہا تھا۔ اس کے پاس واقعی بہت پیسے آ گئے تھے۔ افق نے اسے اپنا کریڈٹ کارڈ دینا چاہا۔ لیکن اس نے اس کا بیگ کھول کر اس میں سے چند ڈالرز نکال لیے۔

"تمہاری طرف سے فی الحال آئس کریم کھا لیتے ہیں۔"

وہ ڈبل ڈیک آئس کریم لے آیا۔ آئس کریم اتنی بڑی تھی کہ وہ دونوں پندرہ منٹ سے لے کھا رہے تھے۔ شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے نیو بری کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔

"تم یہیں کھڑی رہنا۔ میں ابھی آیا۔ دیکھو! میرے پیچھے نہ آنا۔ اگر تم میرے پیچھے آئیں یا مجھے دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں تو میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان سڑک کے عین وسط میں بیچ زمین پر پھیل کر رونے لگوں گا۔"

رش میں اسے ایک طرف کھڑا کر کے وہ کہہ کر اسے اپنی طرف سے الٹی طرف گھما کر اس کے پیچھے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں افق فوراً" پلٹی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک بڑی جیولری شاپ میں جا رہا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ وہ جانتی تھی' وہ اس کے لیے ایک عدد انگوٹھی لینے جا رہا ہے۔ ایک ایسی انگوٹھی کا نہ اس نے وعدہ کیا تھا' نہ ہی تذکرہ۔ وہ اسے پرپوز کرے گا۔ پروپوز کرنے کا بھی اس نے وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی اسے خواہش تو بہت ہوگی۔ پرانی انار کلی میں وہ اس سے شادی کا کہہ رہا تھا۔ اب وہ اس سے اپنی محبت کا کہے گا۔ پہلے اس نے بتایا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ بتائے گا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔

نیو بری کی پر رونق سڑکوں کی رونق مزید بڑھ گئیں۔ رات کی چکا چوند میں اضافہ ہو گیا۔ گہما گہمی بڑھنے لگی دور و نزدیک بڑی بڑی دکانوں اور اسٹورز پر لگے بورڈز اور جگمگانے لگے۔ اپنی مام ڈیڈ کے ہاتھ پکڑے' پاپ کارن' آئس کریم کھاتے مسکراتے بچے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نوجوان لڑکے لڑکیاں۔ یہ سب افق کو بہت اچھا لگا۔

"فرزام اس کے لیے انگوٹھی لینے گیا ہے۔"

چند دنوں سے وہ جتنی پریشان تھی۔ وہ پریشانی جاتی رہی۔ وہ افق سے صرف مسز فرزام بن گئی۔ ایک

عرصے سے اس کی زندگی مستحکم تھی۔ لیکن اب وہ وقت تھا جب وہ بے حد خوش تھی۔ ایک عورت کو اپنی زندگی میں ہر پل اس ایک لمحے کا انتظار ضرور ہوتا ہے جب کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اس کے دل پر اس کا راج ہے اور وہ اس راج میں غلام بننے کے لیے بخوشی تیار ہے۔ اس گھٹنے ٹکائے غلام پر خود کو لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسے اپنا سردار، اپنے سر کا تاج بنانے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر راج کرتے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہو جاتے ہیں۔

ان گئے سالوں میں وہ فرزام سے متاثر ہوئی تھی۔ اسے اچھا جانا تھا۔ وہ ہیرے کے دل والا تھا اور اس ہیرے کے دل میں اس نے اپنی تصویر دیکھ لی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے پیارا تھا اور وہ اسے بھی سب سے زیادہ پیارا تھا۔

سڑک کے ایک طرف کنارے پر کھڑے افق یہ اعلان کرنے کے لیے تیار تھی کہ انسانوں میں ایک بے حد پیارے انسان "فرزام" سے وہ محبت کر لی ہے اور بے حد کرتی ہے۔ کرتی رہے گی اور کبھی بیزار ہے گی نہیں۔ اس اعلان کو کرتے وہ جھجکے گی نہیں۔ وہ وہاں سے گزرتے ہر شخص کو روک روک کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ دیکھو! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ تم سب کتنے بدنصیب ہو۔ فرزام صرف میرے پاس ہے اور تم سب اس جیسے کے بغیر ہو۔ وہ تمہیں نہیں ملے گا۔ وہ صرف میرا ہے۔ اب وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ آئس کریم والے کو بیگ میں سے نکال کر بہت سارے ڈالرز پکڑا دے اور کہے کہ سب میں ساری آئس کریم مفت بانٹ دے۔ سب کو آئس کریم ملنی چاہیے سب کو مسکرانا چاہیے۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کو چاہیے کہ اسے "فوراً" مبارک باد دیں۔ سب اکٹھے ہو کر اسے چیئرز کریں۔ مل کر تالیاں بجائیں اس کے لیے کوئی محبت بھرا لوک گیت گائیں۔ ہر تہوار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے۔ محبت کی وقوع پذیری کا جشن بھی شان سے منایا جانا چاہیے۔ اس جشن میں باقی سب جشنوں کو مات دے دینی چاہیے۔ محبت کی دھنک ابھر کر جب سامنے آتی ہے تو اس کے ساتھ جھول کر ناچنے گانے کو ہی جی چاہتا ہے۔ بے خودی کے رقص ایسے ہی نہیں ہو جاتے۔ یہ دانش صرف محبت ہی واضح کرتی ہے۔ وہ عشق حقیقی ہو یا مجازی جھوم جانے کو دونوں میں ہی جی چاہتا ہے۔

ٹشو سے ہونٹ صاف کر کے افق چند قدم چل کر اس شاپ کی طرف گئی۔ جس طرف فرزام گیا تھا لیکن وہ اسے باہر نکلتا نظر آ گیا۔

"کیوں آ رہی تھیں میرے پیچھے؟" وہ خفا ہوا۔

"میں کب تک اکیلی کھڑی رہتی آخر؟"

"تھوڑی سی دیر تم اکیلی نہیں رہ سکتیں؟"

"نن۔۔۔ نہ۔۔۔" اس نے ساتھ تیزی سے بچوں کی طرح سر ہلایا۔ فرزام کے ہاتھ میں کوئی شاپنگ بیگ نہیں تھا۔ جاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے بیگ بھی اسے ہی پکڑا گیا تھا۔ انگوٹھی پھر یقیناً اس کے کوٹ کی جیب میں ہو گی۔ افق نے نظروں ہی نظروں میں اس کا جائزہ لیا۔ اس نے بازو اس کی کمر میں حائل کیا اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا تمہیں مجھ سے کچھ چاہیے؟" یہ سوال ایسے تھا۔ جیسے کیا ایک اور آئس کریم کھانی ہے۔ وہ اسے انتظار کروانا چاہتا تھا۔ ابھی یہ مرد گھٹنے ٹیکنے میں وقت لے گا۔

"ہاں!" فوراً کہا۔ "جو اندر سے لائے ہو۔"

"کہاں اندر سے؟" اس نے ذرا سی گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو کچھ نہیں لیا۔ دیکھو! میرے ہاتھ خالی ہیں۔" دونوں ہاتھ آگے کیے۔

"کوٹ کی جیب میں ہو گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ اس نے دائیں طرف کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی باہر نکالا۔ پھر بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ خالی ہاتھ آگے کیا۔

"کچھ ہے ہی نہیں۔" مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"اندر والی جیب میں ہو گا۔" کوٹ کا دایاں کونا اٹھا کر اس نے کہا۔

فرزام کا ہاتھ اندر گیا۔ "اوں۔۔۔ چلو! دیکھتے ہیں۔ کچھ مل ہی نہیں رہا۔" وہ ہنس رہا تھا۔ پھر ہاتھ باہر آ گیا اور وہ مٹھی کی صورت بند تھا۔

"دکھائیے اس میں کچھ۔۔۔ کھولیے اسے۔"

"فرض کرو افق یہ خالی بھی ہو سکتا ہے۔"

"اگر یہ خالی ہوا تو یہاں سب کے درمیان نیچے بیٹھ کر میں رو دوں گی۔"

"اچھا! پھر ذرا آنکھیں بند کرو۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بھیڑ میں سے نکل کر ایک طرف کونے میں لے گیا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ذرا دور ایک بنچ پر ایک درمیانی عمر کا جوڑا بیٹھا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ دونوں کا انداز اور مسکراہٹ ایسی تھی کہ وہ افق اور فرزام کی طرف ایسے ہی دیکھنے لگے۔ افق نے آنکھیں بند کر لیں اور بند کی ہی تھیں کہ تڑپ کر کھول دیں اور بجلی کی سی تیزی سے پیچھے پلٹی۔ جبکہ فرزام تو سامنے کھڑا تھا۔ مٹھی اس نے کھول لی تھی انگوٹھے اور شہادت کی انگلیوں میں انگوٹھی پکڑ لی تھی لیکن "افق" کی آواز سے وہ پیچھے دیکھنے لگی۔

اس کی بدقسمتی اس کی فاش غلطی پیچھے کھڑی تھی۔

"تم آئی کیوں نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ "شام پانچ بجے کا وقت دے رکھا تھا۔ اب دس بجے رہے ہیں۔"

مگر انگوٹھی کو مٹھی میں ہی بھینچ کر فرزام دو قدم آگے ہوا۔ افق کے برابر آ کر کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نظر افق کو دیکھا۔ وہ اس وقت چکرا کر گرنے کے قریب تھی۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ "تمہیں میں بعد میں پوچھتا ہوں۔ یہ کون ہیں؟ ان سے تعارف کرواؤ۔ تمہارے کزن ہی ہوں گے۔ میں اپنا تعارف خود ہی کروا دیتا ہوں۔ آئی ایم ڈاکٹر عدن غلام علی۔ آپ کہہ سکتے ہیں افق کا لائف۔"

ہاتھ اس نے آگے کیا۔ جسے تھاما نہیں گیا۔ فرزام افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ افق عدن کے آس پاس پھیلے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔ جو اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افق گونگی بن گئی اور فرزام بہرا ہونے کے قریب تھا۔

"افق کا لائف" فقرے کی بازگشت بہت جان لیوا تھی اور یہ بازگشت تھم ہی نہیں رہی تھی۔ کینیڈا میں ترتیب دیے گئے سارے جملے اس بازگشت کے بھنور میں جا پھنسے۔

"ایک ہفتہ پہلے مجھے یہ ملی تھیں۔ آج کے دن کا وعدہ کیا تھا دوبارہ ملنے کا۔ یہیں قریب میں ہی ایک ہوٹل ہے۔ میں کافی دیر سے وہاں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں تو یہ آئیں نہیں یہاں نظر آ گئیں۔ میرے رہا ہونے کو سیلیبریٹ کرنا تھا۔ سب افق کی وجہ سے ہی ہوا۔ ورنہ میں ابھی تک جیل میں ہی ہوتا۔"

افق نے فرزام کا بازو کھینچا۔ "چلیے! گھر چلتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے افق؟" فرزام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو سن رہا تھا اس کے بعد لگتا تھا کہ اگلا کچھ سنائی نہیں دے گا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" افق بمشکل کہہ سکی۔

سامنے کھڑا عدن مسکرایا۔ "یہ کریڈٹ لیتا ہی نہیں چاہتی۔ میں نے ٹیبل صرف دو لوگوں کے لیے ہی بک کروائی ہے۔ ورنہ میں آپ کو بھی ضرور انوائٹ کرتا۔ آپ سمجھ ہی سکتے ہوں گے۔" وہ فرزام کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ آخر میں گھٹیا انداز سے آنکھ ماری۔

شریف بیویوں کے شریف شوہر سر راہ ایسے الفاظ اور ایسے گھٹیا انداز پر گریبان پکڑ لیا کرتے ہیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" پھر سے یہی سوال سختی سے کیا گیا۔

"چلیے گھر پلیز۔" افق اس کا کوٹ کھینچ رہی تھی۔ "یہ مجھے بلاوجہ تنگ کر رہا ہے۔"

"میں تنگ کر رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "تم ایسے کیوں بات کر رہی ہو؟ ابھی چند دن پہلے تو تم مجھ سے ملی

تھیں۔ ملی تھیں کہ نہیں؟ تب تو تم ٹھیک تھیں۔ اب ایسے بات کر رہی ہو۔ اپنے کزن سے ڈر رہی ہو؟ انھیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟

افق نے فرزام کے بازو پر دباؤ ڈالا اور آگے چلنے لگی۔

"تمہارا یہ رویہ مجھے حیران کر رہا ہے افق!" ساتھ ساتھ چلتے وہ بلند' حیران آواز میں بولا "تم نے مجھے جیل سے ضمانت پر آزاد کروایا ہے۔ مجھے اپنا شکریہ تو ادا کرنے دو۔"

وائٹ گولڈ کی انگوٹھی فرزام کی مٹھی میں ہی خرمندہ ہو گئی۔ اس کا بازو گھسیٹتی تیز تیز چلتی افق اسی انگوٹھی میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ فرزام نے اپنا بازو افق کے ہاتھ سے آزاد کروایا۔

"تم نے اسے جیل سے آزاد کروایا؟" خود رک کر اور اسے بھی روک کر وہ پوچھ رہا تھا۔ عدن دو قدم دور کھڑا تھا۔ افق نے فرزام کی طرف التجا سے دیکھا کہ یہاں سرراہ اس گناہ کے سامنے' جو دو قدم ہی پیچھے کھڑا ہے' یہ سب نہ پوچھے۔ اس پر شک ضرور کرے لیکن اس پر یقین بھی رکھے۔

اپنے پیچھے کھڑے شخص سے اسے نفرت تھی۔ اپنے سامنے کھڑے شخص میں اس کی جان تھی اور ان دونوں کے درمیان کھڑی وہ ڈوب مرنے کے قریب تھی۔ اس کی خوشی ملیامیٹ ہو گئی۔ اس بار سرراہ اس کی عزت پر غلام علی نے نہیں' عدن غلام علی نے ہاتھ ڈالا تھا۔

کیا وہ یہ کہتی' ہاں کیا۔ یا کہتی نہیں۔۔۔ دونوں ہی سچ تھے اور دونوں ہی جھوٹ تھے۔ اس سوال کا سیدھا جواب کوئی نہیں تھا۔ اس سوال کے سب الٹے اور الجھے ہوئے جواب تھے۔ جواب دینے میں یہ معمولی سا تامل فرزام کو بہت سے جواب ایسے ہی دے گیا۔ ایک دم ہی وہ افق سے بہت دور جا کھڑا ہوا۔۔۔ بہت دور۔

"تم اپنا وعدہ پورا کرو۔" وہ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑوا لیے اور تیزی سے چلنے لگا۔

"فرزام!" اس نے بلند آواز میں چیخ ہی ماری تھی۔

وہ رکا نہیں۔ وہ بھی تیز تیز چلتی اس کے پیچھے گئی "میری بات سنیے! میں سب بتا دیتی ہوں۔ ایسے نہ کریں۔"

"بتانا ہو تا تو تم چھپاتیں کیوں؟"

اسی کی طرح تیز آواز میں اپنی آواز کی نمی چھپا کر بھاگنے کے قریب تیز ہو گیا۔ اگر وہ رکا تو وہ واقعی بیچ سڑک پر سب کے درمیان زمین پر پھسل کر اونچی آواز سے رونے لگے گا اور اس بار وہ بہت روئے گا۔

افق "فرزام' فرزام!" ہی کرتی رہ گئی۔ وہ ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ افق ہانپنے لگی۔ کوٹ کا کالر آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

فرزام کے لیے کیا گیا میک اپ بہہ رہا تھا۔ وہ پھر سے گھٹنوں میں سر دے کر رونے کے لیے تیار تھی اور وہ اونچی آواز سے رونے لگی۔ عدن اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

"چلیں افق!"

ساری نفرت اور پوری قوت سے اس نے پلٹ کر زوردار تھپڑ اس کے دائیں گال پر لگایا۔ اس بددعا پر جو نہ جانے اسے کون دے گیا تھا۔ وہ وقت ہی ہو گا۔

☼ ☼ ☼

چند قانون دانوں کے بیانات اور سینیٹرز کے شور مچانے پر اتنا ضرور ہوا کہ ایسے کیسوں کی سماعت میں تیزی آ گئی۔ ویسے بھی وہ سالوں سے بند تھے۔ انہیں اب سزا سنائی جانی تھی یا رہا کر دیا جانا تھا۔ عدن اور اس جیسے چند اور لوگ باہر رہ کر کیس لڑ سکتے تھے۔ لیکن وہ امریکا سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ کیس کی سماعت میں تیزی آتے ہی عزیز نے جان لگا دی تھی۔ وہ ایک بے حد محنتی اور ایمان دار انسان تھا اور حقیقتاً "عدن کے لیے پریشان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لانچ میں اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا جائے۔

اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کا مقدمہ بھی ختم ہو ہی جائے گا۔ فی الحال یہی بہت تھا کہ وہ باہر آ چکا تھا۔

عدن نے عزیز کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اسے افق کے بارے میں بتائے۔ لیکن عزیز نے صاف لاعلمی ظاہر کر دی کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتا۔ عدن کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

عزیز نے اس کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ پاکستان میں وہ سب سے بات کر چکا تھا۔ اب اسے صرف بات کرنے کے لیے افق چاہیے تھی۔ وہ اس ہیومن رائٹس کے ادارے کے دفتر آ گیا۔ جس کا نمائندہ اسے سیل میں آ کر ملا تھا۔ بظاہر وہ ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تھا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ معلومات لے گیا کہ ان کے پاس عدن کا کیس لے کر کون آیا تھا۔ اسے مسٹر جین کے اور ان کی این جی او کے بارے میں بتایا گیا۔ افق کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ مسٹر جین کی این جی او کی ویب سائٹ پر اسے چند ماہ پہلے ہوئے فنڈز ریزنگ ایونٹ کی بہت ساری تصاویر ملیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ افق نے ان کی این جی او کے لیے کام کیا ہے ان کے لیے فنڈز اکٹھے کیے ہیں۔ مختلف ویب پیجز کا جائزہ لیتے اس کی نظر اس پیج پر بھی پڑی۔ جس میں فنڈز ریزنگ میں اچھے اسکور لینے والوں کے نام اور ان کے جمع کیے گئے فنڈز کی نشاندہی کی گئی تھی۔ بہت سے ناموں میں ایک نام افق کا بھی تھا۔ ایک طرف اس کی جیولری کی برانڈ "چیز" کا نام درج تھا۔ بریکٹ میں ملک اور شہر کا نام درج تھا۔

عدن نے سرچ انجن میں چیز کی ویب سائٹ نکال لی اور جہاں جہاں برانڈ چیز مل سکتی تھی' وہ پتے بھی ان میں سے ایک بابوسٹن کے ایک اسٹور کا تھا' جہاں سے اس برانڈ کو خریدا جا سکتا تھا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔ اب وہ افق کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ایک بار اسٹور جا کر اس نے تصدیق کر لی تھی کہ وہی افق ہے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ دو یا تین دن بعد وہاں کا چکر لگاتی ہے۔ رابطہ نمبر کے طور پر اسے پاکستان میں موجود آفس کا کارڈ ہی دیا جا رہا تھا۔

وہ مسلسل دو دن وہاں جاتا رہا۔ وہ قریبی ریسٹورنٹ میں بیٹھ جاتا۔ جہاں سے وہ اسٹور پر نظر رکھ سکتا تھا۔ سارا دن ایسے ہی بیٹھا رہتا۔ سالوں بعد وہ اسے دیکھنے جا رہا تھا' اس سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اس کی زندگی بچائی۔ اسے باہر نکالا۔ اس پر اس کی زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا۔ عین مرنے کے وقت اسے زندگی کی نوید دی۔ اس کا اسپتال ضبط کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹری کا لائسنس منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی صحت' اس کا مردانہ حسن و وجاہت سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ رشتے اور رتبے کے نام پر اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ شروع کے صرف دو ڈھائی سالوں میں ہی اس کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ ماریہ جس طرح اسے چھوڑ گئی۔ اس نے اپنا سر دیواروں پر مارا۔

وہ اسے چھوڑ جاتی لیکن اس کی تھوڑی مدد تو کر دیتی۔ وہ امریکن تھی۔ وہاں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ الٹا اس نے طلاق لے لی اور اس کا سسر' جس کی گندی بیٹی کی وہ چوکیداری کرتا رہا تھا۔ ایک بار آ کر اس سے ملا تک نہیں۔ وہ دونوں ان دونوں کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ انھیں بدذات سمجھتا تھا۔ وہ عدن کے لیے ایسے بے غیرت تھے۔ جن میں نام کی بھی غیرت نہیں تھی۔ نائٹ کلب میں ڈانس کرنے والی ڈانسر بھی اس کے نزدیک ماریہ سے زیادہ شریف اور قابل عزت تھی۔

اسے احساس ہوا کہ وہ دراصل اپنے پیمانے سے گر گیا تھا۔ اس کا پیمانہ صرف افق تھی۔ جہاں اس نے کالج کی بہت سی جان چھڑکنے والی امیرزادیوں کو لفٹ نہیں کروائی تھی۔ وہاں اس نے یہ لفٹ صرف افق کو کروائی تھی۔ اس نے فاش غلطی کی جو وہ بھٹک گیا۔ جبکہ اس نے سوچ ہی لیا تھا کہ اسے صرف افق سے ہی شادی کرنی ہے۔ وہ اچھے خاصے مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں نوکری کر سکتا تھا۔ اپنا کلینک بنا سکتا تھا۔ بے حد آسائش نہ سہی' آرام دہ زندگی ضرور گزرتی۔ لیکن یہ آرام دہ زندگی اسے امریکی چند فٹی سیل میں بیٹھ کر دکھائی دی۔ جب وہ یہاں نہیں تھا تو اسے ڈبل اسٹوری اسپتال بنا بنایا بوسٹن میں نظر آ رہا تھا۔ آغا کے

اسٹورز کی چین نظر آرہی تھی۔ غلام علی غلام کو آغا کے ذاتی طیارے کے مالک ہونے کا غرور توڑتا تھا انہیں اس شخص آغا سے شدید نفرت تھی۔ اس شخص نے ہمیشہ انہیں ہر میدان میں پیچھے چھوڑا تھا۔ کمینہ، عیاش، الو، بے غیرت۔ وہ اسے بہت سے ناموں سے یاد کرتے۔ لاس ویگاس میں وہ جاجا کر کیا کرتا ہے۔ ایک دن غلام علی نے بہت رازداری سے ازبک بیوی کے کان بھرنے چاہے وہ پہلے تو اپنے شوہر کی طرح سنتی رہی۔

"وہ ایک ماہر جواری ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ باقی کی معلومات مجھے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہیں۔" مطلب آئندہ اپنی بکواس بند ہی رکھنا۔

تب اسے ماریہ جنت نظیر نظر آئی تھی۔ جو حور بھی تھی اور ایک دنیاوی جنت کی مالک بھی۔ تب کیوں سب ٹھیک لگتا تھا؟ اب سب کیوں برا لگ رہا ہے؟ عدن یہ بات نہیں جان سکا۔ وہاں وہ دن رات ایک ہی کام کرتا۔ "وہ افق کو یاد کرتا" ان دنوں اس پر افق کی محبت کا بھوت بری طرح سے طاری ہوگیا۔ اسے اس کے نام کے دورے پڑتے۔

وہ یہی تانے بانے بنتا رہتا کہ اگر وہ آج یہاں نہ ہوتا تو ایک گھر میں افق کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔ اس کے بچے ہوتے۔ بے حد محبت کرنے والی بیوی ہوتی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ زندگی میں ان دو چیزوں کے علاوہ کسی تیسری کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ "سکون اور محبت"

اسے یاد آتا تھا کہ وہ اس سے کتنی بے لوث محبت کرتی تھی۔ ایسی محبت جو کچھ مانگتی نہیں، پر دے سب دیتی ہے۔

"اتنی اچھی پلاننگ میں یہ سب کیسے ہوگیا۔" وہ بے بسی سے بل کھاتا۔ جب سب افق کے ساتھ سارے منصوبے بنا چکا تھا تو وہ سب کیوں نہ مضبوط رہا۔

اتنے سالوں میں غلام علی نے پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ آسٹریلیا میں پڑھنے والا اس کا چھوٹا بھائی حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی تباہ ہو چکی تھی۔ غلام علی کے پیسے کے کنوئیں خالی ہو رہے تھے۔

ان گزرے سالوں میں ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ فیکٹریاں نقصان میں ہی جارہی تھیں۔ قرضوں کی قسطوں کی ادائی نہ ہو سکی۔ سود در سود بڑھ گیا۔ یہ کھیل غلام علی کے ہاتھوں سے نکل گیا اور دونوں فیکٹریاں بینک نے ضبط کرلیں۔ جس فیکٹری میں آگ لگی تھی اس سمیت بینک نے فیکٹریاں نیلام کردیں۔ غلام علی کے پاس ایک چھوٹی تین کینال کی فیکٹری ہی بچی تھی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے وہ مرسیڈیز چلاتے چلاتے سائیکل پر آگئے ہوں۔ لاہور ڈی ایچ اے کا بنگلہ بھی بک چکا تھا۔ سیالکوٹ کا گھر ہی بچا تھا۔ فارم ہاؤس پر بھی مزید قرضہ لے لیا گیا تھا۔

غلام علی چاہتے تھے کہ بس وہ جلد سے جلد واپس آجائے۔ اب بھی وہ اسے ایک چھوٹا سا اسپتال تو بنا کر دے ہی سکتے تھے نا۔ اسپتال کے کاروبار میں اتنا منافع ہے کہ دنوں میں ہی ان کا نقصان پورا ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ تو امریکن ڈاکٹر بھی ہے۔ کہنے میں کیا جاتا ہے کہ اتنے سال اس نے امریکا میں پریکٹس کی ہے۔ امریکیوں کا علاج کرتا رہا ہے۔ پاکستان میں انہوں نے اس کے جیل جانے کی خبر کو سب سے چھپا کر رکھا تھا۔ وہ فیکٹری بیچ کر اسے ایک بڑا اسپتال بنا دیں گے اور نہیں تو چھوٹے چھوٹے دو تین ہی بنالیں گے۔ غلام علی نے بہت اعلا منصوبے بنا رکھے تھے۔

"حالات یہی رہے تو ہم فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔" بارہ کینال کے گھر میں رہنے والے غلام علی کو فٹ پاتھ کے نام سے ہی نفرت تھی۔ جبکہ یہی فٹ پاتھ کا ہے رکا سے انہیں خواب میں دکھائی دیتا تھا۔

"تم بھاگ نہیں سکتے وہاں سے؟ کوئی ایجنٹ ڈھونڈو عدن! کوئی تمہیں کینیڈا کے راستے یا برازیل کے راستے نکال سکے۔ میں یہاں بھی ایسا ایجنٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔ سنا ہے یہ سیاہ فام بہت طاق ہیں ان کاموں میں۔ بہت سوں کو امریکا لے آتے ہیں غیر قانونی۔"

اس نے سنتے ہی صاف صاف انکار کردیا۔ "میں پھنس جاؤں گا اگر ایسے بھاگتے پکڑا گیا تو ان کا یہ یقین میں بدل جائے گا۔ وہ مجھے دہشت گرد ہی سمجھ لیں گے۔ میں مرجاؤں گا یہیں مقدمہ بھگتے بھگتے لیکن دوبارہ جیل نہیں جاؤں گا۔"

"مرد بنو عدن۔ زندگی میں خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔"

"میں سوئی چبھنے جتنا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتا۔" صاف انکار۔

"کتنے ڈرپوک ہو تم۔" انہیں غصہ آگیا۔

"میں جیل میں رہا ہوں۔ پولیس والوں کی شکل دیکھتے ہی جان نکل جاتی ہے۔"

"امریکا کا پانی پی کر تم بزدل بن گئے ہو۔" وہ اسے اکسا رہے تھے۔

"امریکا نہیں جیل کا پانی پی کر۔"

"مرد ہی جیلوں میں جاتے ہیں۔"

"پھر وہی مرد کسی اور قابل نہیں رہتے پاپا۔"

انہوں نے فون ہی بند کردیا۔ ایک طرف اس کے کہنے کی خوشی، دوسری طرف اس کی بزدلی پر افسوس۔ اس کی ہائی فائی فیشن ایبل ماں ڈپریشن کی مریضہ بن چکی تھی۔ وہ روتی پہلے تھی۔ بات بعد میں کرتی تھی۔ اس کی بہن نے یونیورسٹی کے ایک لوئر مڈل کلاس لڑکے سے خود ہی شادی کرلی تھی اور آج کل وہ دبئی میں تھی۔ غلام علی کو ایک عرصہ منانے کے بعد اس نے اس لڑکے سے خود ہی نکاح کرلیا۔ اس کے باپ کے پاس دولت کے علاوہ کوئی دلیل نہیں تھی دی جانے کے لیے اور اس کے پاس دولت کے علاوہ ہر دلیل تھی اس لڑکے کے حق میں دی جانے کے لیے۔ اسے اپنی بہن کے بارے میں معلوم ہوا تو اسے خود پر افسوس ہوا۔ کاش! وہ بھی اپنی بہن کی طرح کا ہی ہوتا۔

عدالت کے تیسرے روز رات کے وقت اپنے فلیٹ میں اندھیرا کیے وہ آخری بازی ہارا شخص بنا بیٹھا تھا۔ سود و زیاں کا حساب وہ جیل میں ہی لگا چکا تھا۔ ماریہ سے لے کر اپنی ڈاکٹری تک۔ غلام علی سے آغا تک۔ اس نے ہر چیز کی گنتی کرلی تھی۔ اسے سب مایا اور کھوکھلا نظر آیا۔ سب بے کار۔ اسے بہت احساس ہوا کہ زندگی کی اصل کامیابی اصل اور کھرے انسانوں کا حاصل کرنا ہے۔ انسانی تعلقات میں اول آنا ضروری ہے۔ جذبوں اور سچائی میں اول۔ وہ جان گیا کہ برے وقت میں انسان کو صرف ایک ہی چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ "اپنے انسان کی"

قید کے عرصے میں وہ ایسی کان میں دبا رہا جہاں اسے کوئلوں اور ہیروں کی پہچان ملی۔ تاعمر اس نے کوئلوں سے ہی خود ہی کو سیاہ کیا تھا۔ ہیرے کو تو اس نے ٹھوکر مارنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ افق کو۔ طہٰ کو۔ اس کی بہن فضا کو۔ اپنے اسکول دوست طہٰ کی بہن فضا کو اپنے پیچھے پاگل کردیا۔ آج وہی طہٰ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے کا ہیڈ تھا۔ اس کی بہن جس نے عدن کے لیے نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ ریڈ کراس کے لیے کام کرتی تھی اور وہ چار دوست جو اس کے ساتھ ڈی ایچ اے کے بنگلے میں رہے تھے۔ وہی اینگل گروپ کے ممبرز۔ آج بڑے بڑے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ایک تو امریکا میں ہی ہارٹ سرجن تھا۔ غلام علی نے تعاون کے لیے جب رابطہ کیا تو اس نے صاف انکار کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور آئندہ سے ان کا فون سننا ہی بند کردیا۔

تو ایسی صورت حال میں۔ اس سب حساب کتاب میں اس کے پاس افق ہی بچی تھی۔ این جی او کے نمائندے سے اس کے بارے میں جان کر پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ نیلے گنبد میں رہنے والی بمشکل ایف اے پاس لڑکی نے اتنی بڑی این جی او کو حرکت دے دی ہے۔ اس نے بار بار نمائندے سے پوچھا کہ "کیا وہ ایک پاکستانی مسلم لڑکی افق کی بات کررہا ہے۔" تو اس نے بتایا کہ "ہاں ایسی لڑکی ان کے دفتر میں آئی تھی اور اس کے بارے میں بتا کر گئی تھی۔"

اس رات عدن نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کیسے اتنی کامیاب ہوگئی۔ اس نے صرف اتنا سوچا کہ اس کے لیے افق اتنی فعال ہوگئی۔

باہر نکلتے ہی وہ اب اس سے شادی کرلے گا۔ اس نے اور افق نے بہت انتظار کرلیا۔ بس۔۔۔ اسے اس کی میٹھی آواز اور بھولی صورت یاد آگئی۔۔۔ شرافت سے جھکا اس کا سر اور محبت سے بھرا اس کا دل۔۔۔ اب یہ دل کسی اور کا نہیں۔

☼ ☼ ☼

کالج سے سیدھا وہ اسٹور آگئی تھی۔

"کوئی آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" اسٹور کے ورکر نے اسے بتایا۔

"کون تھا؟"

"نام نہیں بتایا۔۔۔ صرف پوچھ رہے تھے۔"

"آرڈر دینا تھا؟"

"میں نے آرڈر کا پوچھا تو مسکرانے لگے۔ پوچھ رہے تھے کہ آپ کب کب آتی ہیں۔ میں نے کارڈ دے دیا تھا آپ کے ہیڈ آفس کا۔" کچھ ہی دیر میں وہ اسٹور سے باہر آگئی۔ جب پیچھے سے کسی نے آکر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔

"فرزام۔۔۔" ایسا صرف وہی کرسکتا تھا۔

"یہ فرزام کون ہے؟" ہاتھوں کو فوراً ہٹالیا گیا۔ آواز پر وہ ڈیسے پلٹی، جیسے سانپ نے کاٹ مار لیا ہو۔ جس پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔۔ شان دار عمارت کا بدنما کھنڈر بنا عدن تھا۔ اس کی سرخ و سفید دودھیا رنگت، لمبے عرصے سے گردوں کے عارضے میں مبتلا مریض سی بدرنگی اور گدمیلی ہوچکی تھی۔ تھوڑا بہت جو گوشت جسم پر بچا تھا، وہ ڈھلتی عمر کے بیماری زدہ مرد کی جھریوں بھری کھال جیسا تھا۔

اپنے وقت کا شاہکار عدن عرف امان، کھنڈرات بنا کھڑا تھا۔

"یہ فرزام کون ہے افق؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔ کون تھا، جو اس طرح اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتا تھا اور کون تھا، جس کے ہاتھ رکھنے پر افق کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ صبح سے اس کا یہاں آکر انتظار کررہا تھا۔ ریسٹورنٹ اسٹور کے سامنے تھا۔ لیکن سڑک پار کرکے۔ کئی بار وہ اسٹور کے قریب بھی چلا گیا تھا۔ ریسٹورنٹ اوپن تھا اور دن کے شروع میں وہاں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اس کی نظر ایک طرف اٹھی اسے گمان ہوا کہ یہ افق ہی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا کہ کیا یہ افق ہوسکتی ہے۔ وہ کپ آئس کریم کھارہی تھی۔ نیلے رنگ کی پنسل جینز پر اس نے مشرقی طرز کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ ہلکے خاکی کرتے پر اس نے گہرے سرخ رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے اور بالوں میں سرخ ہی ہیر بینڈ لگا ہوا تھا۔ دونوں کانوں میں ایئرفون فکس تھے اور کپ سے چمچ سے آئس کریم نکال نکال کر کھاتے ہوئے وہ ہنس رہی تھی۔ وہ یقیناً کسی سے فون پر بات کررہی تھی۔

"میں تمہارے آس پاس ہی ہوں۔" فرزام کہہ رہا تھا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے آس پاس دیکھا۔

"گردن گھماؤ مت نا۔۔۔ اسے ذرا سا جھکالو۔"

وہ ہنسی۔۔۔ وہ سمجھ گئی۔۔۔ اس کے پاس چند منٹ ہی تھے بات کرنے کے لیے۔ عدن کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ یقین کرے کہ سرخ اسکارف میں جو لڑکی شرارتی چال چلتی جارہی ہے، وہ افق ہی ہے۔

اتنے سالوں میں کیا اس نے صرف یہی ایک کام کیا کہ وہ لوڑ سے اور خوب صورت ہوگئی۔ اس بار اس نے اپنے ساتھ کیا کیا۔۔۔ کیا کہ وہ اتنی خوب صورت ہوگئی، اتنی پراعتماد۔ بوسٹن کی سڑک پر وہ ایسے چل رہی ہے۔ جیسے بوسٹن میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ چادر کا کونا منہ میں دبا کر۔۔۔ سر کو جھکا کر پیدل چلنے والی۔۔۔ ہر لوا پر گھبرانے والی۔۔۔ ڈر جانے والی، کس ادا سے ہنس رہی ہے۔ اسے دیکھ کر لگ رہا ہے کہ اسے کوئی فکر، کوئی غم نہیں ہے۔ عدن کا تصور ذرا الٹ تھا۔ اس میں ایک تصور خاص غالب تھا کہ وہ اداس آنکھیں لیے ہر طرح سے بہت اداس ہوگی۔ اپنے امان سے دور۔۔۔ اس کی جدائی میں گھلتی، اس کے پیار کے لیے تڑپتی، افق عبدالقدوس۔

پیدل چل کر اسٹور کے پاس ہی آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ افق نے نفرت سے اسے دیکھا۔ عدن اس نظر پر حیران رہ گیا۔

"تم ہو آر یو؟" اس سوال پر بھی حیران رہ گیا۔

"میں کون ہوں؟" اس نے ہنسنے کی صرف کوشش ہی کی۔

"تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی؟" اگلا سوال پہلے سے بھی برا تھا۔ انداز اس سے بھی بدتر تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنے بیگ میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ موبائل ہاتھ میں نکال کر پکڑا۔

عدن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ "تم پولیس کو فون کررہی ہو؟" اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب افق کررہی ہے۔

"آئی۔۔۔ ایم سوری افق۔۔۔ ایسے تو نہ کرو۔" فون کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے ہی افق نے اسے دیکھا۔

"تم نے مجھے ہاتھ کیوں لگایا؟" کہنا تو وہ یہ چاہتی تھی کہ تم آپ بیٹے نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔

"میں پھر سے سوری کہتا ہوں۔۔۔ لیکن تم میرے ساتھ ایسا کیوں کررہی ہو؟" اس کے انداز اور کڑے تیوروں پر وہ بری طرح سے الجھ گیا۔ ساتھ ہی اس کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔ افق کو ترس آگیا۔

"کیا چاہتے ہو ڈاکٹر عدن۔۔۔ کیوں آئے ہو یہاں؟"

"تمہیں شکریہ کہنے آیا تھا۔" فی الحال وہ یہ کہہ ہی نہیں سکا کہ تم سے فوری شادی کرنے کے لیے آیا ہوں، جو افق اب اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ چادر کا کونا منہ میں دبا کر بیٹھی افق نہیں تھی۔

"کیوں؟" افق نے حیران ہونے کی کمال اداکاری کی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم ہی مجھے آزاد کرواؤ گی؟"

"میں نے؟ میں نے کیا کیا؟ تم جیل میں تھے کیا؟"

عدن اس پر الجھ گیا۔ "تم تی بڑی این جی او کا نمائندہ تم ہی نے تو بھیجا تھا میرے پاس۔۔۔ مارش نام تھا اس کا۔"

"میں نے تمہارے پاس کوئی نمائندہ نہیں بھیجا تھا۔"

"اس نے خود مجھے تمہارا نام بتایا تھا۔"

"تو تم بھی جیل میں تھے؟ وہ تمہارے پاس بھی چلا گیا؟" عدن اور الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"این جی او جن لوگوں کے لیے کام کررہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں تم بھی ہو۔۔۔ ہم نے عرب۔۔۔ بنگلہ دیش اور چند دوسرے ملک کے لوگوں کے لیے تھوڑا سا کام کیا تھا اور بس۔۔۔" افق نے کندھے اچکائے۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" عدن کو یقین ہی نہیں آیا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو، مجھے اس سے مطلب نہیں ہے۔"

"تم ایسے کیوں کررہی ہو افق؟" وہ پھر سے رو دینے کے قریب ہوگیا۔

"کیسے؟"

"تم اجنبی کیوں بن رہی ہو۔۔۔ اتنے سالوں بعد ملی ہو۔ کوئی حال احوال پوچھو۔ کوئی بات کرو۔ میں پاگل ہورہا تھا تم سے ملنے اور تمہیں دیکھنے کے لیے۔"

"تم نے کہا، تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا تھا۔ جب کچھ کیا ہی نہیں تو کیسا شکریہ۔" افق نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔ صاف جھوٹ۔۔۔ تم تو جھوٹ بولتی ہی نہیں افق! اب کیوں؟ میں جانتا ہوں، تم ناراض ہو مجھ سے۔"

اس سب پر افق کا جی چاہا کہ وہ دھکا دے کر اسے سڑک پر گرا دے۔ اب یہ شخص اس سے اور کیا چاہتا ہے۔ اس کی سب خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی چھوڑ گیا تو اب اور کیا چاہتا ہے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھوں اس کی مدد ہوگئی تھی۔ اس مدد کو اس نے انسانیت کے خانے میں لکھ دیا تھا۔ عدن کے خانے میں نہیں۔

"تم نے اپنی محبت کا حق ادا کردیا۔" عدن کی آنکھی

بات افق کو جاننے کی طرح لگی۔
"کون سی محبت؟" افق کا سر گھوم گیا۔ اب ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ شاید بہت غلط ہونے جا رہا ہے۔
"تمہاری محبت۔" اس نے بڑے دھڑلے اور جوش سے کہا۔
"ڈاکٹر عدن۔ زبان سنبھال کر۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "میری محبت میرا شوہر ہے اور بس۔ اس چکر کو جس میں مجھے پھنسایا تھا' اسے محبت کا نام مت دو۔"
قید سے پہلے "تم دہشت گرد ہو۔" اس پر آسمانی بجلی بن کر گرا تھا۔ رہائی کے بعد "میری محبت میرا شوہر" وہی بجلی بن کر اس پر گرا۔ حیرانی' صدمہ' خوف' لاچاری' بے بسی' دکھ' سب آگے پیچھے اس پر وارد ہوئے۔ جب اسے مارش نے افق کے بارے میں بتایا تو وہ یہی سمجھا کہ قسمت افق پر مہربان ہو گئی ہے اور اس نے کسی نہ کسی طرح اتنی ترقی کر لی ہے کہ وہ امریکا تک آپہنچی ہے۔
"تم نے شادی بھی کر لی افق؟" یہ بازی بھی ہاتھ سے گئی۔ عدن کا یہ سوال ایسے تھا کہ تم نے تو مجھے موت کی ہی سزا سنا دی۔ اس کا گدمیلا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ دو آنسو آنکھوں سے نکلے۔
ایک بار پھر سے افق کو اس پر ترس آیا۔
"کیوں نہ کرتی؟" اس نے بہت اعتماد سے پوچھا۔ عدن کو تو شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کا گریبان نہیں پکڑ رہی۔ کوئی سوال نہیں کر رہی۔ اس نے بمشکل سر کو ہلایا۔
"ہاں کرنی چاہیے تھی۔" اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر وہ مخالف سمت میں چلنے لگا۔
"دوبارہ کبھی میرے راستے میں مت آنا۔" افق کی آواز اس کے پیچھے آئی۔ اس نے تائید میں سر کو ہولے سے ہلا دیا۔ اب وہ ایک ایسے انسان کی طرح سڑک پر چل رہا تھا' جو نہ کسی میدان کا کھلاڑی تھا' نہ ہی تماشائی۔ دنیا کے سب ہی کھیل تماشے اس کے لیے ختم ہو گئے۔ بے نام قدم ہی اٹھیں گے اب۔ جو کہیں بھی رک جاتے ہیں اور کسی سمت بھی نہیں جاتے۔

☼ ☼ ☼

ساری رات وہ سڑکوں پر گشت کرتا رہا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر روتا بھی رہا۔ دراصل اب ہی وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ ہوا تھا۔ افق کے اب کبھی نہ ملنے پر اسے اصل دکھ ابھی ہوا۔ وہ اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے۔ اس پر زیادہ ہوا۔ ہاں صرف شوہر۔
اس نے اپنی نم آنکھیں دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے صاف کیں۔ وحشت زدہ پاگل آنکھیں' جو صدمے اور دکھ میں جلد بھی ہو جاتی ہیں اور تیزی سے پھڑپھڑانے بھی لگتی ہیں۔ وہی نفسیاتی دورے کی کیفیت' جو اسے قید کے دوران پڑتے تھے۔
اتنا رو کر' اتنا پچھتا کر بھی عدن روز اسٹور کے قریب چلا جاتا۔ دو' چار' چھ دن' افق وہاں آ ہی نہیں رہی تھی۔ عدن کو ہنسی آئی۔ وہ اس سے ڈر رہی تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ تھوڑی سی دیر کے لیے آئی اور چلی گئی۔ فاصلہ رکھ کر عدن اس کے پیچھے پیچھے اس کے گھر تک جا پہنچا۔ پھر وہ روز اس کے گھر تک جانے لگا۔ وہ اس کے شوہر کے انتظار میں تھا۔ افق اکیلی ہی گھر سے باہر نکلتی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ افق نے اس سے جھوٹ بولا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کیوں بولا ہے۔ یہ پوچھنے کے لیے وہ اس کے ساتھ ساتھ کالج آگیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی افق کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آرہا افق! تم مجھ سے اتنا کترا کیوں رہی ہو؟ میں وہی عدن ہوں' جو تمہاری جان ہے۔"
عدن نے کالج کی طرف جاتی سڑک پر لے جالیا تھا۔ افق نے سختی سے اپنے لب بھینچے اور ایسے ظاہر کیا کہ نہ اسے جانتی ہے' نہ ہی اسے سن رہی ہے اور تیز تیز چلنے لگی۔
"تم اتنا سخت ناراض ہو مجھ سے۔ میں نے تمہیں فون نہیں کیا' اس لیے۔ میں حالات میں پھنس گیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ تم میری بات تو سنو۔ تم اس طرح منہ موڑ کر کیسے میرے بغیر رہ سکتی ہو۔"
افق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ شخص کتنے دھڑلے سے اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔
"کیسے حالات؟" اس نے پوچھا۔
"میں امریکا نوکری کے لیے آیا تھا۔ مجھے اچانک آنا پڑا۔ جہاں اپلائی کیا تھا۔ وہاں سے فوری کال آگئی تھی۔ تیاری کرنے میں' میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں ایک فون نہیں کر سکا۔ سوچا تھا امریکا آکر لوں گا۔"
"وہ اسپتال' تمہارا اپنا نہیں تھا' جہاں تم نوکری کرتے رہے ہو؟"
وہ سمجھ رہا تھا کہ افق کو کچھ نہیں معلوم اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ عزیز سے بھی مل چکی ہے اور آرٹیکل بھی پڑھ چکی ہے۔ وہ اسے وہی افق سمجھ رہا تھا جو فیکٹری جایا کرتی تھی۔ ایف اے میں فیل ہو گئی تھی۔ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔
"وہ کسی آغا عباس حیدر کا تھا۔"
"تو وہ آغا عباس حیدر تمہارے سسر نہیں تھے؟"
اب عدن کا حلق خشک ہو گیا۔
"ان کی بیٹی۔ تمہاری بیوی۔ ماریہ۔ تمہارے بچپن کی محبت۔"
عدن کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی شادی۔ بلکہ ماریہ تک کے بارے میں جانتی ہے۔ وہ اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہے؟
"میں اسے چھوڑ چکا ہوں۔" اسے یہی بات سوجھی۔
"طلاق اس نے لی تھی تم سے۔" افق کی معلومات زیادہ جامع تھیں۔
"تم اس لیے ناراض ہو کہ میں نے ماریہ سے شادی کر لی؟ پاپا نے زبردستی۔"
"میری طرف سے تم دنیا میں موجود ہر ماریہ سے شادی کر لو۔" افق نے تمسخر اڑایا۔
"روز میرے راستے میں ایسے مت آیا کرو۔ میں اپنے شوہر کو بتا دوں گی۔ میرا شوہر روایتی پاکستانی بھی ہے اور امریکا کا لاء تو تم جانتے ہی ہو۔ دونوں اگر مل گئے تو۔"
عدن جس کا شرمندگی سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ افق کے اس دھمکی بھرے انداز سے آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اسے دو' دو پیسے کے کام کرتے دیکھا تھا تم۔ ہمارے ملازم۔ جوتیاں اٹھانے والے۔ گندے برتن دھونے والے۔ آواز بر جی کہنے والے۔ ترقی کر کے کسی بھی آسمان پر جا پہنچیں۔ کسی کے لیے وہ تب بھی ملازم ہی رہتے ہیں۔
"شوہر کو؟" وہ ہنسا۔ "کس شوہر کو جو سرے سے ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ۔ بلاؤ۔"
افق نے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنی بات کر کے بھی بے وقوفی ہی کی تھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ آگے بڑھی اور عدن نے اسے آگے بڑھتے دیکھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روکنا چاہا۔
"میں ہر بار تمہاری یہ جرات معاف نہیں کروں گی۔" وہ حلق کے بل چلائی۔
"تمہیں میری بات سننا ہی ہو گی۔" وہ بھی چلایا۔ "ورنہ میں بار بار تمہارے راستے میں آؤں گا۔ تمہارے گھر آجاؤں گا۔ تمہیں ایک بار مجھے موقع دینا ہی ہو گا۔"
افق اس سے ڈرتی نہیں تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اب ڈر گئی۔ وہ کالج تک اس کے پیچھے آگیا تھا۔ اب بار بار آئے گا۔ گھر بھی آجائے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ایسے پاگل ہو رہا ہے۔
اس کی بات آخری بار سننے کے لیے وہ قریب کی کافی شاپ میں آگئی۔
"تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ گیا تھا۔ بتاؤ! کس کی قسم کھاؤں کہ تمہیں یقین آجائے۔ میں نے تمہارے لیے اپنے خاندان کو' پاپا کو بھی منایا۔ گھر چھوڑنے کی دھمکی دی۔ دو دن ہوٹل میں رہا۔ ماما بیمار ہو گئیں' تو ہو گیا پاپا کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اپنے باپ کے لیے میں اتنا بھی نہ کرتا کہ اس کی مرضی سے شادی کر لیتا؟ کس منہ سے تمہیں فون کرتا؟ سب بتاتا۔

مجھ پر الزام لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ ماریہ نے طلاق لے لی۔ اس سب میں میرا قصور کہاں ہے؟ میں نے تمہیں بہت یاد کیا افق۔ بہت۔ میں نے ہمیشہ صرف تم سے محبت کی۔ تمہارا کتنا احترام کرتا رہا ہوں میں۔ اتنے سال میں تمہارے لیے روتا رہا ہوں اور تم ایسے دور جا رہی ہو۔ مجھ پر کچھ رحم کرو۔ اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے پاپا نے زبردستی میری شادی کروی۔"

افق صرف آخری بار اس کی بات سن رہی تھی۔ تاکہ وہ بار بار اتنی بات کہنے کے لیے اس کے راستے میں نہ آئے۔ اسے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ جھوٹ اور کتنا سچ بول رہا ہے۔

"میں نے سب سن لیا ہے۔ ساری باتیں۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو۔ اور مجھے میری میں رہنے دو۔"

"تمہارے بغیر میں کیسے خوش رہوں؟"

افق نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ "میں اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوں کہ اس نے مجھے فرزام دیا۔"

"مجھے اس کی قسمت پر رشک ہے۔"

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ مت جاؤ۔ تم تو کہتی تھیں کہ تم میرے بغیر رہ نہیں سکتیں؟"

"تب میں بے وقوف تھی۔" اس نے بہت اعتماد سے کہا۔

"تم اب بے وقوف بن رہی ہو اور مجھے بنا رہی ہو۔ تمہارے اندر آج بھی میں ہی ہوں۔ ورنہ تم میری مدد نہ کرتیں۔ تمہاری اماں نے زبردستی تمہاری شادی کروادی اور تم مان گئیں۔"

"تمہارے باپ نے تمہاری زبردستی شادی کی اور تم مان گئے۔" کرنے پر آئی تو کڑے طنز افق کے پاس بھی بہت تھے۔

"میں مجبور تھا افق۔"

"میں مجبور نہیں تھی۔ میں چودہ جماعتیں پڑھی، ایک عاقل و بالغ لڑکی تھی اور پورے ہوش و حواس میں فرزام کو تاعمر کے لیے "ہاں" کی تھی۔ اپنے منہ سے، اس کے عین سامنے ہو کر۔"

"حالات کے پیش نظر "ہاں" کردی ہوگی۔ محبت نہیں۔ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ محبت تم صرف مجھ سے کرتی ہو۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتیں۔" اتنا جانتا تھا وہ افق کو۔ اسی لیے اتنا دور تھا اس سے۔

"ہاں! شاید صرف خالی خولی محبت نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ جذبہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ میں فرزام کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں ڈاکٹر عدن۔ اور کسی کی جان لے بھی سکتی ہوں۔"

اس نے ٹھہر ٹھہر کے عین اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ افق کتنا بڑا سچ بول رہی ہے۔ خالی خولی دعوا نہیں۔

عدن تڑپ اٹھا۔ افق کے منہ سے کسی اور کے لیے یہ سن کر اس کا جی اس شخص کو مار دینے کو چاہا۔

"بکواس بند کرو افق۔" وہ چلایا۔ "جھوٹ مت بولو۔"

افق نے پروا بھی نہ کی اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ پیچھے لپکا۔

"تم نے کہا تھا تم میرے بغیر سانس نہیں لیتیں۔ تمہارا دن رات ہوں میں۔ مجھے سوچ کر تمہیں نیند آتی ہے اور میں تمہارے سب ہی خواب ہوں۔"

افق آگے آگے تھی۔ وہ پیچھے پیچھے تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا۔ وہ اسے پاتال میں گراتا جا رہا تھا۔ وہ اس شخص سے اب اور نفرت کرنے لگی۔

"تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟" پلٹ کر وہ چلائی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آتا جا رہا تھا۔

"فرزام کو چھوڑ دو۔ آؤ! ہم شادی کرلیں افق۔"

افق ہکا بکا رہ گئی۔ کس ہمت اور بے غیرتی سے وہ اسے کہہ رہا تھا یہ سب۔ اسے چھوڑ جانے والا۔ صفائی سے جھوٹ بولنے والا یہ توقع بھی کیسے کر سکتا تھا۔

"تمہارے جیسے دو کوڑی کے انسان کے لیے اسے چھوڑ دوں؟ جس نے ایک امیر باپ کی بیٹی سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا۔ اس شخص کے بیٹے کے ساتھ، جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔"

افق یہ بات کسی کو بھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی عزت کا پردہ تھا۔ اسے وہ چاک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اب عدن کے منہ پر یہ بات مارنی ہی پڑی۔

آخری بات سن کر عدن سناٹے میں رہ گیا۔

"تمہارا کمینہ باپ۔ مونچھوں والا گدھ۔ جب میں اماں کے علاج کے لیے تم سے مدد لینے تمہیں ڈھونڈنے میں وہاں گئی۔ تو اس نے میرے آگے پیچھے پھیلے اور میری عزت پر ہاتھ ڈالا۔ تمہارے باپ نے میرے سامنے تمہیں فون کیا تھا۔ تم اور ماریہ جب ہنی مون پر تھے اور تم چاہتے ہو کہ اب بھی میں تمہارے جیسے انسان کا احترام کروں؟ تم سے بات کروں؟"

"جھوٹ۔ سفید جھوٹ، سراسر الزام۔" وہ الٹا بھڑک گیا۔ اگر حالات دوسرے ہوتے تو وہ گدھ کہنے اور ایسے الزام لگنے پر اس کی گردن دبا دیتا۔

"تم اپنے باپ سے جا کر پوچھو۔ ہاں! میری وجہ سے تم باہر کھڑے ہو اس وقت۔ شاید اللہ میرے ہی ذریعے تمہیں باہر لانا چاہتا تھا۔ جو تم سے مدد لینے کے لیے گئی تھی اسی کے ذریعے۔ جاؤ! جا کر بتاؤ اپنے باپ کو یہ افق ہے جس نے تمہاری مدد کی ہے۔ عزت بچا کر بھاگ جانے والی کے ہاتھ سے مدد کا یہ تھپڑ بہت زوردار ہے۔ یہ تھپڑ تم دونوں کو بہ یک وقت لگا ہے۔ بہت پاگل بنایا تم نے مجھے۔ بہت ذہین نہیں ہوں۔ لیکن تم سے اب ہمیشہ دور ہی رہوں گی۔ اتنی سمجھ دار تو ضرور ہوں۔"

افق چلی گئی۔ عدن بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ماں اور باپ صرف یہ دو ایسے رشتے ہیں کہ کتنے بھی گناہ گار [illegible] کسی تیرے میرے کے منہ سے ان کے گناہ نہیں سن سکتے۔ اپنے باپ کو افق کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ پھر بھی اپنے بیٹے کی پسند کے ساتھ۔ افق کے ساتھ [illegible] تھا۔ اس نے فون کیا۔

"افق کبھی آپ کے پاس آئی تھی کبھی؟"

"کون افق؟" لمحہ بھر کے تامل کے بعد کہا گیا۔

"جس کی عزت پر آپ نے ہاتھ ڈالا تھا۔ جو میرا پوچھنے ڈی ایچ اے والے بنگلے میں آئی تھی۔" آخری حد پر تھا تحمل کی۔

"کیا بکواس ہے یہ؟"

"ہاں نہ میں جواب دیں۔" تن کر کہا۔

"بکواس بند کرو گدھے۔ اپنے باپ پر الزام لگا رہے ہو؟"

"اسی افق نے بوسٹن میں مجھے اس سیل سے آزاد کروایا ہے جہاں زمین پر میں نے ایڑیاں رگڑی ہیں اور دیواروں سے سر ٹکرایا ہے۔ اس۔۔"

"کیا بک رہے ہو؟" فون بند ہو گیا۔ عدن جان گیا۔ افق سچ کہہ گئی ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ لیکن اسی لڑکی کے ساتھ جس کا ذکر وہ ان سے کر چکا تھا اسی کے ساتھ یہ سب کچھ۔ عزیز کے ہاتھوں جب وہ بار بار پیغام بھجواتا تھا کہ افق کے گھر جائیں۔ اسے عدن کے بارے میں بتائیں تو اسے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ وہاں کوئی ایسا گھر نہیں ہے۔ نہ ہی وہاں کوئی افق رہتی ہے۔

وہاں کوئی گیا ہی نہیں تھا۔ اس کا باپ کس منہ سے وہاں جاتا۔ زندگی کے اس حصے میں باپ نام کا بھرم رکھے اس شخص کی عزت بھی اس کے اندر سے گئی۔ تو اب سب کچھ چلا گیا عدن کے پاس سے۔ عدن خالی ہاتھ رہ گیا۔ اس سے اچھا تو وہ امریکی سیل میں ہی تھا۔ سر ہی پھوڑنا ہے تو آزادی میں ہی کیوں۔ پاگلوں کی طرح اس نے ایک ہی سڑک کے دس چکر لگائے۔ پیدل چلتا رہا۔

اب اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ جو بچا تھا اسے چھین لیا گیا۔ اب اسے زندہ رہنا ہے تو صرف اپنی مرضی کے ساتھ۔ اپنے من پسند لوگوں کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

چند دن وہ عزیز کے ساتھ مقدمے کی سماعت میں مصروف رہا۔ چند اخبار والوں نے اس کے تفصیلی

انٹرویو بھی لیے۔ عزیز اسے اپنے ساتھ چند دوسرے اداروں میں لے کر گیا جو مزید اس کی مدد کر سکتے تھے۔ وہ ہفتے سے کچھ زیادہ دن مصروف رہا۔ فارغ ہوتے ہی اس نے افق کی نگرانی شروع کر دی۔ اب وہ گھر سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب بھی نکلتی، فرزام ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ اسے فرزام کے آنے کا انتظار تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک دن افق بہت بن ٹھن کر ایئر پورٹ گئی۔ اسے وہ شخص دیکھنا تھا، جس کے لیے وہ جان لے بھی سکتی ہے تو اس کا خیال تھا کہ پھر یہ "جان" لینا فرزام کی ہی سہی۔ فرزام کی جان لے لینی چاہیے۔

اسی دن شام کو وہ دونوں اکٹھے باہر نکلے۔ وہ ان کے پیچھے ہی تھا۔ بس ایک بار اس نے انہیں ایک سڑک سے گم کر دیا تھا۔ دو گھنٹے وہ انہیں بے خبری میں ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ اسے دوبارہ نظر آئے تو دونوں آمنے سامنے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

فرزام کی جان نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ان دونوں کے پاس چلا گیا تھا۔

تھپڑ مار کر وہ اس کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی۔ "تم نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا؟ اتنا جھوٹ بولا؟ میں نے تمہاری مدد کی۔" وہ ساتھ ساتھ رو رہی تھی۔

"تم نے میری مدد نہیں کی۔ تم ہی نے کہا تھا کہ تم نے میرے باپ کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہے۔ اس تھپڑ کے بارے میں میں نے انہیں بتا دیا ہے۔" خود کو اس کے ہاتھوں سے چھڑوا کر اس نے اطمینان سے کہا۔

"تم نے ایک بار پھر میرے ساتھ برا ہی کیا نا۔ تمہاری مدد کر کے میں خود اپنے ساتھ برا کیا۔"

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا افق! چھوڑ دو اسے۔ تم صرف مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں ہوں تمہارا امان۔"

ایک اور تھپڑ سے اپنا ہاتھ روک کر افق اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔

فرزام کا فون بند جا رہا تھا۔ پہلے جب اس نے کیا تھا تو ایک بیل گئی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھی وہ مسلسل اسے فون کر رہی تھی۔ اب وہ اسے سب سچ بتا دے گی۔ اسے چھپانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ ناراض ہو گا۔ لیکن مان ہی جائے گا۔ بات بگڑ گئی تھی تو سنبھل بھی جائے گی۔

دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تو ہر طرف اسے فرزام کا غصہ بکھرا نظر آیا۔ شاپنگ بیگز ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ جیسے ایک ایک کو اٹھا کر پھینکا گیا ہے۔ سارے جوتے، بیگز، کوٹ، کپڑے، شرٹس، جیولری، ادھر ادھر بکھری پڑی تھی — کل دن کا ٹوٹا ہوا تھا۔

"فرزام!" وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر سر رکھے بیٹھا تھا اور ایسے بیٹھا تھا جیسے کہیں سے بے عزت کر کے نکالا گیا ہو۔ اس نے سر اٹھا کر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

"مجھے وہاں اکیلا چھوڑ آئے۔ مجھے منتے تو سہی۔" راستے بھر وہ روتی آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پھر سے رونے لگی۔

"لیلی تم نے اس کی ٹریٹ؟ کیسا رہا ڈنر؟"

"بکواس کر رہا تھا وہ۔" وہ چلائی۔ "جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے منت کر کر غلطی کی۔ اب نہیں کروں گی۔"

فرزام اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھا۔ جیسے اسے من کا نہیں رہا۔

"پلیز میری بات سنو فرزام — میں نے مان لیا، میں نے غلطی کی۔ میرا یقین کرو۔ میں سب بتا رہی ہوں۔"

"سن آیا ہوں۔ تم نے اس کی مدد کی۔"

"ویسے نہیں — جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"پھر کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے؟" وہ ایسے جرح کر رہا تھا۔ جیسے مقدمے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب تو صرف وہ ایسے ہی سوال کر رہا ہے۔ "تم اسے بھولیں نہیں؟ تم نے اسے ڈھونڈ..."

اس نے صرف نفی میں سر ہی ہلایا۔ اتنے سے ہی سوالوں پر اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بات اتنی بھی آسان نہیں رہ گئی۔ اب اس یقین پر جواب دے دینے پر بھی پہل نہیں ہو گی۔ سر تیزی سے نفی میں ہلاتا رہا۔

"کیا نہیں ہے فرزام —" آواز اور بھیگ گئی۔

"پھر کیا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب؟"

"میں نے میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔" وہ جانتی تھی۔ اس سلسلے میں پوچھا گیا اگلا سوال تھوڑے سے بچے کچھے یقین اور اعتماد کی بھی موت کر دے گا۔

"پھر۔" اس کے لیے پہلی بار فرزام کا انداز سخت تر ہو گیا۔ اس "پھر" کا جواب تو وہ خود نہیں جانتی تھی۔ اس "پھر" کا جواب ہی اسے لے ڈوبے گا۔ یہ "پھر" بہت الجھا ہوا تھا۔

"میں اس کے وکیل کے آفس گئی۔" اس کی آواز اٹک گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ الفاظ سارے غائب ہو گئے۔

"تمہیں اس کے وکیل کا کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے سرچ کیا تھا۔" شرمندہ سے وہ اور شرمندہ ہو گئی۔

"پھر —" "بہت لوگ بہت جان لیوا تھا۔"

"تم آفس کیوں گئیں؟" وہ سوال کر رہا تھا۔ وہ اپنا اور اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"پاگل تھی جو گئی۔ خود نہیں جانتی کیا بتاؤں سمجھا نہیں سکتی تھی۔"

"میں پاگل تھی فرزام! چلی گئی۔ خدا جانتا ہے مجھے کیا ہوا کس وجہ سے گئی۔ وکیل نے میری بہت منت سماجت کی۔ مجھے اکسایا۔ انسانیت کے واسطے دیے۔ مسلمان ہونے کا کہا۔"

"تم نے انسانیت کے ناتے یہ سب کیا؟" وہ بظاہر بہت اطمینان سے یہ سب پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ میرا یقین کرو۔ حالات ایسے — لاکھوں لوگ جیلوں میں بند ہیں۔ پاکستانی، مسلمان،"

انسان بھی۔"

"مجھے معاف کردیں فرزام۔" اس کے پاس فرزام کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ سوال کے نام پر اب اس کے پاس مانگنے کے لیے صرف معافی ہی تھی۔

"تم کس دن آفس گئیں؟"

"جس دن آپ کا میسج آیا تھا کہ گھر سے باہر نہ جانا۔" اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنے بھی سچ بول رہی تھی۔ وہ حیثیت میں دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ ایک سچ جو جج کے سامنے بول کر کسی کو پھانسی سے بچالیتا ہے۔ اگر بروقت نہ بولا جائے تو بعد ازاں بے شک ساری دنیا کے سامنے بلند و بانگ بولا جائے۔ پھر وہ سچ صرف ایک گونج ایک اعلان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

"مجھے معاف کردیں فرزام۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا۔ میرے اور اس۔"

"معاف کیا۔"

اسے درمیان میں ہی ٹوک کر وہ خود اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا۔ دروازہ لاک کرلیا۔ لمحوں میں ہی اس نے اس دن سے اب تک کی ساری فلم آنکھوں میں چلائی۔ اس کے سارے جھوٹ فرزام کے کانوں کو سنائی دے گئے۔ افق لاؤنج میں کھڑی رہ گئی۔ گھٹنے ٹیکنے والا مرد مقفل ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا۔ انگوٹھی نہ جانے کہاں گئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر۔ یا اس گھر کی۔ پہلی بار افق نے اپنی قسمت کو کوسا۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ رونے لگی۔ فرزام کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہی کرتا۔ شاید اسے سر راہ ہی تھپڑ مار دیتا۔ گھر سے نکال دیتا۔

عدن نامی وبا اسے ہمیشہ ناکام کروا دیتی تھی۔ آج وہ فرزام کے آگے بھی فیل ہوگئی۔

اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی چلا گیا۔ وہ گھر میں ہی اس کا انتظار کرتی رہی۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہ مان ہی جائے گا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

رات گئے وہ آیا اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کوشش کی بات کرنے اور کمرا کھلوانے کی۔ مگر اس نے بات کی نہ ہی کمرا کھلا۔ آنے والے چند اور دن بھی ایسے ہی چلتا رہا۔ پیرس جانے والا جوڑا اور خریدی گئی اتنی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ سارا وقت روتی رہتی۔ دونوں کے درمیان وقت اور حالات کی جو خلیج تھی اور جسے دونوں ہی جانتے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ختم کررہے تھے۔ وہ خلیج ایکدم ہی پھیل کر انہیں بہت دور لے گئی۔ اب جب وہ اس کے قدموں میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کچھ غلطیاں نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ کچھ غلطیاں لے ڈوبتی ہیں اور کچھ کچل کر ملیا میٹ کردیتی ہیں۔ عدن یہ تینوں غلطیاں تھا اور یہ تینوں افق سے ہوئی تھیں۔

اس کے باپ کو پہچان لینے پر بھی وہ اس کی خصلت کو نہیں جان سکی۔ آخر خون تو ایک ہی تھا نا۔ وار کرنا تھا عدن نے اس پر۔ ایسا وار کہ اس کی جان ہی نکال لی۔ اگر انسانیت کے نام پر اسے یہ سب کرنا ہی تھا تو فرزام سے کیوں چھپایا؟ یہ غلطی اسے ملیا میٹ کرچکی تھی۔ اب اسے وقت کا ہی انتظار تھا کہ فرزام اس پر یقین کرلے۔

جس کمپنی کے ساتھ وہ کینیڈا کام کرکے آیا تھا اسی کی ایک اشتراکی کمپنی میں وہ کام کرنے لگا۔ آفس کے پہلے دن جو اسے پھولوں کے بکے ملے۔ اسے اس نے ٹیبل پر پٹخ دیا۔ سارے منصوبے خاک ہوگئے۔ وہ لمبی چھٹی اور یورپ کی سیر۔ صرف اس کی پیاری بیوی افق اور ساتھ صرف وہ۔

افق نے کالج جانا چھوڑ دیا۔ اسٹور جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ اس حالت میں ہی نہیں تھی کہ کہیں جاتی۔ سارا دن لفظ جوڑتی رہتی اور فرزام کی طرف نظر اٹھتے ہی اس کا دم نکل جاتا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتا نہیں تھا۔ ناشتا کرکے نہیں جاتا تھا۔ گھر آکر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رات رات بھر افق رو رو کر بتاتی رہتی۔ وہ فرزام کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن وہ فرزام کے ساتھ ایسے بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اسے وہ بتا نہیں سکی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی راستے پر ایک ساتھ چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آگئے۔

ایک روز وہ حسب معمول رات گئے آیا تو اس نے آگے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خدا کے لیے میرے ساتھ ایسے نہ کرو فرزام! مجھے کچھ کرلو برا بھلا کہو۔ لیکن ایسے نہ کرو۔"

سارا دن بھی وہ روتی رہی تھی۔ اس کے سامنے بھی رو رہی تھی۔

اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس سے آزاد کروایا۔

"اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا افق! تم نے مجھ سے سب کچھ چھپایا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولا۔ کئی بار میں نے تم سے پوچھا۔ تم ٹھیک ہو۔ تم یہی کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو۔ ان دنوں تم اس سے مل رہی تھیں نا؟ چھپ چھپ کر اتنا کچھ کررہی تھیں۔"

"میں اس سے نہیں ملی تھی۔ وہ میرے راستے میں آیا تھا۔"

"کیوں اس شخص کے لیے تم اس وکیل کے آفس تک پہنچی تھیں۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم بتا کسی وجہ سے گئی تھیں۔ تم اس شخص عدن کے لیے نہیں گئیں۔ آج تک وہ تمہارے اندر ہے۔"

"میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ میرا یقین کریں۔"

"ہاں مجھے یقین دلاؤ افق۔ میں یقین کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا ہی تو یقین کرتا آیا ہوں۔ لیکن تم نے اس یقین کا بہت غلط استعمال کیا۔ تم نے میرا اعتماد تار تار کردیا۔ اتنے سال سے میرے ساتھ ہو۔ مجھے جان نہیں سکیں۔ تم نے مجھ سے اتنے جھوٹ بولے۔ جس نے شادی سے پہلے ہر لمحے سچ کو سن کر بھی تمہیں اپنایا۔ اگر تمہیں اس شخص سے نفرت ہوتی تو تم اس میگزین کو ہی پھاڑ کر پھینک دیتیں۔ یہ ہوتی تمہاری نفرت۔ اپنے قدم باہر کی طرف بڑھانے سے پہلے تم میری طرف آتیں۔ سالوں پہلے میں نے ہزاروں بار یہ شکوہ کیا تھا کہ کس قوت نے مجھے برطانیہ سے نکال باہر کیا۔ تم سے شادی کرتے ہوئے مجھے اس قوت پر بہت پیار آیا۔ میں نے لاکھوں بار شکر ادا کیا کہ مجھے افق کے لیے بروقت وہاں سے نکال دیا گیا۔ روحی سے دور کردیا گیا۔ آج مجھے یقین ہوا ہے افق! کہ مجھے تو تم سے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے ملوایا گیا ہے۔ جس کے بعد میں کسی اور قابل ہی نہ رہوں۔ بس تم ہی میرا یہ انجام ہو۔ ہر خواب کی اجڑی تعبیر۔ زندگی میں جس تباہی سے میں بچتا رہا اس تباہی کو خود اپنی زندگی میں شامل کرلیا۔ مجھے یقین دلاؤ افق! تم اس شخص سے نفرت کرتی ہو۔ اور یہ سب کچھ تم نے نفرت میں کیا؟ اب نہ جانے یہ وقت کتنا وقت لے گا۔ پھر سے محبت کے لیے۔"

فرزام چلا گیا۔ افق کھڑی رہ گئی۔

اب اکثر وہ اسے آن لائن روحی سے بات کرتا نظر آتا۔ افق نے چھپ کر عدن سے بات کی تھی۔ وہ سامنے کرتا تھا۔ مسٹر فرزام کے گھر میں مسز فرزام اجنبی ہوگئیں۔ دنیا کے ہر کام سے افق کا دل اچاٹ ہوگیا۔ ایک فرزام کے علاوہ اسے کسی کی فکر نہ رہی۔ ایک اسی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہ رہا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی اس کے لیے سب سے بڑا غم بن گیا۔

وہ آفس سے جلدی آگیا۔ اسے آواز دے کر سامنے صوفے پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان آواز دے کر بلانے اور ایسے موقع پر آمنے سامنے بیٹھنے کا رواج ختم ہوگیا تھا۔ وہ اس کی شکل کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں دے لے۔

"میں کاغذات بنوا رہا ہوں۔ اسلامک سینٹر گیا تھا۔"

"کیسے کاغذات؟" اس نے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"طلاق کے۔" کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا۔ نہیں اتنے آرام سے بھی نہیں کہا۔ قیامت دونوں طرف ہی آئی تھی۔

۴

چوتھی اور آخری قسط

مکمل ناول

سمیرا حمید

محبت میں ہار جو

وہ اس سے ناراض تھا۔ بلاشبہ۔ بہت ناراض تھا۔ لیکن آج عدن اس کے آفس میں آیا تو اس نے وہ ناراضی بھی چھوڑ دی۔

"کیوں آئے ہو؟" ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور معدوم ہو گئی۔

"افق کے لیے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمیز سے بات کرو۔ بیوی ہے وہ میری۔" فرزام کا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ورنہ اس کا گلا ہی دبا دے۔

"بیوی وہ تمہاری ہے۔ لیکن محبوبہ وہ صرف میری ہے۔ وہ آج بھی صرف مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"اسے تم بے وقوف بنا کر بھاگ گئے۔ اب پھر سے آ گئے ہو۔"

"بے وقوف تو تم ہو۔ جو اس کے ساتھ تعلق کا رشتہ سمجھ رہے ہو۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے صرف میرے لیے ناممکن کو ممکن کر دیا۔ میں پچھلے پانچ چھ سال سے جیل میں تھا۔ مجھے میرا قابل وکیل اور امیر کبیر باپ بھی آزاد نہیں کروا سکے۔ لیکن افق نے کر دکھایا۔ یہ ہے اس کی محبت کی طاقت۔ وہ بہت قابل لڑکی ہے۔ کس کس سے جا جا کر ملی۔ میرے لیے درخواستیں دیں۔ صحافیوں سے ملی۔ پاکستانی کمیونٹی سے واک کروائی۔ اتنی بڑی این جی او کو میرے لیے فعال کر دیا۔ کون کون آکر وہاں مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے این جی او کو فنڈز بھی دیے۔ یہ سب کیوں کیا اس نے؟ کس لیے؟ وہ میرے بغیر سانس نہیں لیا کرتی تھی۔ ایک بار پاکستان میں بھی جیل چلا گیا تھا۔ رو رو کر بیمار ہو گئی تھی۔ وہ رات رات بھر دعائیں کرتی تھی میرے لیے۔ اس وقت وہ میرے لیے دعا کر سکتی تھی۔ اس بار اس نے سب کر دکھایا۔ کیا یہ کم ہے سمجھنے کے لیے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہے؟ اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا ہی سوگ منایا ہے۔ میری



زبردستی شادی کروی گئی تھی۔ اپنے باپ کی بیماری کے ہاتھوں میں مجبور تھا۔ تمہارے لیے اسے کبھی نہ چھوڑنا۔ وہ تو نہ ہنسی ہوگی نہ ہی روئی ہوگی۔ زندگی کو مر مر کر گزارا ہوگا۔ تم اسے کبھی نہیں جان سکتے۔ اس کے اندر کا بھید نہیں پا سکتے۔"

خاموشی کا وقفہ اس نے اپنی مرضی کا لیا۔

"اور نہیں تو اتنا ہی سوچ لو کہ اس جیسی شریف لڑکیاں محبت کے کھیل بار بار نہیں کھیلتیں ۔۔۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جو پہلی محبت کا جو پودا اپنے اندر لگا لیتی ہیں اسی کے نیچے اپنی قبر بنا لیتی ہیں۔ اسے اکھاڑ کر نہیں پھینکتیں۔ حالات سے مجبور ہو کر اگر اس نے شادی کر بھی لی تو۔۔۔ کیا وہ تم سے محبت بھی کرنے لگی؟ اگر کہہ بھی دیا ہوگا۔۔۔ جیسا کہ مجبور مشرقی لڑکیاں کہہ ہی دیتی ہیں۔۔۔ تو کیا وہ سچ کرتی ہے؟ اپنی ماں کی وجہ سے تم سے شادی کرلی ہوگی۔۔۔ یا سہارا چاہیے ہوگا۔ اس کا تو کوئی بھائی بھی بڑا نہیں تھا۔ تمہیں اس نے سہارا بنالیا۔ لیکن جان ابھی تک اس کی مجھ ہی میں ہے۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میرے بارے میں جانا تو باز نہیں رہ سکی۔ دیکھو ہمارے تعلق کی مضبوطی کہ وہ میری طرف بھاگی آئی۔ عقل سے کام لو! اسے چھوڑ دو۔۔۔ اسے مجبور نہ کرو۔ اپنی اماں یا تمہارے کسی احسان کی وجہ سے وہ تو شاید تم سے نہ کہے۔ ایسے ہی مجبوری سے تمہارے ساتھ بندھی رہے۔ آزاد کر دو اسے۔ اور پھر دیکھو کہ کیسے بھاگی آتی ہے میرے پاس وہ۔ وہ مجھ سے یہاں بار بار چھپ چھپ کر ملتی رہی ہے۔ تب تم یہاں نہیں تھے۔ اس نے تمہیں بتایا کہ میں نے اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے؟ چلو! میرے ساتھ اس کافی شاپ جہاں اس نے کافی پی تھی۔ کوئی ایک آدھ تو تمہیں ضرور بتا دے گا کہ وہ میرے ساتھ وہاں جاتی رہی ہے۔ اور کتنی باتیں بتاؤں کہ تم یہ یقین کرلو کہ وہ میرے لیے بنی ہے۔ تمہارے لیے نہیں اسے آزاد کر دو۔"

فرزام گم صم اسے سنتا رہا۔ سنتا رہا۔ دنیا کا کوئی بھی مرد ہوتا وہ عدنان کو سنتا۔ عدن کا یقین کرتا۔ افق پر شک کرتا اپنی قسمت پر روتا۔۔۔ اور نہیں تو اس سارے نقصان پر اس سب پر خودکشی تو ضرور ہی کرلیتا۔

وہ سب سنتے سنتے فرزام کہیں کا نہ رہا۔ وہ شخص اپنی مرضی سے بول کر چلا گیا۔ وہ فاتح تھا۔ آیا اور چلا گیا اور فرزام شکست خوردہ وہیں پڑا رہا تھا۔ اس نے ماں کو فون کرنا چاہا۔ گلا پھاڑ کر رونا چاہا۔۔۔ نہ فون کرسکا نہ ہی رو سکا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ۔۔۔ وہ عدن سے پہلی محبت۔۔۔ مشرقی عورت۔۔۔ ٹھیک کہا اس نے۔ افق جیسی لڑکی محبت کا کھیل نہیں کھیلتی۔ محبت ایک ہی کرتی ہے اور اسی محبت میں خود کو فنا کرتی ہے۔

اس سے متاثر ہوتے۔۔۔ اس کے قریب آتے۔۔۔ اس سے محبت کرتے۔۔۔ فرزام عین وقت پر لٹ گیا۔ اب وہ کسی پل سے چھلانگ لگا دینے کے ہی قابل رہ گیا تھا بس۔۔۔ اب ایسے انجام کے ساتھ وہ کیسے زندگی جیے گا۔ کسی کو بتائے بتائے وہ آفس سے چلا آیا۔ مجبوری کے ان دونوں کے رشتے کو اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔

وہ ناراض ہے۔۔۔ وہ مان جائے گی۔ لیکن وہ تو طلاق کی بات کر رہا ہے۔ وہ اس انگوٹھی کے انتظار میں تھی جو جلد ہی دوبارہ اسے پیش کی جائے گی اور وہ اسے باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس قدر پتھر دل ہو چکا ہے افق کے لیے۔ اتنا متنفر۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں لوٹ کھسوٹ کرنے لگیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

فرزام نے اس کے ایسے دیکھنے پر اسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دو مختلف نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر میں وہ روبوٹ گھوم رہا تھا جو صرف کام کرتا تھا۔ نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا۔ نہ ہی زندگی میں زندہ تھا۔ وہ اندر باہر سے مردہ ہو چکا تھا۔

افق کی نظر اس فرزام پر تھی۔ جس کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا سمندر تھا اور جو اب آنکھیں بدل رہا تھا۔ اب وہ شاید روی کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اس کا یقین ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ فرزام نے سچ مان ہی لیا تھا کہ انارکلی بازار میں شادی کا ان کریٹ بن جانے والا وجود عدن کی محبت کا سوگ ہی منا رہا تھا۔ وہ بھول گیا کہ بیوی میں اس کے ساتھ وہ کس قدر خوش تھی۔ اس نے مان لیا تھا کہ وہ اس وقت وہ خود بہلا چکی تھی۔ وہ ایک جھلی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔۔۔ ایک سمجھوتے کی زندگی۔

"مجھے طلاق دے رہو؟" صرف سوال نہیں تھا یہ۔ "تمہیں اور کیا چاہیے؟ تمہیں عدن ہی چاہیے تو تم آزاد ہو۔"

واقعات اتنے معمولی اور عام بھی نہیں تھے۔ جتنا کہ بظاہر نظر آرہے تھے۔ کوئی شخص سربازار کسی دوسرے کی بیوی کا ہاتھ پکڑ لے اور کہے کہ یہ مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی ہے تو یہ بات اتنی عام بھی نہیں رہتی۔ کوئی ایسے ہی کسی کی بیوی پر بات نہیں کرتا۔ صاف دل کے بڑے دل کے شوہر اگر غصہ پی بھی جائیں تو دلوں میں بل ضرور آجاتے ہیں۔ شک اور وسوسہ تو شیطان کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔۔۔ جسے وہ ہمیشہ اٹھائے رکھتا ہے اور تاک کر موقعے سے انسان پر وار کرتا ہے اور زہر پھیل کر نس نس تک چلا جاتا ہے۔ تو یہ وار فرزام پر بھی کام کر گیا۔ تب ہی اس کا انداز زہر خند تھا۔۔۔ جان لیوا تھا۔

"مجھے صرف فرزام چاہیے۔" پانی افق کے سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرزام کی زندگی سے نہ وہ جائے گی۔۔۔ نہ ہی اسے جانے دے گی ہر کام کو پھرتی اور دل جمعی سے کرنے والی افق فرزام پر اپنی ساری جان لگا دے گی۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے نہیں دے گی۔

وہ تمسخر سے ہنسا۔ "یہ فرزام تمہارے پاس پچھلے تین سال سے ہے۔ کبھی تم اس کے پاس آئیں؟ اس فرزام سے تمہارا دل بہل رہا تھا۔۔۔ بس تمہیں ایک سہارا مل گیا تھا۔ گندم کی بھوسی میں جیسے آگ لگتی ہے اور بجھتی نہیں۔ ایسے ہی فرزام میں عدن آگ لگا گیا تھا جسے اب بجھ نہیں رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ یہ غلط ہے۔"

اس نے اس کی بات کو درمیان میں ہی اچک لیا۔ "تم اپنے لیے آنے والے ہر رشتے کے لیے انکار کرتی تھیں۔ تم نے تنگ آکر مجھے ہاں کہہ دیا۔"

"یہ غلط ہے فرزام! یہ زیادتی ہے میرے ساتھ ۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔ تنگ آکر نہیں۔"

"پھر کیا تمہیں مجھ سے محبت تھی؟"

"محبت تو ہم دونوں کو ہی نہیں تھی نا۔ ہم نے ایک دوسرے کو جان کر ہی ہاں کی تھی۔ میں نے سب سچ بتا دیا تھا۔ میں تب نہیں کرتی تھی۔ مگر اب بہت محبت کرتی ہوں فرزام" اس نے ایسے وقت میں اپنی محبت کا اعلان کیا۔ جب اسے کوئی وقعت ہی نہ دی گئی۔

"کب کی تم نے مجھ سے محبت؟ میرا تمہارا محبت کا معاہدہ نہیں تھا ایمان داری کا تو تھا۔ مجھے تم اچھی لگیں۔ تمہاری شرافت تمہارے کام تمہارے اصول۔ بہت متاثر تھا میں تم سے۔ میرا ایمان تھا کہ صرف ایک افق جیسی لڑکی میری زندگی کو تباہ نہیں کرے گی۔ میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔ میں بہت خوش نہ رہا تو ناخوش بھی نہیں رہوں گا۔ تمہارے جس حسن پر دنیا مرتی ہے نا۔ اس پر میں نے کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔۔۔ جو حسن تمہارے اندر تھا اس پر میری نظر تھی۔ گزرے سالوں میں میں نے روی کو یاد کیا۔ تاکہ مجھے یاد رہے کہ مجھے روی جیسی غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت بار اس کے فون آئے۔ لیکن اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں اس سے بات کرنا میں نے گوارا نہیں کیا۔" آنسو کا گولہ اس کے حلق میں اٹکا۔

"تم سے متاثر ہوتا میں تمہارا مقید ہو گیا۔ تمہارے بغیر رہنا محال ہو گیا۔ پہلے تمہیں پرکھ رہا تھا۔ پھر تمہارے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن صرف تمہارے لیے کہ تم ماضی کے ہر طرح کے دکھ سے باہر نکل آؤ۔ تم اتنی مستحکم ہو جاؤ کہ تم۔۔۔ تمہیں مجھ تک آنے میں کوئی مسئلہ نہ پیش آئے۔ اس الٹ پلٹ میں، میں کہیں کا نہیں رہا۔ جس خوف سے بچتا رہا اسی سے محبت کرنے لگا۔ قسم کھائی تھی میں نے کہ کسی عورت پر یقین نہیں کروں گا۔ بہت یقین کیے تھے میں نے روی پر۔۔۔ قسم توڑی اور نقصان بھی خود ہی اٹھایا۔ جسے

انگوٹھی پہنانا تھی' وہ تقریباً" رو رہا تھا۔۔۔ جیسے تالیاں بجوانا تھیں' وہ سن کر سن ہو رہی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا افق؟ دل میں اسے چھپائے تم میرے ساتھ رہیں۔۔۔ دور۔۔۔ دور۔"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ بار بار یہی کہوں گی' باقی باتیں حالات نے پیدا کر دی ہیں۔ بظاہر وہ سچ ہیں ۔۔۔ پر وہ جھوٹ ہیں۔ صرف ایک بار میرا یقین کرو۔ میرے ڈر نے مجھے دور رکھا۔ مجھے محبت کرنے سے ڈر لگتا تھا۔"

"محبت سے نہیں افق! کسی اور کے ساتھ محبت کرنے میں۔۔۔ تم وہی لڑکی ہو جو پہلی محبت کے نام پر زندہ رہتی ہے اور اسی پر مر جاتی ہے؟"

"ہاں! میں وہی لڑکی ہوں' جو محبت کے لیے جیتی اور مر جاتی ہے اور وہ تمہاری محبت ہے۔ میری اس اس نادانی کو محبت نہ کہیں۔ میرے شوہر کے برابر کوئی نہیں آسکتا۔"

"اس نادانی کو۔" فرزام نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "اپنی اماں کا لحاظ کر رہی ہو۔ معاشرے کا۔۔۔ خاندان کا۔ مجبور ہو یا احسان اتار رہی ہو۔۔۔ آج تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو۔۔۔ مجھے ہی تمہیں چھوڑ کر رومی کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ تم نے دو بار میں اسے بھی مات دے دی۔ وہ صاف صاف انکار کر گئی۔ انگوٹھی منہ پر مار دی اور تم روایتی لڑکی' ڈرپوک اور شریف۔۔۔ پہلی محبتوں کو سینے سے لگائے رکھنے والی۔ تمہیں تو مجھ سے دور جانا آیا۔۔۔ نہ ہی قریب کرنا۔" غم و غصے سے وہ تقریباً" پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کی آخری بات نے افق کو اندر تک تہس نہس کر دیا۔

تو اب اسے بار بار رومی یاد آ رہی ہے اور اب یہ خود رومی کے پاس جانا چاہ رہا ہے۔ اب وہ رومی کے لیے تڑپ رہا تھا۔

"تمہارا وہ اماں تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہے۔ جس کے لیے تم نے اپنی محنت سے جمع کیا گیا پیسہ فنڈز میں دے دیا۔ اگر تمہارے اکاؤنٹ میں اور پیسے بھی ہوتے تو تم وہ بھی دے دیتیں نا؟"

"جبکہ وہ اس کی ہے اس نے سراسر۔۔۔ میں نے کبھی پیسے نہیں دیے۔ اس کی بات پر یقین ہے۔ مجھ پر نہیں۔"

یقین دراصل ہر وقت سچ بولنے پر کیے جاتے ہیں' کیونکہ افق! اس کی کی گئی باتیں اب تک سچ ہی نکل رہی ہیں۔ کیا اس کا کہا سب سچ نہیں؟ اگر وہ نہ ملتا تو مجھے بتاتیں یہ سب؟ شاید بنا بتائے ہی چھوڑ جاتیں۔ یہ شخص تمہارے کالج آیا۔۔۔ پھر اسٹور تک۔ تم لوگ کافی شاپ میں ملے۔ اس کے وکیل کے پاس تم بار بار جاتی رہیں۔۔۔ اور کیا کچھ نہیں کرنا تھا افق؟ کیا کچھ اور اتنا کچھ چھپایا تھا تو بتانا کیا تھا؟"

"کہ مجھے تم سے ۔۔۔ صرف تم سے محبت ہے۔ صرف اپنے شوہر سے ۔۔۔ اپنے فرزام سے بہت بڑی غلطی کر دی میں نے۔۔۔ دھوکا نہیں دیا۔"

"اب بھی کہہ رہی ہو محبت کا۔۔۔ اب بھی۔ کیا ابھی اور میرے نام کا سہارا چاہیے؟ جب تک ڈاکٹر عدن کا کیس ختم نہیں ہو جاتا۔۔۔ کیا تب تک؟" وہ واقعی پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اس کا دماغ جو جو کچھ سوچ رہا تھا' جلے بھنے بغیر وہ زبان پر لا رہا تھا۔

صوفے پر گرے ہوئے انداز سے بیٹھی وہ اونچی آواز سے بچوں کی طرح رونے لگی۔

"میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں فرزام۔ میرا یقین کر لو۔ چلو ہم پاکستان چلیں۔ میں نے کہا نہیں کہ میں محبت کرتی ہوں۔ لیکن مجھے کہنا ضرور تھا۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میں تمہارے پیروں میں گر کر معافی مانگ لیتی ہوں۔ میں نے اتنا کچھ چھپایا' لیکن میں نے ایک پل کو بھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کس کی گواہی لاؤں کہ تمہیں یقین آئے۔ صرف اللہ ہی ہے' جو سب جانتا ہے فرزام! تم اسی اللہ پر جو سب جانتا ہے' یقین رکھ کر میرا یقین کر لو۔ اسی خدا کے لیے میری بات مان جاؤ۔ صرف ایک بار خدا کے لیے۔"

جس وقت وہ یہ بات کر رہی تھی' ٹھیک اسی وقت بیل بج گئی۔ فرزام نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ افق بھی منتقل ہوئی۔ وہ اٹھ کر اندر جانے لگی۔ لیکن جسے اس نے دیکھ لیا۔

فرزام نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔۔۔ سامنے نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر اس کی کنپٹی کی رگیں پھڑک کر تن گئیں۔ وہاں عدن کھڑا تھا۔

اس کی شکل پر وہی تاثر تھا جو میدان جنگ میں دشمن کے سپاہیوں کی لاشوں کو ٹھڈے مارنے والوں کی آنکھوں میں ہوتا ہوگا۔ وہ عدن آگیا تھا۔ اپنی فتح کا جھنڈا فرزام ہاشمی کی لاش پر گاڑنے۔

"افق مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔" اس نے ذرا سا جھک کر سرگوشی کی۔

چوٹ صحیح مقام پر لگی۔

"تمہیں پورا حق ہے۔" فرزام ذرا سی بلند آواز میں بولا۔ وہ بے انتہا غصے میں نظر آنے لگا۔ اس کا جی چاہا گھونسا مار کر اس خبیث کو چت کر دے۔ اسے مار دینا چاہیے تھا لیکن وہ باہر نکل گیا اور عدن اندر آگیا۔ افق دروازے کی طرف جب تک آئی فرزام باہر جا چکا تھا۔

"فرزام!" بند ہوتے دروازے تک یہ آواز پہنچی۔ عدن دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"جانے دو اسے۔ اس نے ہی مجھے بلایا تھا کہ میں آ کر تمہیں لے جاؤں۔"

افق نے اسے دھکا دیا اور لپک کر باہر نکلی۔ سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ فرزام وہاں نہیں تھا۔ وہ پارکنگ کی طرف بھاگی۔ فرزام کی کار تیزی سے وہاں سے نکلی اور وہ چلا گیا۔ اس نے نیچے آنے میں دیر کر دی۔؟

نہیں۔ اس نے ہر معاملے میں دیر کر دی۔ عدن سے متعلق ہر بات بتانے میں۔۔۔ اپنی زندگی میں فرزام کو اس کا مقام دکھانے میں۔۔۔ وہ اسے چھوڑ رہا ہے۔۔۔ یہ صرف عدن کی وجہ سے ہی نہیں ہوا۔۔۔ یہ افق کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ افق کی آنکھیں جھلملائیں۔

دل کے رستے جان کیسے نکلتی ہے۔ وہ آنسوؤں کی زبان میں بتا سکتی تھی۔۔۔ واقعات ایسے کیسے بنتے ہیں۔ وہ ایک ایک کو سمجھا سکتی تھی۔ برسوں پہلے اس نے اپنی عقل پر ماتم کیا تھا۔ جب وہ عدن کے باپ کے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ برسوں بعد بھی وہ اپنی عقل پر ماتم ہی کر رہی تھی۔ وہ عدن کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکی۔

اب وہ حلق پھاڑ کر اعلان کر سکتی تھی کہ وہ فرزام سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اب اس اعلان کو کون وقعت دے گا۔ یہ ایسے ہی ہوتا' جیسے کسی کے مرنے کے بعد اس کی پیدائش کا اعلان کیا جائے۔۔۔ پھر ایسی خبروں سے کسی کو کیا سروکار۔ فرزام تو جا چکا تھا....

کھڑے کھڑے افق پر بہت سی حقیقتیں وارد ہوئیں۔

وہ اس وقت اسے تنہا کر گیا ہے۔ یہ چھوٹی بات ہے۔ بڑی بات تب ہوگی' اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہ آئے۔

شاید ایک لمبی مسافت اس کے انتظار میں تھی۔

یا ایک طویل کرب۔

کیا وقت اسے اور سبق دینا چاہتا تھا یا وقت واقعی بے رحم بن کر اس سے کچھ چھین لینا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اجنبی لوگ بھی اسے دیکھ لیتے تو ضرور اس سے پوچھتے "کیا ہوا؟"

وہ زیر لب اللہ کو یاد کرنے لگی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو مجسم التجا (دعا کی صورت جڑے ہاتھ) بنی کھڑی تھی۔

عدن کھڑکی میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہاں ایسے کھڑی تھی۔ جیسے اپنے ہی ہاتھوں اپنے تخت و تاج کے ٹکڑے کر ڈالے ہوں۔ جیسے اپنے ہی مردہ وجود پر کھڑی ماتم کر رہی ہو۔ ذرا سا دور۔۔۔ تھوڑا سا دھندلا ہی سہی عدن دیکھ رہا تھا کہ وہاں کون کھڑا ہے۔ وہاں اماں کی افق نہیں کھڑی تھی۔ وہ اس کے لوٹ آنے پر نہیں' کسی اور کے چلے جانے پر ماتم کناں تھی۔

کیا وقت ایسے بدل جاتا ہے۔ اگر یہ وقت ہی ہے تو عذاب کا مستحق ہے۔

عدن نے صاف شیشے پر اپنا ہاتھ رکھا۔۔۔ وہ افق کو خود میں بھینچ لینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں حلول کر جانا چاہتا

تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے بتانا چاہتا تھا ان سالوں میں اس پر کیا گزری۔ اس نے ایک ایک ساعت اس کے لیے جمع کر رکھی تھی۔ وہ گزری ساری ساعتیں اس کی جھولی میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ وہ اب اسے ٹھیک ٹھیک بتانا چاہتا تھا کہ اس کی محبت اس پر کب اتری۔ اس محبت پر اس کا ایمان کب مکمل ہوا۔ اس کاملیت کا لفظ لفظ وہ اس پر آشکار کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتائے گا کہ قید کے ان برسوں میں اس نے کتنی بار اسے پکارا۔ کتنی بار اس نے اسے خواب میں دیکھا اور آنکھ کھل جانے پر رو دیا۔

"وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔" اس نے غلطی کی۔

"وہ واپس آ گیا ہے۔" غلطی کی اصلاح ہو گئی۔

افق ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا۔ اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ بہت آ رہا تھا۔ لیکن خود سے زیادہ نہیں۔ ترس اس نے پہلے خود پر کھایا تھا۔ اس نے ایک پرعذاب وقت کاٹا تھا۔ زیادہ رحم کا مستحق وہ ہی تھا۔ افق سے دور عدن اس سے زیادہ ہارا کھڑا تھا۔ وہ کیسے افق پر ترس کھا لیتا؟ اتنا ظالم کیسے ہو جاتا کہ خود کو ہی مار ڈالتا؟ عدن کے اندر افق کے لیے اب محبت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جتنی افق کا خیال تھا اس کے اندر فرزام کے لیے ہے۔

وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ کس حال کو پہنچی کھڑی ہے۔

وہ کس حال کو پہنچ چکا ہے۔ وہ کیوں نہیں پلٹ کر دیکھتی۔

وہ اپنے تعاقب کی طرف کیوں نہیں پلٹ رہی؟

"یہ جو آسمان کا رنگ ہے۔ یہ کتنا پیارا ہے امان! مجھے اتنی دیر سے کیوں معلوم ہوا کہ آسمان اتنا خوب صورت ہے؟"

"تمہاری آنکھوں میں امان آ بسا ہے۔ اب تمہیں خوب صورتی کا ہر پیمانہ معلوم ہوگا۔ کہو امان جی! شکریہ۔"

"اے اللہ شکریہ۔ میری آنکھوں کو امان دیا۔ یہ بند ہوئی ہیں تو اندھیرے پر بھی فدا ہوئی ہیں۔"

"میں ان پر فدا ہوں۔"

عدن نے اپنی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ اب اسے افق کی نفرت ملے گی۔ ایک لمبا عرصہ ملے گی۔ فرزام اسے طلاق دے دے گا۔ وہ عدن سے نفرت کرے گی۔ ٹھیک کرے گی۔ افق کی ہے تو نفرت ہی کی۔ اسے ایک طویل انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی اپنے جیسی محبت پلٹنے کے لیے۔ اور وہ تو واثق ہے۔ مستقل نفرت پال ہی نہیں سکتی۔ محبت کے بنا رہ ہی نہیں سکتی۔

وہ ضرور کرے گا یہ انتظار۔ اب وہ صابر بن جائے گا۔ اب وہ سب کرے گا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا، اب یہ امرت ہی پینا ہے۔ یہی خضر اب اسے زندہ رکھ سکے گا۔ ایک ایک بوند کے لیے وہ ہر حد سے گزر جائے گا۔ وہ افق کے لیے ہر پاتال میں اتر جائے گا اور اسے بھی گھسیٹ لے جائے گا۔ وہ اندر باہر سے افق ہو چکا تھا۔ اس کی ذات میں صرف اسی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتا۔ اسی لیے وہ فرزام کے پاس گیا تھا۔ ایک سپر پاور ملک کی بدنام زمانہ جیل میں وقت گزارنے والے کو ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا کہ اسے کس وقت ان دونوں کے درمیان دخل دینا ہے۔

وہ اس بلڈنگ کے آگے پیچھے ہی ٹہل رہا تھا۔ فرزام آفس سے فوراً ہی اٹھ آیا تھا۔ وہ کیوں جلدی آیا تھا۔ عدن نامی نام نہاد وحشت گرد جانتا تھا۔ الٹی انگلیوں کے کمال کر وہ سیکھ چکا تھا۔

افق گھٹنوں کے بل زمین پر ڈھے گئی۔ بوسٹن میں آج یہ کیسی رات اتری تھی۔ اتنی اندھی۔ اس رات نے سب کو اندھا کر دیا تھا۔ یہ اندھا پن ستارہ صبح کو نگل رہا تھا۔ یہ اندھیرا۔ اندھیرا۔

زندگی میں وہ اتنے صدمات سے گزری تھی۔ وہ کسی ایک بھی صدمے سے مر کیوں نہ گئی۔ مرنے کے لیے یہ آج ہی کی رات کیوں؟

اسی صدمے سے کیوں؟

کیا نحس ساعت ابھی بھی اس کے پیچھے ہیں؟

پیچھے ہی ہوں گی۔ ورنہ وہ گہرے ہوتے اندھیرے میں حلول نہ کر رہی ہوتی۔

اس کا جی چاہا دیوانی ہو کر در بہ در بھٹک جائے۔ یہ دیوانگی اس نے فرزام پر ظاہر کیوں نہ کی؟ پلٹ جانے کے لیے دھول ہی سہی۔ قدم بوسی کے لیے خاک ہی سہی۔ یہ بھی کم تھا اس پہلے شخص کے لیے جس عزت سے اس کی طرف دیکھا اور شرافت سے اپنی عزت بنا لیا۔ بلور جان کر رخ رخ روشن کیا۔ دل میں ایک مقدس دعا کی طرح رکھا۔ ایسی دعا میں جن پر خدا سے خاص وعدہ لیا جاتا ہے۔ وہ اس پر زندگی کے رخ روشن کرتا رہا۔ اس پر لمحہ بہ لمحہ فدا ہوتا رہا۔ وہ ایک ایسا دیوانہ تھا۔ جس نے کبھی پرستش کیے جانے کی خواہش نہ کی۔ بس ہاتھ جوڑے بیٹھے رہنے پر ہی نازاں رہا۔ رشتے اور تعلقات میں کون ایسا کرتا ہے۔ کون ہے جو ساتھی کے عیبوں کو فراموش کر کے دیوتا بناتا ہے۔ کون ہے جو تعلق کو مقدس فریضے کی طرح سرانجام دیتا ہے۔ ایسی عبادتیں کون کرتا ہے' جو فرض نہیں ہوتیں۔ لیکن فرض کر لی جاتی ہیں۔ محبت سے۔ محبت کیسے۔ یہ صرف محبت ہی ہے' جو اس مقام تک لے آتی ہے۔ یہ کرشمے محبت کے ہی ہیں۔

کشمیری ۔۔۔۔ حسن پر اس کی چاہت قائم نہ تھی۔ وہ حسن جس پر نظر پڑتے ہی شاہراہ قائداعظم کی ٹریفک عدن کے لیے ساکت وجامد ہو گئی تھی۔ وہ نیلی گہری آنکھیں جن میں عدن کا دل ڈوب گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہو گیا' صرف ایک ہیلن کے لیے جنگ کیوں کی گئی۔ میں تاریخ کے اس افسانے پر ہنسا کرتا تھا۔ اب یہ تاریخ مجھ پر ہنس رہی ہے افق۔ تمہارے لیے تو عالمی جنگ بھی کم ہے۔"

وہ عدن کی وہ ہیلن تھی' جو لاکھوں انسانوں کو میدان جنگ میں گھسیٹ لائی تھی۔ جسے اٹھا لایا جاتا ہے۔ پہلو میں بٹھایا جاتا ہے۔ وہی حسن اور وہی کشش' جو عظیم قوموں میں جائز نہیں۔ جس پر قلم اٹھا کر دو لفظ بھی نہیں لکھے جاتے۔

"میں نے سنا ہے کہ کچھ روگی بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ایک سچا اور کھرا انسان ایسے روگیوں پر ایک پھونک مارے تو وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تمہیں تو مجھے پھونک بھی مارنی نہیں پڑی۔ اور سنو۔ اگر ہم اچانک سے بہت غریب ہو گئے تو ہم ایک شفاخانہ کھول لیں گے۔ تم پھونکیں مارتی جانا۔ میں پیسے اکٹھے کرتا جاؤں گا۔ ہاہاہا نہیں۔ نہیں۔۔۔ میں تمہیں اپنی شفا کے پیسے نہیں دوں گا۔ ایک روپیہ بھی نہیں۔ ٹھیک ہے میں کوئی ایسا روگی بھی نہیں تھا۔ لیکن تم میں تو مکمل کا مکمل تھا۔"

"افق!" عدن کی آواز اس کی پشت سے ابھری وہ آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑھ کر اسے تھام لینا چاہتا تھا۔

افق آنسو بہاتی رہی۔ وہ اباک (مبہوت) کھڑا رہا۔

"کاش! خدا نے فرزام نامی انسان پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔" خدا اسے یاد بھی آیا تو شکوے کے لیے۔

"اس شخص کے لیے آنسو بہا رہی ہو' جو تمہیں چھوڑ گیا۔؟"

افق کے جوگ سادھنا میں تبدیلی نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے سن ہی نہیں رہی تھی۔ یقیناً وہ فرزام کے دل کی دھڑکنیں تلاش رہی تھی۔ آس پاس سے اندھی بہری ہوئی' وہ فرزام کے آسن جمائے تھی۔ عدن گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھا۔

"ہم دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔ تم کہا کرتی تھیں کہ خدا کو تمہیں امان دینا ہی ہوگا۔ تم خدا کو منا کر ہی چھوڑو گی۔ دیکھو! تم نے خدا کو منا ہی لیا۔ خدا مان گیا افق۔ اسی نے ہمیں دوبارہ ملایا ہے۔ واقعی خدا تمہاری بہت مانتا ہے۔ تم نے راضی کر ہی لیا اسے۔"

"اب ہی تو میں نے اسے ناراض کیا ہے۔" افق نے عین اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈر کا شائبہ تک نہ تھا۔ چادر کا کونا دانتوں میں دبائے' سرخ پڑتی ذرا ذرا سی کپکپاتی' کیا یہ وہی لڑکی ہے۔ جو پل پل اس کے سامنے سے گزرتے جس کی جان نکل جاتی۔ وہ فرزام کے لیے اس کی جان لے لینا چاہتی تھی۔ نگاہوں کے اس تصادم نے ایک گہرا صدمہ دیا۔ عدن کا بھاگ کر کہیں چھپ جانے کو جی چاہا۔ کوئی

اس پر صرف اتنا مہربان ہو جاتا کہ وقت کو پیچھے لے جاتا، جہاں اس لڑکی کی نظریں شرما کر جھکا کر نکل جایا کرتی تھیں۔ جن نظروں میں پہلی شبیہ اس کی ہوا کرتی تھی۔

اسے صدمہ ہوا۔ گہرا صدمہ ہوا۔ اس لڑکی نے رو رو کر ان آنکھوں کو برباد کیوں نہ کر لیا۔ اسے یہی تو کرنا تھا۔ ایک کمزور ڈال پر بیٹھی کمزور سی تتلی جیسی لڑکی کو... خود کو اجاڑ لینا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اتنی مضبوط کیوں ہوئی؟ وہ جو کن ہو جاتی تو وہ زندگی کے کسی بھی حصے میں اسے خود کو وار کر آتا۔ اب تو وہ کشکول لیے کھڑا ہے۔ افق جیسی لڑکی اس پر یہ نوبت کیوں لائی؟ اول آنے والے کو وہ اس درجے پر کیوں لے آئی؟ وہ افق سے پوچھتا۔ ضرور پوچھتا۔ لیکن اب کیسے پوچھتا۔؟

"تب وہ میرا تھا۔ اس نے مجھے تم سے بچا لیا۔ میری راتوں کی عبادتوں، سجدوں، دعاؤں پر اس نے مجھے فرزام دیا۔ اس نے مجھے وہ ہیرا دیا، جو انسانوں کی کان سے نہیں نکلتا۔ جسے مقدس صفات سے بنایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو وہ کیا ہے؟ تم نہیں جان سکتے۔ تمہارے پاس وہ علم نہیں ہے۔ تمہارے پاس تو وہ آنکھ ہے۔ جسے میرا حسن نظر آتا تھا۔ وہ آنکھ جو مجھے دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ میرے حسن کے قصیدے بیان کرتی تھی۔ تم نے وہی سب دیکھا نا، جو بازار سے خریداری کرتے وقت ایک گاہک دیکھتا تھا۔ وہی گاہک جو انسان اور چیز میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے مطلب کا۔ اپنے مطلب سے خریدنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بس وہی خریدار ہو نا تم۔؟"

"تم اس وقت غصے میں ہو۔" عدن نے اپنے اندر اٹھنے والی کپکپی کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ وہ افق کے سامنے ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اگر میں غصے میں ہوتی تو تم پر تھوکتی۔ کیا میں نے ایسا کیا؟ میرا تم پر غصہ بھی حرام ہے۔ جیسے تم مجھ پر حرام ہو۔"

عدن کو اب سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ بیٹھا ہی رہتا۔ وہ کھڑا کیوں ہوا۔؟

"دیکھو! تم میرے لیے کس قدر حقیر ہو۔ اگر تم اس حال تک نہ پہنچتے۔ اگر تم اس دنیا کے بادشاہ ہو سکتے تو بھی افق پلٹ کر تمہیں نہ دیکھتی۔ تمہیں تمہاری اوقات معلوم ہوئی؟" افق جم کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ عدن کو واقعی اپنی اوقات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گئی تھی۔

"فرزام کی نظروں میں مجھے تمہاری اوقات معلوم ہو گئی ہے۔" ہمت کر کے آواز کو مضبوط بنا کر عدن نے کہہ دیا۔ جبکہ وہ ایسے گرنے والا تھا۔ جیسے گھن کھایا تنہ۔ جو ذرا سے دباؤ سے دھڑام سے چرمرا کر گر پڑتا ہے۔ اسے کچھ بھی نہ ملا اور وہ گھن کھایا کھڑا رہا۔

"تمہارا نام ان ناموں میں لکھا ہی نہیں گیا۔ جن پر محبتیں واجب ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو جان جاؤ۔"

وہ بددعا دے رہی تھی یا سزا سنا رہی تھی۔ اس نے یہ سب کیسے جان لیا تھا۔ جیل جانے کے بعد سے وہ بار بار رو پڑتا تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں یہ نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ اس پر یہ بات سن کر اسے رونا آیا۔ اس پر مہینوں روا رکھے جانے والے تشدد سے زیادہ اسے اس وقت صحیح سلامت کھڑے ہو کر آیا۔

"مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی... بھول گئیں، کیسے تم سے محبت کرتا تھا۔؟"

"مجھے یاد ہے، کیسے تم مجھے چھوڑ گئے اور کس لیے چھوڑ گئے۔ میں تو تمہاری شکرگزار ہوں۔ کاش کہ تم جان سکتے کہ میں نے نصیحت کے بعد انعام ملنے پر کیسے شکر ادا کیا۔ تم وہ نصیحت تھے، جو مجھے وقت نے دی۔ اور فرزام وہ انعام ہے، جو مجھے خدا نے دیا۔ تم وہ آزمائش تھے، جو زندگی میں ایک بار تو ہر انسان کو جھیلنی ہی پڑتی ہے۔ وہ آزمائشیں جو دھل دھلا کر انسان کا اصل اس کے سامنے لے آتی ہیں۔ فرزام کا دل دکھا کر میں خدا کی ناشکری کیسے کروں۔ ابھی تو فرزام کے ملنے پر اس کا شکر ہی ادا نہیں کر سکی۔" اتنی مضبوط آواز تھی۔ اتنا کھرا انداز اس کا۔

"فرزام تمہیں چھوڑ گیا ہے افق۔ اس صدمے سے باہر آجاؤ۔" دبی عدن کا شبہ پلٹ دینے والا انداز۔

"افق تمہیں دھتکار رہی ہے۔ اسے اپنی پیشانی پر لکھوا کر رکھ لو۔" اس نے عدن کی بچھائی بساط ہی الٹ دی۔ "جب جب اپنی شکل دیکھو۔ تمہیں یہ دکھائی دیتا رہے۔"

"مجھے تم دکھائی دیتی ہو افق۔ ایسی باتیں تو تم کرتی تھیں۔ اب میں کر رہا ہوں۔ مجھ میں تم سمائی ہو۔ میں سانس کیسے لوں افق۔ میری سانسیں تم سے جڑ گئی ہیں۔"

اس نے بڑھ کر افق کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ افق دو قدم پیچھے ہوئی۔ وہ اس سے ڈر نہیں رہی تھی۔ بھاگ تو بالکل قطعاً نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے نہیں بھاگے گی۔ یہ ڈر کر بھاگنے کا ہی انجام تھا۔

پانی آئے تو اونچائی پر چڑھ کر جان بچانی ہے۔ عذاب آئے تو سجدے میں جھک کر... انسان حیوان بن کر آئے تو سامنے سے ڈٹ کر...

"میں نے اسے تمہاری اور اپنی ساری باتیں بتا دیں۔ تم کتنی بار میرے ساتھ اکیلی نکلیں۔ کیسے تم دیوانہ وار مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ ساری خاص باتیں بتا کر آیا ہوں اسے افق... آخر کو وہ بھی ایک انسان ہی ہے نا۔ کتنا بھی اچھا ہو گا، فرشتہ نہیں ہو گا۔ وہ تمہاری زندگی میں اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ تمہاری قسمت میں میں لکھا گیا ہوں۔"

اس کے ردعمل پر وہ چونکا۔ ورنہ یہ سب نہ کہتا۔ افق نے اپنے تاثرات بمشکل دبائے۔ جن میں پہلا تاثر غیظ و غضب کا تھا۔

"مجھ سے متعلق مشورہ لینے وہ تمہارے پاس نہیں گئے گا۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے چلا نہ جاتا۔ اپنی بیوی کو میرے ساتھ چھوڑ کر... وہ تمہیں چھوڑ چکا ہے۔"

"اگر وہ مجھے چھوڑتا تو خود یہیں رہتا اور مجھے تمہارے ساتھ چلتا کرتا۔"

"تم بہت خوش فہم ہو افق۔"

"ہو گی۔ جب تک "گمان" نامی آزمائش میں مبتلا رہی۔ فرزام میرے لیے کوئی جنگلی جھاڑی نہیں۔ جسے اکھاڑا اور زمین کسی اور بیل بوٹے کے لیے تیار کر لی۔ تمہاری بھول ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوا بھی تو بھی وہ میرا ہی ہو گا۔ کیونکہ میں اسے اپنا ہی رہنے دوں گی۔"

اس آخری بات سے عدن کو بہت تکلیف ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ زوردار تھپڑ افق کے گال پر مارے۔

"تم سو سال بھی میری راہ میں کھڑے رہو۔ تو بھی تمہیں میری ایک نظر نہیں ملے گی۔ تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھتا نہیں پاؤ گے۔"

کیا ہوا اگر وہ اس مجسم حور کو گھسیٹے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ کاش! وہ پاکستان میں ہوتا۔ کاش! وہ تمام نماد وحشت کردہ ہوتا۔

"تم افق کو پلٹ کر خود کو دیکھتا نہیں پاؤ گے۔" اس کے اندر باہر سائیں سائیں ہونے لگی۔

ایک نے اس سے محبت کی تھی... ایک سے اس نے شادی کی تھی۔

افق کو چھوڑ دیا تھا۔ ماریہ نے چھوڑ دیا ہے۔

ایک کو دھتکار رہا تھا۔ ایک دھتکار رہی تھی۔

افق نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ ضرور رخ موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چال میں تھکن اور دکھ ضرور تھا۔ لیکن اس کی سمت سیدھی تھی۔ اس کا اٹل انداز بتا رہا تھا کہ وہ کب تک بتا رہے کے چل سکتی تھی۔ وہ تاعمر بتا رہے کے چل سکتی تھی۔

عدن وہیں کھڑا رہ گیا۔ افق اپنے پیچھے وہ اندھیرے سمیٹ لائی۔ جو آج ہی کی رات خاص بوسٹن پر اترے تھے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سب ہی بتیاں روشن کر دیں۔ اندھیرا پھر بھی پھیلتا ہی جا رہا تھا۔

اس نے چاہا، بھاگ کر جہاں بھر کی روشنی لے آئے۔ فرزام لے آئے۔ باہر نکلے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر فرزام کو آوازیں دے۔ وہ اس کی پہلی آواز پر نہ پلٹے تو آخری آواز پر ہی پلٹ آئے۔ وہ اسے اٹھا کر دریا میں پھینک دے۔ اسے بچائے بھی نا۔ اسے مر جانے دے۔ لیکن ایسے چھوڑ کر نہ جائے۔

"میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں دریا میں پھینک

دوں۔"

"مجھے؟" اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا۔

"ہاں! تمہیں ہی یار۔۔۔ تمہیں بہلانے سے سب سے نظر بچا کر کنارے سے دھکا دے دوں۔ پھر جھٹ جیکٹ اتار کر خود بھی کود جاؤں اور تمہیں بچالاؤں۔"

"سب سن کر بھی مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"سنو۔ تمہیں اوپر لے جاؤں اور دھکا دے دوں شڑاپ۔۔۔ تم پھر گئیں پانی میں۔۔۔ میں بھی کود اپانی میں اور پھر سے تمہیں بچا کر اوپر لے آؤں گا۔ میں ہیرو بن جاؤں گا۔"

"ہیرو بننے کے لیے؟"

"ہاں! میں بار بار تمہارا ہیرو بننا چاہتا ہوں۔"

وہ اس بات پر دلوں ہنسی۔۔۔ اور خوشی سے اسے کئی راتیں نیند نہ آئی۔ وہ ذہن میں اپنے دریا میں گرنے کی اور فرزام کے ہاتھوں بچائے جانے کی فلم چلاتی رہی۔۔۔ ہر بار اس فلم کو چلاتے اسے بہت اچھا لگتا۔ ہر بار اسے اس فلم کے ہیرو پر انوکھے انداز میں پیار آتا۔

محبت ان پر بہت سے الگ الگ لحوں میں وارد ہوئی تھی۔ جیسے اوس۔ بارش کی طرح نہیں برستی۔ نظر بھی نہیں آتی۔ لیکن گیلا کر دیتی ہے۔ نرمی سے۔ محبت کے لیے گائے گئے لوک گیتوں کی طرح بھی۔ جو ان گنت پتیاں رکھنے والے پھول کی طرح الگ الگ جدا جدا ہوتے۔ لیکن سُر اور ردھم ایک ہی رکھتے ہیں۔

اگر وہ دریا میں کود جائے تو کیا وہ کہیں سے بھی آجائے گا۔

"ہاں۔۔۔" افق جانتی تھی۔ ایسا جاننا، جس کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ جس یقین کے پیچھے ہی شک چلا آتا ہے۔

"میں تمہیں بہت یاد کرتا رہا۔" ایک دن وہ اسے ہر دو منٹ کے بعد فون کر کے کہتا رہا۔

"بارش ہو رہی ہے۔ بہت بدصورت سی بارش ہے۔ مجھے تو اچھی نہیں لگ رہی۔ ہوا ایسے چل رہی ہے کہ دل بیٹھا جارہا ہے۔ جانے کیوں۔ اور پھول ہاں صرف پھول ہی پیارے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے سارے امریکی گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ سڑک پر مجھے چلنے کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ اف! یہ امریکی۔۔۔ اف! یہ لڑکے لڑکیاں۔۔۔ اف افق۔۔۔ ہاں! میں بھیگ رہا ہوں۔۔۔ نہیں! میں آئس کریم نہیں کھاؤں گا نہیں بیٹھنا مجھے کہیں۔ مجھے یہ سب نہیں چاہیے اپنا نام تو تم لے نہیں رہیں۔ میں بھی نہیں لوں گا۔ مجھے اب افق نہیں چاہیے 'وہ دیکھو ذرا۔ ایک گندی سی لڑکی نے مجھ جیسے معصوم سے لڑکے پر کولڈ کافی انڈیل دی ہے۔ وہ اب اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ اسے اس کا گلا دبا دینا چاہیے۔ میں تمہارا گلا دبا دوں گا افق۔ یاد رکھنا۔"

ہولے ہولے الہام کی سی صورت لیے محبت ان پر اترتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مقید ہوتے گئے۔

وہ اسے فون کر رہی تھی۔ لیکن اس کا فون بند تھا۔ اس کے بیڈ روم کی کھڑکی کے ساتھ وہ ٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جس راستے سے اسے آنا تھا اس پر نظریں گاڑے۔

واقعات تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ محبت کا جو معجزہ رونما ہو چکا تھا وہ اپنا اثر رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا فرزام ضرور آئے گا۔ ایسا یقین جو خود کو خود ہی کروایا جاتا ہے۔۔۔ جو پانی پر بنے بلبلے سا ہوتا ہے۔ اس کے پاس یقین کے کئی دھاگے تھے۔ وقت ہی ثابت کرنے والا تھا کہ کون سا دھاگا کتنا مضبوط ہے اور ٹوٹ جانے کے لیے کتنا نازک۔

وہ بہت زیادہ رونا چاہتی تھی۔ ہر وہ حربہ آزمانا چاہتی تھی۔ جس سے اس کی زندگی میں فرزام کے ہونے پر آنچ نہ آئے۔

جب وہ امریکا آرہی تھی تو اماں نے کہا۔ "میری بیٹی بہت خوش قسمت ہے۔"

"امریکا جارہی ہوں اس لیے؟" وہ مسکرائی۔

"تم فرزام کے پاس جارہی ہو اس لیے۔"

اس نے اپنے ویزے کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ دو بار اس کے ویزے پر مختلف اعتراضات لگ چکے تھے اور دونوں بار وہ کئی گھنٹے روتی رہی تھی۔ اس نے فرزام کو نہیں بتایا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہاں آنے کے لیے اس سے ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی۔ چیزیں پھسل پھسل کر اس کے ہاتھوں سے گر جاتی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ فرزام کے پاس آخر کار جارہی ہے۔ آخر کار اس کے عین سامنے بیٹھ کر اسے دیکھ سکے گی۔ اسے سن سکے گی۔ جہاز میں بیٹھنے تک اسے یقین نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جہاز کریش ہو جائے گا۔ وہ مر جائے گی اور آخر کار وہ کبھی بھی فرزام سے نہیں مل سکے گی۔ بوسٹن ایئرپورٹ پر اس کے کاغذات رد کر دیے جائیں گے۔ ان پر کوئی نیا اعتراض اٹھے گا۔ اسے وہم تھا کہ اس کے اور فرزام کے درمیان ضرور کوئی آئے گا۔ وہ عدن ہو گا اسے گمان تک نہ تھا۔ اس طرح بنے گا اسے خیال تک نہ آیا۔

"فرزام۔۔۔" اس نے سسکی سی سرگوشی کی اور پھر وہ یہی سرگوشیاں کرتی ہی رہی۔

☆ ☆ ☆

ایک غیر معروف علاقے۔ ایک غیر معروف سڑک کے کنارے سے ذرا آگے وہ ایک ڈھلان نما جگہ پر دونوں گھٹنوں پر بازو ٹکائے بیٹھا تھا۔

"فرزام۔۔۔"

زندگی کے نشانات ذرا دور ہی معدوم ہو جاتے تھے۔ وقفے وقفے سے سڑک پر سے کوئی نہ کوئی گاڑی معتدل کی رفتار سے گزر جاتی تو زندگی کے شواہد زندہ ہو جاتے۔

یہاں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کی کوشش کی تھی۔ "افق جائے بھاڑ میں" سوچ کر۔

اس سے کھانا نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے کافی پینے کی کوشش کی اور کافی ٹھنڈی ہوتی رہی۔

وہ ایک بار میں بھی گیا۔ وہ خود سے بے خود ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ سوچے جارہا تھا۔۔۔ سوچے جارہا تھا۔ وہ اسے سلا دینا چاہتا تھا۔ وہ ہر اس زبان کو بند کر دینا چاہتا تھا۔ جو اس سے ہزاروں طرح کے سوال کر رہی تھی۔ اسے اکسا رہی تھی۔ بہلا رہی تھی۔ تکلیف دے رہی تھی۔ اتنے سارے سوال جو اس کے اندر اٹھ رہے تھے۔ اس کے پاس ان سب کا جواب نہیں تھا۔

آرڈر دے کر وہ اٹھ گیا۔ واش روم جا کر وہ بلاوجہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔ وہ کر کیا رہا ہے۔ کل اس کی زندگی کچھ اور تھی۔ آج کچھ اور تھی۔ کل تک ہی جو تھی وہی زندگی تھی۔

اسے افق پر غصہ تھا۔ وہ اس پر بے حد ناراض تھا۔ اس کی شوخی جاتی رہی تھی۔ وہ بد تمیزی کی حد تک بد مزاج ہو گیا تھا۔ یہی تجویز کردہ سزا تھی۔ اس کی طرف سے افق کے لیے۔۔۔ وہ بدلہ بھی ہوا تھا اور افق کو ایک تھپڑ بھی مارنا چاہتا تھا۔۔۔ اور یہ سب۔ بس یہاں تک ہی تھا۔ وہ افق کو نکال باہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"بیوی وہ تمہاری ہو گی۔ محبوبہ وہ میری ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

ایسے لفظوں کی بازگشت پر وہ اس وقت گھر سے باہر نہ ہوتا تو کہاں ہوتا۔

"میں اس کی جان ہوں۔ مجھے یقین ہے اتنے سال اس نے میری گمشدگی کا سوگ ہی منایا ہو گا۔ اس جیسی لڑکیاں محبت کے نام پر کھیل نہیں کھیلتیں۔۔۔ یہ وہ عورتیں ہوتی ہیں جو محبت کے نام پر جو پودا لگاتی ہیں اسی کے نیچے اپنی قبر بناتی ہیں۔"

فرزام نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ بار بار اپنا ذہن جھٹک رہا تھا۔ وہ افق کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی پر سکون جگہ پر جا کر اپنے ذہن کو سلا دینا چاہتا تھا۔ اسے خیال سا آیا۔۔۔ زندگی صرف دو دن پیچھے چلی جائے تو وہ افق کو لے کر کہیں چلا جائے۔ اس نے اس انسان کی یہ سب باتیں نہ سنی ہوتیں۔ جو اب اس کے ہر یقین کو بے یقین کر رہی تھیں۔

وہ افق کو جانتا تھا۔ اس جاننے کو وہ اب بھول رہا تھا۔ وہ افق سے محبت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس پر اس کا یقین کھو گیا تھا۔

اسے عدن کی کہی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔ وہ بکواس کر گیا تھا۔ وہ مکار ہے۔ وہ افق کا اہل ہے۔ وہ انہیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو صرف حقیقت بیان کر گیا۔ وہ افق کو چاہتا ہے۔ وہ افق کی ترجمانی کر گیا ہے۔ وہ...

پہلے کو رد کرتے۔ دوسرے سے سر اٹھاتے خیالات اس کے اندر جنگ کی حالت میں تھے۔ اس کی عقل عروج و زوال کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

روی گئی تو وہ روتا رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا "اسے فون کرے اور اسے بتائے "کہ ایسے آکر چلے جانے سے... ایسے اپنا کر چھوڑ دینے سے کیا کیا ہوتا ہے۔"

لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ وہ روی کی محبت کو روی سی محبت کو دوبارہ زندگی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔

افق جا رہی ہے تو اس کی جان کیوں نکل رہی ہے۔ اب وہ روئے گا نہیں۔ اب وہ مر جائے گا... کیا نیا ہوگا... جانے کتنے چلتے پھرتے اپنی لاش لیے پھرتے ہیں۔

So good bye

please! dont cry

(اچھا تو پھر الوداع... دیکھو رونا نہیں)

اسے یہ ساعت منحوس لگی Houston

Whitney کے اس الوداع کا یاد آنا منحوس سا لگا...

تو کیا وہ افق کو الوداع کہہ آیا ہے؟ کیا محبتوں میں ایسے الوداع کہہ دینا جائز ہے؟

"I will always love you"

اس نے افق کا ہاتھ اپنے شانے پر رکھا...

Whitney کے سائن کی تھو اپر پارٹی میں انسٹرومینٹل (Instrumental) عشق کو بست سوں نے زندہ جاوید کیا۔ وہ مبہوت دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے اسے معلوم نہیں تھا۔ محبت رقص کی کیفیت میں ایسے بھی فسوں جگاتی ہے۔ دراصل جس دل کے اندر محبت در آنے لگی ہو اسے ہر چیز رقصاں نظر آتی ہے۔

If i should stay

I would only be

in your way...

"تم مجھے گرا دو گی... کاش! تم کبھی ایک کام تو میری خوشی کے لیے کر سکو۔"

اس نے اس کی کمر میں بازو حمائل کیے۔ اور اس کے رنگ بدلتے حسن کو دیکھنے لگا۔

وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ وہی شہزادی تھی ناں جو سب سے چھپ کر اپنے شہزادے کے لیے میٹھے میٹھے گیت گاتی ہے' بالکنی میں کھڑی ہوتی ہے' چاند کو دیکھتی ہے اور جنگل میں نکل جاتی ہے۔ اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس۔ سارا ہار سنگھار کیے... میٹھی آواز میں ترنم سے اسے بلاتی ہے۔ اسے ڈھونڈتی ہے اور جب اس کا محبوب آجاتا ہے تو چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہے اور اگر وہ اس کے بالوں کی ایک لٹ کو ہی چھو لیتا ہے تو کانپ کر بھاگ جاتی ہے۔ اور پھر رات بھر مسکراتی رہتی ہے۔

"ویسے ایسے کرنے میں تمہارا کیا جاتا ہے افق؟" وہ اسے دکھا رہا تھا کہ وہ صرف مذاقاً" ہی یہ سب کر رہا تھا جبکہ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں انگریز نہیں ہوں۔ مجھے ڈانس نہیں آتا۔" شہزادی ڈر گئی۔

"انگریز ہونے سے رقص نہیں آتا۔ محبت ہو جانے سے آتا ہے۔ کیا تم نے دیوانوں کو رقص کی کیفیت میں نہیں دیکھا..." وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ عشق میں جھوم جانے کی کس کیفیت میں وہ تھا۔

So i'll go but i know

I'll think of you every step

(اور میں چلا ہی جاؤں گا... اور ہمیشہ ہر موڑ پر تمہیں ہی سوچوں گا)

وہ بیٹھا تھا۔ وہ افق کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

So good bye

Good bye

(اچھا تو پھر الوداع... الوداع)

اس سب کا حساب کرنے میں کہ ان کی زندگیوں میں یہ سب کیا ہو گیا۔ بہت وقت نہیں' بہت حوصلہ چاہیے تھا۔ اس میں یہ حوصلہ ابھی نہیں تھا۔

"کتنی ہی سڑک کے کنارے بیٹھے "افق' عدن سے محبت کرتی ہے؟" سوچ آتے ہی اس کا جی چاہا "کسی کار کے سامنے آجائے یا خود کو نوچ ڈالے۔

لیکن کیوں؟ جب بات ہی ختم ہو گئی۔ وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ بس سب ٹھیک...

سر کو تھام کر وہ اس "سب ٹھیک" کو لے کر بیٹھا کیوں ہے۔ کسی آرام دہ جگہ پر جا کر آرام کیوں نہیں کرتا... جہاں وہ بیٹھا تھا' وہ جگہ کھسک رہی تھی۔ وہ بیٹھا تھا' وہ جہاں جہاں افق کو خود میں سے جھٹک کر کھڑا ہوگا' زمین اس کے وجود کے نیچے سے کھسکے گی... افق نہ ہوئی تو اس کے پاس کیا رہے گا؟ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

افق نے اسے ایک شلوار سوٹ خود ڈیزائن کر کے دیا تھا۔ صرف خاص اس کے لیے۔ جس کے ساتھ سیاہ رنگ کی مردانہ شال بھی تھی۔ جس الماری میں اس نے وہ شلوار سوٹ ہینگ کیا تھا۔ اسے وہ کھول کر رکھتا تھا۔ ایسے ہی آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں کیل ٹھونک کر اسے لٹکا لیا۔ احمد کی تھیم پارٹی میں وہ پہن نہ سکا۔ اس پر کچھ بھی گر سکتا تھا۔

ایک ہندوستانی ہم جماعت کی شادی میں پہننے کے لیے اس نے ایک گھنٹہ لگا کر اچھی طرح استری کیا اور پھر اسے خیال آیا کہ روایتی ہندوستانی کھانوں میں سے اگر اس پر کچھ گر گیا تو... اس داغ کو کون مٹائے گا۔ اگر داغ نہ مٹا تو...؟

جمعہ کے دن سوٹ کو پہن کر وہ کمرے میں ہی بیٹھا رہتا پایا۔ جب وہ کلاس پڑھانے کے لیے اٹھا تو واپس اپنے پرانے لباس میں آگیا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد ہی۔

پھر اسے وہ سوٹ کب پہننا چاہیے؟ اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔ بیڈ کے عین سامنے کی دیوار پر وہ افق کے آنے سے پہلے تک لٹکا رہا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کے روم روم میں چراغ جل اٹھتے۔ وہ اس کے لیے دیپک راگ بن گیا۔ الہامی محبت اسے مکمل کرتی جا رہی تھی۔ اپنے احساسات کی مختلف اشکال پر وہ خود ہی فدا ہوتا جا رہا تھا۔

کون ہے جو محبوب بننا نہیں چاہتا؟

کون ہے جو محبوب کو پانا نہیں چاہتا؟

محبت کی دھن سب کو ہی نچا ڈالتی ہے۔

اب جو کچھ اس کے اندر جل چکا تھا۔ وہ بجھا تو وہ مر جائے گا۔ کیا ابھی بھی شک تھا... ابھی بھی کوئی شک تھا فرزام کو...؟

"میں خود چھوڑ دوں گا افق کو..." وہ بلند آواز سے بڑبڑایا۔ تاکہ خود کو پکا کر سکے۔ اپنی زبان سے اپنے دل کو سنا رہا تھا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اب اگر کسی رشتے' تعلق سے اسے صدمہ ملا تو وہ اس کی جان لے لے گا۔ وہ اس کی جان لے رہا تھا۔

وہ افق کو چھوڑ دے گا۔ یعنی اپنی جان دے دے گا۔

دو بار اس نے روی کو وقفے وقفے سے فون کیا تھا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

"معلوم ہے تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔"

"غلط معلوم ہے۔ خدا نے اسے فرصت سے نہیں بنایا۔ خدا نے اسے اپنی بے پایاں محبت سے بنایا ہے۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم مجھے نکال باہر نہ کرتیں۔ اگر تم سب وہ نہ کرتیں تو میں خدا کا اتنا شکر گزار نہ ہوتا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے روی! خدا کی رحمت کسے کہتے ہیں۔ مجھ پر وہ افق کے نام سے نازل کی گئی۔"

"رحمت کو زحمت بنتے دیر نہیں لگتی..."

"تم بددعا دو تو بھی ایسا نہیں ہو سکتا... کبھی

نہیں ہے۔"

"تم خوش گمان رہو تو بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو چکا ہے روی۔ کاربن کاپی کے بجائے کائنات کے مصور نے مجھے اصل تصویر تھمادی۔ اس تصویر کا عنوان "افق" ہے۔ اس تصویر کا خالق خدا ہے۔ اس تصویر کا مالک فرزام کو بنایا گیا ہے۔" وہ خوش ہو رہا تھا۔ ان گزرے سالوں میں وہ بہت خوش رہا تھا۔ کپلز ڈانس کے دوران اس نے ایما کو انکار کر دیا۔

"میں کسی اور کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کس کا۔؟" وہ سمجھی کسی اور ہم جماعت کا۔

"ویل۔ کوئی بہت ہی خاص۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

"وہ بہت ہی خاص" کیا رملہ بعد امریکا آسکی۔

جو دل ہوتا ہے نا یہ مکمل وجود سے پرے الگ کسی اور ہی مقام پر موجود ہوتا ہے۔ اسے فرق نہیں پڑتا باقی کے وجود نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ اس دل کے مقام پر باقی کا وجود چاہ کر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

اس نے یاد کرنا چاہا کہ وہ اس سے محبت کرتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ گہری ہوتی رات میں وہ گہرائی میں ڈوب چکا تھا۔

البتہ اسے وہ وقت ضرور یاد آرہا تھا، جب وہ ایک پتلا بنی ان کے پاس کام کیا کرتی تھی۔ ایک ایسا پتلا جسے یہ تو معلوم تھا کہ اسے کام کرنا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خوشی کیسے ہوتا ہے۔ ہوتا بھی ہے یا نہیں اور.... ہوتا بھی کیوں ہے؟؟

وہ ایک سوالیہ وجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی کئی سوال جاگ اٹھتے۔

"وہ اس سے محبت نہیں کرتی۔" فرزام کو یقین سا ہوا.... شکوک و شبہات کے بادل میں وہ پور پور ڈوب چکا تھا۔ عدن کا زہر اثر دکھا رہا تھا۔

ایک گہرا سناٹا پھٹ کر پھیلا۔ سرد کی ایک گہری تیز لہر اس کے وجود میں لہرا کر پھیلی۔

خودکشی کرنے والا آخری بار تو سوچتا ہی ہوگا۔ آخر یہ موت ہی کیوں؟

مارنے والا نہ جانتا ہو۔ مرنے والا تو جانتا ہی ہے کہ وہ مر رہا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بوسٹن میں رہنے والے دو لوگوں پر ایک ہی قیامت جدا جدا مقامات پر ایک ہی انداز سے گزر رہی تھی۔

فرزام نے سر کو جھٹکا۔ کوشش کر کے بھی وہ دل کو نہ جھٹک سکا۔ ایسی کوشش بار بار کرنے سے بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسی کوششیں بار بار کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی جاتی نا۔

منگنی ٹوٹ جانے پر وہ دس بار روی کے پاس گیا تھا۔ محبت کے ٹوٹ جانے پر اسے ہزار بار تو جانا ہی چاہیے۔

اس نے کار اسٹارٹ کی۔

اسے تا عمر جاتے رہنا چاہیے۔ ایک محبت کے لیے۔ صرف اتنا کرنے میں کیا جاتا ہے؟

☆ ☆ ☆

عدن اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے بس میں بیٹھا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ بس میں بیٹھا ہے۔ اس کا مطلوبہ اسٹاپ آکر گزر چکا ہے۔ آخری اسٹاپ پر اسے اترنا ہی پڑا۔ اسے پھر معلوم ہوا کہ وہ کتنی دور آچکا ہے۔ وہ اتنی دور کیسے آگیا۔ اسے معلوم کیوں نہ ہوا؟ اسے واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ ایسی جگہ جانے کی۔ جہاں اس کے سونے کے لیے ایک بستر موجود ہے۔

صرف سونے کے لیے ہی گھروں کو کون جاتا ہے؟

وہ چلتا جا رہا ہے۔ کہیں تو وہ رک ہی جائے گا۔

چند دن پہلے وہ بن ٹھن کر ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ اس کے باپ کے پاس بھی جانا چاہتا تھا۔ وہ انہیں دکھانا چاہتا تھا کہ وہ باہر آچکا ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ وہ انہیں ذرا سا ڈرا بھی دینا چاہتا تھا کہ اس کے اس طرح جیل جانے پر ان کے رد عمل کو وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ کبھی بھی انہیں چوٹ ضرور پہنچائے گا۔

ماریہ تین چار مزید شادیاں تو کر ہی چکی ہوگی۔ اسے دیکھ کر ضرور پچھتائے گی۔ عدن جیسے قابل ڈاکٹر کو اپنے ہاتھ سے جانے دیا۔ باہر آہی گیا نا۔ کیوں طلاق لی۔ اس کا باپ ضرور ہاتھ ملے گا۔ نشہ کر کر کے کہیں مر ہی نہ گئی ہو۔

اس نے زیر لب گالیاں دیں۔ خالصتاً "وہی گالیاں جو اس پر تشدد کرنے والے دیا کرتے تھے۔ ان گالیوں کے لائق صرف ماریہ ہی تھی۔

اسے شک تھا کہ وہ اگر زندہ ہوئی تو اسے امریکا میں نہیں ملے گی۔ عزیز کا کہنا تھا کہ وہ ایک لمبے عرصے کے لیے امریکا چھوڑ گئے ہیں۔ آغا کو اس نے تلاش کیا تھا وہ بوسٹن میں ہی تھا۔ ماریہ سے متعلق کوئی خبر نہیں ملی تھی اسے۔

وہ اپنے طور اس کے گھر گیا۔ وہ گھر بک چکا تھا۔ ناچار اسے آغا سے بات کرنی پڑی۔ اسے پہچان کر وہ چپ رہے۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"ماریہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایسے کہا جیسے اگلے الیکشن میں وہ گورنر کی سیٹ کے لیے کھڑا ہونے والا ہے۔ فارغ وقت میں وہ ماریہ سے بھی مل لینا چاہتا ہے۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ وہی اس کے فرعون صفت سابق سسر کی عظیم عادت۔

دس منٹ بعد اسے دوبارہ فون کیا گیا۔ ماریہ کے گھر کا پتا لکھوایا گیا۔ وہ خوب ہنسا۔ یعنی اس گری ہوئی لڑکی کو پھر اس کے سامنے کیا جا رہا تھا۔ پھر سے اسے علاج کی ضرورت ہوگی۔ اس بار وہ اسے اس کا نفیس خلاصہ ضرور سنا آئے گا۔

وہ ٹیکسی سے گیا تھا اور گھروں کے نمبرز پڑھ رہا تھا۔ پھر اسے یہ ضرورت بھی نہ رہی۔ ایک بڑے گھر کے سامنے بنے کھلے اور وسیع لان میں اسے ماریہ کھڑی نظر آگئی۔ وہ پودوں اور پھولوں کے ساتھ مصروف تھی اور ایسے مصروف تھی۔ جیسے یہ دنیا کا مقدس ترین کام ہو۔

قریب ہی گھاس کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک دو ڈھائی سالہ بچہ زور آزمائی کر رہا تھا۔

"ماریہ۔" گھر کی روش پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔

ماریہ پلٹی۔ اس کا حسن۔ اف! اس کا وہ بے مثال حسن۔ عدن نے جھرجھری لی۔

امریکن میگزین میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہننے والی۔ ڈانس فلور پر جم کر ناچنے والی کا حسن نہیں تھا وہ۔ بار میں کبھی اس کی بانہوں میں، کبھی اس کی بانہوں میں۔ کبھی اس کونے میں، کبھی اس کونے میں۔ یہ وہ حسن نہیں تھا۔ جس کو دیکھ کر خباثت سے آنکھ ماری جائے۔ نہیں۔ اب اسے دیکھ کر یہ جرأت نہیں کی جا سکتی تھی۔

"اوہ عدن۔" وہ فوراً اس کی طرف آئی۔ سیاہ فام بچہ بھی ماریہ کے ساتھ اس کی طرف لپکا۔

"میرا خیال تھا، تم ایک دو دن میں آؤ گے۔ پاپا نے فون کیا تھا۔ آؤ! اندر بیٹھو گے۔ آجاؤ! اندر ہی چلتے ہیں۔" پلٹ کر اس نے بے بی کٹ اٹھایا۔ جس میں اس کی شباہت لیے ایک بچی آنکھیں کھولے دراز تھی۔

"فلورا۔" اندر داخل ہوتے ہی اس نے آواز دی۔

میڈ کچن میں سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں فیڈر تھا۔ جو ماریہ نے لے لیا۔

"ابراہیم ابھی اور کانٹ چھانٹ کرنا چاہتا ہے آپ اس کے ساتھ رہیے۔"

ماریہ اسے اپنے ساتھ لیے سٹنگ ایریا میں آگئی۔

"صرف پندرہ منٹ لگیں گے سارہ کو سونے میں۔ تمہیں اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"ایک سیاہ فام ہے۔ ایک سفید فام.... کتنے شوہر بدل چکی ہو ماریہ۔ یا۔"

وہ اس کے سامنے صوفے پر آکر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے لفظوں کا پہلا طمانچہ ماریہ کو مارا۔ نفیس خلاصے کی پہلی سطر۔

ماریہ کے چہرے کے رنگ بدلے اور صاف نظر آنے لگا کہ وہ خود کو قابو میں رکھنے کے لیے دل ہی دل میں کچھ دہرا رہی ہے۔ ذرا سی دیر بعد وہ مسکرائی اور اس کی طرف کامل اطمینان سے دیکھا۔

"میرا خیال تھا تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔" وہ پھر ایسے مسکرائی۔ جیسے عدن کی بیوی ہوتے تو کبھی نہیں مسکرائی تھی۔

"بیسٹ" اس نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جس دیوار کو دیکھ کر عدن پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔

"جس نے بڑا سا ہیٹ پہن رکھا ہے۔ طلال ہے اور اس کے ساتھ جو پنک شرٹ میں ہے وہ زکریا ہے۔ دونوں اس وقت اسکول میں ہیں۔ ورنہ تم دیکھتے کہ یہ تمہیں کبھی اتنے سکون سے بیٹھنے نہ دیتے۔" جن کی طرف وہ اتنے اطمینان سے اشارہ کر رہی تھی۔ وہ بھی سیاہ فام ہی تھے۔ ایک کی عمر تقریباً نو سال تھی اور دوسرا سات آٹھ سال کا ہوگا۔

عدن حیران ہوا۔ دیوار دس پندرہ تصویروں سے ایک ہی جگہ سے بھری ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں ماریہ اور ایک اسمارٹ سا لڑکا مسکراہٹ دبائے کھڑا تھا۔ صرف اسی تصویر کو عدن نے ذرا سی دیر کے لیے دیکھا تھا۔

"ہوگا موجودہ بوائے فرینڈ۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔ بچوں کی تصویروں کے بارے میں اس نے کوئی بھی خیال دوڑانے کی کوشش نہیں کی۔

"یہ جمل ہے۔" اس نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ جو گرل فش دم سے پکڑے کھڑا تھا اور ماریہ کھلا منہ فش کی طرف بڑھا رہی تھی۔

"ریکس کی جگہ اب جمل نے لے لی۔" عدن نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی اور جیسے باپ بیٹی ٹانگ ہلایا کرتے تھے۔ ویسے ہی اپنی ٹانگ ہلانی شروع کر دی۔ مطلب ہش ہش۔

"میرے شوہر۔" ماریہ کے انداز میں فرق نہیں آیا تھا۔

"اس وقت یوگنڈا میں ہیں۔ ورنہ تم ضرور جمل سے مل کر خوش ہوتے۔"

"شوہر۔" اس نے بلند آواز میں بلند قہقہہ لگایا۔ "تم شوہر پالنے کا تردد کیوں کرتی ہو ماریہ؟"

ماریہ کا رنگ فق ہو گیا۔ عدن نے خوب مزا لیا۔ ہاتھ بڑھا کر فریش جوس کا گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔

"شادی کرنے کا تردد تو میں نے تم سے کیا تھا۔ شوہر تو مجھے اب ملا ہے۔ بیوی تو مجھے اب بنایا گیا ہے۔"

"اسے کب تک چھتا کرو گی ماریہ؟" عدن پھر سے ہنسنے لگا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ٹوٹنے تعلقات ہیں۔ محبت نہیں۔"

اس بات پر وہ اتنی دیر تک ہنسا کہ تھک کر بے دم ہو گیا۔

"محبت۔ ماریہ! محبت۔ تم محبت لائق چیز نہیں ہو۔ تم ناچنے گانے۔ لڑکھڑانے تک ہی ٹھیک ہو۔"

وہ اٹھی اور جمل کی تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ "جمل کا کہنا ہے میں وہ قسمت ہوں۔ جو زندگی کے لیے مل گئی۔"

"ہاہاہا۔ اور تم بہل گئیں۔"

"میں ایمان لے آئی۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے بولی "اسے دیکھ چکی تھی۔ اسے سن چکی تھی۔ اس لیے ایمان لے آئی۔"

عدن تمسخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ جیسے کامیڈی ڈراما سمجھ کر ابھی تالیاں بجائے گا۔

"ہالی ووڈ کی کس فلم کا ہیرو ہے تمہارا یہ موجودہ شوہر؟"

ماریہ اس کے انداز پر ٹھٹکی۔ پھر اس نے سمجھا اور جانا کہ وہ کس حد تک جمل کی ہتک کرنے والا ہے۔

"امریکا کے بڑے بزنس ٹائیکون کا بیٹا ہے جمل۔ اس وقت نائیجیریا میں ہے۔ وہاں جلدی امراض کی ایک وباء پھوٹی ہے اور وہ ہر صورت وہاں رہنا چاہتا تھا۔"

"اسے بھی تمہاری طرح شہرت کا شوق ہے؟"

"وہ چھوت کی بیماریوں کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے زخم صاف کرتا ہے۔ تکلیف سے کراہتے بچوں کو اپنی آغوش میں رکھتا ہے۔ وہ ان کے وہ وہ کام کرتا ہے، جو تم سے قابل ڈاکٹر کرنے سے پہلے ناک ڈھانپ لیتے ہیں۔ مجھ سے غیر انسانی لوگ منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ ناک نہیں ہاتھ نہیں کھینچتا۔ تیسری دنیا کا ایک چھوٹا موٹا ملک خرید لینے کی استطاعت رکھنے والا جمل یہ سب کرتا ہے عدن۔ شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا میری خوش قسمتی کا۔ ایسی قسمت کہ جمل میرا شوہر ہو۔ ہاتھ جوڑ کر یہ خوش قسمتی میں نے خدا سے مانگی تھی۔ یہ زخم صاف کرنے والے کی میں نے جا کر منت کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے بھی بیمار گارہی سمجھ لے اور میرا زخم، زخم صاف کرنے۔ صرف اتنا ہی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں نے خدا سے پہلی بار دعا کی کہ وہ مجھے جمل دے دے۔"

نشے میں بدمست ہو کر ہر بات پر گالی نکالنے والی خدا کا نام لے رہی تھی۔ دعا کرنا سیکھ گئی تھی۔

عدن پھر ہنسا۔ اس بار اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس پر ہنسا۔ وہ اس کے گھر میں بیٹھا تھا۔ جس کی آرائش گواہی دے رہی تھی کہ یہاں ایک خاندان آباد ہے۔ یہاں کچھ لوگ محبت سے رہتے ہیں۔ گھر خوب صورت تھا۔ سجا ہوا تھا۔ لیکن وہ نمائش کی کوئی دکان نہیں لگ رہا تھا۔

بات ختم کر کے ماریہ خاموشی سے عدن کو دیکھنے لگی۔

"لنچ تیار ہے عدن!"

وہ چونکا۔ وہ انکار کر کے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کرہا کر اٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر اور اس گھر میں گزارنا چاہتا تھا۔

ماریہ ابراہیم کو کھلاتی رہی۔ وہ اتنے نخرے کر رہا تھا کہ عدن کا جی چاہا اس کی کرسی الٹ دے۔ وہ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔

"تمہیں کہاں سے اٹھایا ہے؟" عدن نے انگلش میں اتنی بے رحمی سے کہا کہ ابراہیم ایک دم چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ غصے سے ماریہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

"تمہیں اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ سچ نہیں۔ جگہ جگہ سے اٹھا کر انہیں گھر میں لا رکھا ہے؟"

ماریہ نے ایک نظر ابراہیم کی طرف دیکھا اور اس کے گال چومے۔

"یہ ہمارے بچے ہیں صرف۔ یہ ہمیں خدا کی خاص رحمت سے ملے ہیں۔ وہ توفیق، جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے۔"

اتنے کرارے جواب پر عدن بدمزہ ہو گیا۔

"تو اب چیریٹی کر کے سکون حاصل کرتی ہو؟"

"جمل مجھے مل چکا ہے۔ سکون کی تلاش نہیں ہے مجھے۔ سکون کی تلاش چند سال پہلے تھی۔ اسی تلاش کا انعام ہے جمل۔ تم کب کر رہے ہو سکون کی تلاش؟"

"میرے پاس بہت سکون ہے۔" نیپکن سے ہونٹ صاف کیے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکا دیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ عدن اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔

"مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

وہ اس پر تھوکنے کے لیے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری دھتکار کے لیے۔ عدن کا جی چاہا اپنی حسرت پوری کر ہی لے۔ ڈرگز کا کیڑا اب کیسے بن ٹھن کر بکواس کر رہا تھا۔

"اپنے لیے سکون کی تلاش جلد ہی کر لو۔"

"عالمہ بھی بن گئی ہو یا نن۔ مجھے تو ٹھیک سے تمہارے مذہب کا بھی نہیں معلوم۔" یہ بات وہ کہہ رہا تھا۔ جسے ٹھیک سے اپنے مذہب کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

"رب العالمین سے اپنے لیے دعا کرو۔"

"خدا کے نام بھی سیکھ لیے ہیں۔؟"

"نماز پڑھا کرو۔"

"نیک بھی ہو گئی ہو۔ اتنا حیران مت کرو۔"

"لوگوں پر رحم کیا کرو۔"

"تم تو فرشتہ بن گئی ہو۔"

"اپنے گناہوں پر توبہ نہیں کر سکتے تو شرمندہ ہونا ہی سیکھ لو۔"

"شیخ اور رئیس کے علاوہ کتنوں کا نام لے کر توبہ کی تھی تم نے؟"

"توبہ کرو تو اس یقین کے ساتھ کرو کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔"

"تم تو حیران کر رہی ہو' وِسکی' شراب کے ذائقے بھول گئی ہو؟"

"حرام سے ہر حال میں بچ کر رہنا۔ خدا سے معافی مانگو۔ وہ سب دیتا ہے۔ تیونس کے خیراتی اسپتال کے غلیظ سے اسٹور روم میں روتے بھی اس نے مجھے سن لیا۔ ہر طرح کے حرام کو چکھ چکی میری زبان کو بلکتے اس نے مجھے سنا۔ یقین جانو ایسا ہوا۔"

"بند کرو اپنا یہ وعظ۔" عدن اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ میرے لیے یہ فرض کبھی کسی اور نے ادا کیا تھا۔ افریقہ کے صحراؤں میں۔ تمہارے لیے میں ادا کر رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ مشفق سی وہ عدن کو بہت پیاری لگی۔

وہ اس گھر سے جا رہا تھا۔ جانا ہی تھا۔ اور وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ یہیں ماریہ کے سامنے بچھ جائے اور رونے لگے۔ التجا کرے کہ ماریہ اسے کہیں چھپا لے۔ ایسی باتیں کرتی وہ کتنی انوکھی لگ رہی تھی۔ ڈیرے غیرے کے گلے سے جھول جانے والی۔

وہ ماریہ کے قریب آیا۔ اور ہاتھ اس کے گال کی طرف بڑھایا۔ ماریہ دو قدم پیچھے ہوئی حیران ہوئی۔

"مجھ سے دور رہو۔"

"تم میرے لیے ایسی کیوں نہ بنیں ماریہ؟"

"تم جمال کیوں نہ بنے؟ تم خریدنے والوں میں سے نہیں ہو۔ صرف محبت ہی ایک مکمل انسان کو خریدنے کا ہنر رکھتی ہے۔ تم نے یہ ہنر سیکھا ہی نہیں۔"

عدن اکڑ کر چلتا ہوا ماریہ کے پاس گیا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتا ہوا وہاں سے نکلا سو میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ بنانے والے سے اب کوئی پوچھے۔ پیچھے رہ جانا' ہار جانا کسے کہتے ہیں؟

اس نے اگلی کئی راتیں بار میں گزاری۔ کئی طرح کے افسوس آ لگے تھے اسے۔ لیکن وہ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ باتیں' یہ وعظ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ الکحل کو اپنے اندر انڈیلتے ہوئے اس نے سب ہارا۔

افق کو کیسے ہار جاتا؟

خالی ہاتھ رہ جانے والا افق کو کیسے جانے دیتا؟

"ماریہ۔ آخ تھو۔ محبت۔ جمال۔ تھو۔ وہ بچ کیا جانے محبت کیا ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے۔ ننگے میں رہتے میں نے ایک معمولی لڑکی سے محبت کی ہے۔ کسی میں یہ حوصلہ میں نے کی... ڈاکٹر عدن نے۔ جس کے پیچھے ایک عالم پاگل تھا۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔

"ویسے کیسے افق کو چھوڑ دوں۔" کتنا ہی کر جائے کتنا ہی بھگت لے۔ افق کو کیوں یہ چھوڑے وہ؟

"خدا کو مجھے امان دینا ہی ہوگا۔" افق بہت بار کہہ چکی تھی۔

"تم خدا کو میرے لیے اتنا تنگ کرتی ہو؟"

"میں تو التجا کرتی ہوں۔"

"جو ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوتا ہے۔" اس نے انگریزی مثل بیان کی۔

"کیا مطلب ہوا اس بات کا؟"

وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ تو اسے تنگ کر رہا تھا۔

"یعنی کہ اگر تمہارے کہنے پر بھی خدا مجھے تمہیں نہ دے تو۔"

"اتنی بڑی بات۔ اتنی بدشگونی۔" وہ رونے لگی۔

"تو تمہیں کوئی اور مل جائے گا۔ کوئی رکشہ ٹیکسی چلانے والا۔"

"ایسی منحوس بات۔ ایسی۔" وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔

وہ بد شگونی تو اس کے لیے ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا۔ وہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ کاش! وہ ایسی بات نہ کرتا۔ یہ سب اسی منحوس ساعت کی وجہ سے ہوا۔

"کیا افق کی لڑکی ہے؟" چلتے چلتے اس نے فون نکال کر پاکستان کال کی۔

"عدن بیٹے۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ اس کی آواز اور انداز پر گھبرا گئے۔

"آپ کس سے میری شادی کریں گے؟"

"تم پہلے پاکستان تو آؤ۔ بہت لڑکیاں ہیں۔"

"کیا واقعی بہت ہیں؟ ابھی بھی بہت ہیں؟ کیا ان میں کوئی ایک افق جیسی ہے۔ یاد آئی آپ کو افق۔ افق جیسی۔"

غلام علی نے فون بند کر دیا۔ "بدذات۔"

بند فون کو وہ کان سے لگائے رہا۔

"جانتے ہیں آپ وہ کتنی بڑی دھوکے باز نکلی۔ کہتی ہے مجھ پر ایک نظر ڈالنا نہیں چاہتی۔ کہتی ہے مجھ پر محبت واجب نہیں ہوئی۔ اس بات کا کیا مطلب ہے پاپا۔ ماریہ بھی یہی کہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی۔ آپ نے مجھے اس بارے میں بتایا ہی نہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے۔ میں تو ہمیشہ شان سے جیتا ہوں نا۔ اب کیسے میں فیل ہو گیا۔ صرف اسی ایک کھیل میں کیوں۔ میں نے تو جم کر کھیلا تھا۔ پہلے تو افق میری ہر بات کا یقین کر لیتی تھی۔ اب کیوں نہیں کرتی۔ میں نے کتنی بار اسے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے کھونا نہیں چاہتا پاپا! اسے فرق ہی نہیں پڑا۔ کیا اوقات ہے فرزام کی میرے سامنے۔ اندھی ہوئی ہے افق۔ مجھے سننا نہیں چاہتی۔ ایسی بہری پہلے تو نہیں تھی۔ ایسی بہری وہ کب سے ہو گئی؟ وہ نہیں مان رہی۔ فرزام کو چھوڑنے کے لیے وہ نہیں مان رہی۔ میں فرزام کو مجبور کروں گا۔ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ پھر وہ میرے ہی پاس آئے گی۔ فرزام اسے چھوڑ ہی چکا ہے۔" سڑک پر چلتے وہ بہت دیر تک بند فون سے باتیں کرتا رہا۔ اور پھر ایک بار میں بیٹھ کر بڑبڑانے لگا۔

"میں ہر طریقہ آزماؤں گا۔ میں بہت ذہین ہوں میرے پاس بہت سے راستے ہیں۔"

اس کی بلند بڑبڑاہٹ پر ایک دو لوگ اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اتنے بھی حیران نہیں تھے۔ ایسی قسمیں وہاں ہزاروں بار چل چکی تھیں۔

عبادت گاہوں میں بڑبڑانے والوں کو عقیدت کی نظریں نصیب ہو ہی جاتی ہیں۔ انہیں پاگل بھی سمجھا جاتا ہے تو خاص رستے کا پاگل سمجھتے ہیں۔

ایسی جگہوں پر بڑبڑانے والوں کو لوگ مزے سے گالیاں دے جاتے ہیں۔ ٹھوکریں مار جاتے ہیں۔ یہی ان کا رستہ ہے۔

وہ حلق تک شراب انڈیل چکا تھا۔ نشہ تھا کہ آ کر نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی نشہ تھا۔ جا کر نہیں دے رہا تھا۔ افق کے انداز کا۔ وہ ماریہ کو گالیاں بک رہا تھا۔ فرزام کی شان بیان کر رہا تھا۔ لیکن افق کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر سکا۔

ٹھیک ہے' اگر افق چاہتی ہے تو یہی سہی۔ اگر وہ اس کی راہ میں بچھ جائے۔ تو وہ آئے گی اس کے پاس۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ وہ پہلی محبت ہے افق کی... وہ پہلا مرد جس کے لیے اس نے اپنی ذات کے دروازے کھولے۔ افق یہ کیوں بھول رہی ہے کہ امان سے ہی اس کی محبت کی ابتداء ہوئی۔ انتہا بھی امان پر ہی ہونی چاہیے۔ ایک مشرقی لڑکی ہے وہ۔ اس میں ردوبدل کس طرح کر سکتی ہے۔ ایسی محبت کر کے وہ امر ہو جاتی۔ کسی اور کی زندگی میں جا کر اس نے یہ کڑی کیوں توڑی؟ افق کو تو سزا ملنی چاہیے۔ اسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ کسی اور سے محبت کرے؟ اگر اسے یہ حق استعمال کرنا ہی تھا تو پورا پورا اسے امان میں نہیں اترنا چاہیے تھا۔ سارا قصور افق کا ہے۔

فرزام نامی تعلق کو وہ آگ لگا آیا تھا۔ دنیا کو وہ آگ لگا دے گا۔

اس کی ٹانگ پر بھاری جوتے کی ضرب لگی اور ڈوبتی ابھرتی ایک آواز سنائی دی۔

"تم یہاں سے دفعان کیوں نہیں ہو جاتے؟"
کون تھا جو اس کے کان کے پاس غرا رہا تھا۔ عدن نے ہوا میں مکے لہرائے اس کے جبڑے پر ایک زوردار گھونسا پڑا۔ اس نے اٹھنا چاہا اور وہ گر گیا۔ چھناکے کی آواز آئی۔ شاید بہت کچھ گرا۔

اس کے پیٹ میں لاتوں کی بارش ہو گئی۔ وہ بھی ہاتھ پیر ہلا تو رہا تھا۔ ابھی اس میں ہمت تھی۔ وہ مار سکتا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ لیکن اٹھ کر ہر بار وہی گر رہا تھا۔

اس میں بہت ہمت تھی ابھی بھی۔

وہ مار کھا رہا تھا۔ اسے پیٹا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے مخلول سے گیلے ہو چکے تھے۔ جانے کیا کیا کچھ گر گیا تھا اس پر۔ وہ چلا رہا تھا اور جیسے جیسے اس کے چلانے کی آواز بلند ہوتی تھی۔ ویسے ویسے اس کے منہ پر۔ پیٹ میں۔ کمر میں آ کر گھونسے لگتے تھے۔ اسے کئی بار گریبان سے پکڑ کر گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑا کیا گیا۔ گھسیٹا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرتا ہی جا رہا تھا۔ اسے خفیہ جیل خانہ یاد آ گیا۔ وہ حلق پھاڑ کر چلانے لگا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ نہیں ہوں میں دہشت گرد۔ میں۔ پانی دو مجھے۔ چھوڑ دو کتو مجھے۔" اسے پچا گیا۔

"میں دہشت گرد نہیں ہوں خبیثوں۔"
اس کا سر کسی وزنی چیز سے ٹکرایا۔ جلتی بجھتی لائٹس اس کے آگے پیچھے رقص کرنے لگیں۔

وہ کہاں پڑا ہے؟ فٹ پاتھ پر۔ سڑک پر۔ یا کسی گندی سی گلی کی غلیظ سی جگہ پر؟ اور پھر اس کی پروا کسے تھی۔ پروا کرنے والے عدن جیسے نہیں ہوتے۔ وہ عدن کی طرح نہیں ہو جاتے۔

اس کی جیب میں رکھا فون بج رہا تھا۔ اس کا باپ اسے فون کر رہا تھا۔

شاید اب وہ عدن کو کوئی نئی راہ دکھائے۔ زندگی گزارنے کا کوئی نیا گر۔ نئی مشق۔ اب وہ اسے کسی اور میدان کا رنگ ماسٹر بننے کے لیے کہے گا۔ شاید اب وہ کتے بلیوں سے اوپر کا کوئی اور جانور نما انسان اسے سدھانے کے لیے اکسائے۔ وہ عدن کو بتائے کہ اس کا باپ وہ ہے۔ غلام علی غلام۔ عدن اس کا باپ نہیں ہے۔

اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون کی ایک پتلی لکیر کنپٹی سے ہوتی ہوئی بدبودار جگہ میں جذب ہو رہی تھی۔ ایسی ہی ایک لکیر اس کے منہ سے نکل کر اس کے گریبان تک جا رہی تھی۔

اس میں اٹھ کر چلنے کی سکت نہیں اور وہ فرزام کو مار دینا چاہتا تھا۔

شراب پی کر وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور افق کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ امریکی عدالت میں اس کا مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ابھی بھی بہت سوں کو پیروں تلے مسل دینا چاہتا تھا۔

اس کے باپ نے اسے کبھی ہارنا نہیں سکھایا تھا۔ سکندر اعظم بنا اوندھے منہ پڑا تھا۔

جن انسانوں کو وہ پچھاڑ نے گیا تھا۔ ان سے وہ پچھاڑ آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ گریبان نہیں رہا تھا۔

"افق میری ہے۔ فرزام اسے چھوڑ دے گا۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔

وہ ضدی ہے۔؟ نہیں۔
وہ بدنصیب ہے۔؟ نہیں۔
وہ قفل زدہ ہے۔ وہ قفل جو بے جا ہاتھوں پر لگا ہے۔ وہی قفل جسے وہ توڑنا ہی نہیں چاہتے۔

فرزام گھر آیا تو تیزی سے بلڈنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آیا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔

اسے خوشی ہوئی۔ انجانی خوشی۔ رات کے اس پہر۔ اس آخری پہر یہ دروازہ ایسے ہی نہیں کھلا۔ سارا گھر روشن تھا۔ جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ویسا ہی۔ نہیں۔ وہ ویسا بھی نہیں تھا۔ جس عورت کو وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھی اور گھر تک آتے جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ اسے دروازے پر نظریں گاڑے ہی ملے گی وہ وہاں نہیں تھی۔

اس نے سارا گھر دیکھ لیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے بار بار دیکھا۔ حد تو یہ کہ اس نے کپڑوں کی الماری تک کھول کر دیکھی۔

یہ جو وقت گزر گیا۔ یہ صرف ایک وقت نہیں یہ ایک پیمانہ تھا۔ جو انہیں بتا گیا تھا کہ ان کی محبتیں اس پیمانے میں کہاں ہیں۔ کس درجے پر

فرزام نے وہ درجہ دیکھ لیا تھا۔
یہ صرف ایک رات نہیں تھی۔ گھپ رات۔ یہ ایک حساب کتاب کی رات تھی۔ وہ اس میں موجود محبت کا حساب کمال انداز سے کر گئی تھی۔
اسے افسوس ہوا۔ وہ واپس کیوں آیا۔ افق تو جا چکی تھی۔

وہ عدن کے پاس گئی ہے۔ یا وہ اس سے ناراض ہو گئی ہے۔
اس نے خود سے بھی چھپا کر دعا کی کہ وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہو۔ اس کے سارے اعتراضات ابھی بھی اس پر باقی تھے۔ لیکن ایک یہ دل ہے۔ جو اپنے ہی حکم صادر کرتا ہے۔ الگ ہی کھڑا ہوتا ہے۔
فرزام کے پاس افق کے لیے وہی دل تھا۔ وہی دل جو افق ڈھال گئی تھی اپنی طرز پر۔ وہ بار بار اس کے رستے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔
وہ بار بار اس کی منت کرنے۔ گڑگڑانے کے لیے تیار تھا۔

یہ دل جو الگ ہی مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔
پلٹ کر۔ لپک کر۔ افق سے لپٹ جانے کے لیے تیار تھا۔

اعتراضات۔ شکوک و شبہات۔ غصہ' نفرت' سب کا کیا۔ سب ابھی بھی وہیں تھے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ دل بہت تیز ہوتا ہے۔ بہت بھڑیلا۔ وہ اس جنگ میں فاتح رہا۔

بہت دیر گزری۔ فرزام نے سر اٹھایا۔ اسے آہٹ سنائی دی تھی۔ اسے ایسی ہی آہٹ پہلے بھی بہت بار سنائی دی تھی۔ سٹنگ ایریا میں فلور کشن پر بیٹھے میز پر سر جھکائے فرزام نے آنکھوں کو اٹھایا۔

وہاں سامنے افق کھڑی تھی۔ دروازے میں۔
گھر سے پاتال سے وہ اوپر آیا۔ یکدم چھت سے۔
اس کے سارے یقین سچے تھے۔
اس کے سارے شکوک جھوٹے تھے۔
سب دیپ جل اٹھے دیپک راگ آب و تاب سے گونجنے لگا۔
"کہاں تھیں تم۔؟" اٹھ کر بھاگ کر اس سے لپٹنے سے پہلے اس نے یہ پوچھا۔ اسے جواب چاہیے۔ ٹھیک وہی جو ان دونوں کو بچا سکے۔ وہی جواب چاہیے۔
"تمہیں ڈھونڈنے؟" اس پر نظر پڑتے ہی وہ شانت ہو گئی اور فرش پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے بڑے شہر میں وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔ جبکہ جانتی تھی اسے ڈھونڈ نہیں سکتی۔ جو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ایسے ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔
"میں تمہیں ڈھونڈنے نکلی تھی۔"
"یہ مجھے ڈھونڈنے نکلی تھی۔"
ایک نیا لوک گیت محبت کے لیے لکھا جا رہا تھا۔
فرزام چل کر اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل پاس نیچے بیٹھ گیا۔
"میں ہر سانس کے ساتھ تمہاری منت کروں گی۔ آنسوؤں کا ہر رنگ لیے رووں گی۔ فرزام۔ میں تمہیں خود کو چھوڑنے نہیں دوں گی۔"
فرزام نے بڑھ کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔
لوک گیت لکھا گیا۔

اپنی ہیروئن کا ہیرو بننے کے لیے وہ دریائے سین (پیرس) کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ اسے وہاں کسی کا انتظار نہیں تھا۔ یہ نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ غضب کا موسم تھا۔ اچھی ہوا چل رہی تھی۔ دراصل کافی رومان پرور ہوا تھی۔ کیا پیرس میں ایسی ہی ہوا چلتی ہے' شاید۔ اور شاید یہ صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہی چلتی ہو۔ ان ہی پر اثر کرتی

ہو۔

اس کی ہیروئن ایک بہت بڑی آئس کینڈی کھا رہی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی ہی کھا رہی تھی۔ وہ اسے دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا دلیاں ہاتھ کوٹ کی بائیں جیب میں پھنس چکا تھا۔ نکل ہی نہیں رہا تھا وہاں سے۔ جب تک وہ ہاتھ باہر نہیں آئے گا۔ وہ بے رحم ہی بنی رہے گی اس کے ساتھ۔ وہ آس پاس دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں اسی پر لگی تھیں۔

اور وہ ہنس رہا تھا۔ ہاتھ برآمد نہیں کر رہا تھا۔ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

وہ تب بھی ہنسا تھا اور عدن کے تاثرات پر لطف اندوز ہوا تھا۔ جب بہت سے شراب خانوں میں سے اسے ڈھونڈ ڈھانڈ اس نے ایک گھونسا جڑا تھا۔

"میں افق کو ضرور چھوڑ دیتا۔ اگر میں عدن ہوتا۔" اس نے کہا تھا۔ عدن پر جیسے سب ہی آسمانی بجلیاں آگریں۔ اس کی شکل بتا رہی تھی۔ ایسا ہوا ہے۔ وہ بری طرح سے پٹ چکا ہے۔

افق کو آئس کینڈی بالکل مزہ نہیں دے رہی تھی۔ اسے فرزام پر غصہ بھی آرہا تھا۔

گٹار لیے ایک بے حد خوب صورت لڑکے (گلوکار) کو گا رہا تھا۔ یقیناً "وہ اپنے Jeff Beck سامنے بیٹھی لڑکی پر اپنا جادو جگانا چاہتا تھا اور یقیناً" وہ اسے کچھ اور بتانا چاہ رہا تھا۔

"I am in Love
Oh i am in Love"

کوٹ سے ہاتھ برآمد ہو چکا تھا۔ ہاتھ مٹھی بند تھا۔ یقیناً" اس میں کچھ بہت خاص بند تھا۔

I am all shock up
well my knees are shaking...
my hands are getting weak...
And
to stand on my own two...
Can't seem

مسرت کی ایک تیز لہر افق میں جاگی۔ بند مٹھی کے ساتھ فرزام گھٹنوں کے بل جھکا۔ پیار کے پہلے شہر میں رہنے والے ایسے مناظر پر جشن مناتے ہیں۔ آس پاس اردگرد پھیلے ہوئے لوگ فوراً" متوجہ ہوئے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ صرف گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے انہیں کیا کرنا ہے۔

I fear...
I am in Love...oh
I am in Love...

اس نے بند مٹھی کھولی۔ انگوٹھی کو دو انگلیوں میں لیا۔ گستاخ طفل کے طور پر ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ روایت زندہ کی جا رہی تھی۔ محبت کے اظہار کی رسم نبھائی جا رہی تھی۔ صدیوں پہلے کی۔ صدیوں بعد کی۔ صرف یہی ایک رسم زندہ جاوید کر دینے کے لیے کافی ہے۔

نامحسوس طور پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا۔ بوڑھوں کا۔ بچوں کا ایک دائرہ بن گیا۔ سب زیر لب مسکرا رہے تھے۔ وہ اس بدیسی کے کچھ بولنے کے انتظار میں تھے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کی شرمگیں مسکراہٹ کے انتظار میں تھے۔

"یہ انگوٹھی تمہاری ہے۔ اس انگوٹھی کو تھامنے والا ہاتھ تمہارا ہے۔ اس ہاتھ کے مالک کا دل تمہارا ہے۔ کیا یہ دل ہمیشہ کے لیے تمہارا ہیرو بن سکتا ہے۔؟"

افق نے ایک بلند قہقہہ فضا میں چھوڑا۔

"ہاں۔" وہ ذرا سا چلائی۔ انگوٹھی سے اس کا ہاتھ دمکنے لگا۔ اور انگوٹھی پر افق نے اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ دائرے کی صورت کھینچے لوگوں نے دل کھول کر تالیاں بجائیں' Jeff Beck کا "آئی ایم ان لو۔ آئی ایم ان لو" تیز ہو گیا۔

محبت کی رسم نبھا دی گئی۔ اور۔ محبت مقدر ٹھہری۔